دین کے آئینے میں
ڈاکٹر ارشد اللہ (ہومیو)
مرکزی جماعت غوثیہ سٹریٹ نمبر ۱۳ فاروق آباد — فیصل آباد

منسوب

اے اللہ! لوگوں کے دلوں کا حال اور پوشیدہ باتوں کو صرف تو ہی جانتا ہے۔ میں اپنے طور تیرا بہت ادنیٰ بندہ ہوں۔ حقیر ہوں، فقیر ہوں، ناتواں عاجز و مسکین ہوں۔ لیکن تو واحد و یکتا ہے۔ قادرِ مطلق اور عالی شان ہے۔ میرا خالق و مالک ہے۔ مجھے پالنے اور بخشنے والا ہے۔ تو رحیم ہے کریم ہے۔ لہٰذا نہایت عجز و انکسار کے ساتھ سر بسجود ہو کر میں اُمید لرزتے کانپتے ہوئے اور پیار کا سہارا لیتے ہوئے اپنی اس کتاب کو اس محبت کے نام منسوب کرتا ہوں جس کا ذکر تو نے سورۃ البقرہ میں یوں کیا ہے کہ "اور جو لوگ کہ ایمان لائے ہیں (دوسروں کی نسبت) اللہ کے لئے محبت میں شدت رکھتے ہیں۔ دعا ہے کہ جل شانہٗ اس منسوب نامہ کو اپنے پیارے رسولِ مقبول ﷺ اور اپنی تمام صفاتِ عالیہ کے صدقے میں شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔

جیسا کہ ان صفاتِ عالیہ میں سے کچھ کے بارے میں ایک جگہ قرآنِ حکیم میں یوں ارشاد ہوا ہے۔

"اللہ، نہیں کوئی معبود مگر وہ۔ زندہ ہے ہمیشہ قائم رہنے والا۔ اس کو نہ اونگھ پکڑتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ بیچ آسمانوں کے اور بیچ زمین کے ہے اُس کے واسطے ہے۔ کون ہے جو اُس کے نزدیک سفارش کرے مگر اس کے حکم کے ساتھ (وہ) جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور علم اس کے سے نہیں احاطہ کرتے کسی چیز کے ساتھ مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی نے سما لیا ہے آسمانوں کو اور زمین کو۔ اور تھکاتی نہیں اس کو ان دونوں کی نگہبانی اور وہ ہے نہایت بلند مرتبہ۔ (البقرہ ۲:۲۵۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا دشمنانِ اسلام کی یلغار کے مقابلہ میں
ہمارے دینی اختلافات زیادہ اہم ہیں؟

دین کے آئینے میں

نظر ثانی شدہ

تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں اور
علمائے دین کے لیے خصوصی دعوتِ فکر

از
ڈاکٹر ارشد اللہ، ہومیو

ناشر
مرکزی جماعت غوثیہ، فاروق آباد، فیصل آباد، پاکستان

پہلا ایڈیشن	نومبر ۱۹۷۵ء	چار ہزار
دوسرا ایڈیشن	نومبر ۱۹۷۷ء	چار ہزار
تیسرا ایڈیشن	اپریل ۱۹۷۸ء	ایک ہزار
چوتھا ایڈیشن	ستمبر ۱۹۷۸ء	دو ہزار
پانچواں ایڈیشن	ربیع الاوّل شریف دسمبر ۱۹۸۳ء	دو ہزار

پریس ——— نفیس پرنٹنگ پریس فیصل آباد

ناشر

مرکزی جماعت غوثیہ

غوثیہ سٹریٹ نمبر ۱۳، فاروق آباد ——— فیصل آباد

نوٹ:۔ کتاب کی دستی تقسیم کو ترجیح دی جائیگی البتہ جو ادارے، لائبریریاں وغیرہ کتاب کو بذریعہ ڈاک منگوانا چاہیں وہ مروجہ شرح ڈاک کے ٹکٹ ارسال کریں

بک پوسٹ ایک (۱) روپیہ

ہدیہ کتاب ——— دعائے خیر بحق مصنف و ناشر

البتہ جو حضرات کتاب بذریعہ ڈاک منگوانا چاہیں۔ وہ درج ذیل شرح سے ڈاک ٹکٹ بھیجیں۔

رجسٹرڈ بک پوسٹ ——— فی تین (۳) روپے

فہرست مضامین

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں (اقبالؒ)

○

عشق کی یہ بجھ نجائے آگ اب سینے میں دیکھ
اے مسلمان! چہرہ اپنا "دین کے آئینے میں" دیکھ

(روزنامہ "مساوات" لاہور، شمارہ ۲۸، مارچ ۱۹۷۶ء)

پیش لفظ

۷۸۶
۹۲

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم ؛ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

میرے محترم کرم فرما جناب ڈاکٹر ارشاد اللہ صاحب جنہیں اللہ تعالےٰ نے سینے میں دھڑکتا ہوا دل عطا فرمایا ہے جو ہر وقت تبلیغی و اصلاحی امور کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی قلبی واردات کو قلم و قرطاس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے!

آپ نے اپنی تازہ تصنیف "دین کے آئینے میں" میں چند مختلف فیہ مسائل کو ایسی سادگی کے ساتھ حل فرمایا ہے، جس سے تائیدِ غیبی کا پتہ چلتا ہے۔ اس مادی دور میں پراگندہ خیالات رکھنے والے افراد کو نہایت متانت و سنجیدگی کے ساتھ اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے دعوتِ فکر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش موجودہ دور کے لئے مینارِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں ڈاکٹر صاحب کو اس بروقت نئی کوشش پر مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نئی نسل میں دینی شعور پیدا کرنے کی مفید کوشش کی ہے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو اس سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے: آمین۔

راقم الحروف
بندہ عاصم الٰہی بخش خادم العلماء
فاضل اسلامیات
خطیب جامع مسجد محمدیہ — نیو عالمگیر مارکیٹ
شاہ عالمی دروازہ لاہور

اعلانِ مسرت برائے جملہ حقوق کتاب

میں ڈاکٹر ارشد اللہ۔ ہومیو، بحیثیت مصنف و مالک کتاب "دین کے آئینے میں" یہ اعلان کرنے میں اپنے لئے بہت بڑی سعادت اور خوشی محسوس کرتا ہوں کہ میں نے مرکزی جماعتِ غوثیہ، فیصل آباد، کے مشورہ پر اس کتاب کے جملہ حقوق برائے ملکیت و اشاعت و تبلیغِ دین جناب رسالتِ مآب سرکار مدینہ رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں منتقل کر کے اُن ؐ کے پاس محفوظ کر دیے ہیں۔ لہٰذا اب یہ کتاب۔ اس کی تمام جلدیں۔ کتابچے اور کتابت شدہ مسودہ حضورؐ کی ملکیت ہمارے پاس بطور امانت ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ اس امانت کا حق ادا کرنے کی غرض سے اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ تبلیغِ اسلام کا کام کریں اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ہم اس کتاب کی جلدوں اور کتابچوں کو مسلمانوں میں مفت تقسیم کریں۔

میں مرکزی جماعتِ غوثیہ۔ فیصل آباد کو اس نیک کام کا بیڑہ اُٹھانے پر مبارکباد دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاگو ہوں کہ اس جماعت کو دینی تبلیغ کے کام کو سرانجام دینے کی زیادہ سے زیادہ توفیق بخشے۔ اس کا علی کردار مثالی ہو اور یہ اپنی دینی مساعی میں کامیاب ہو اور اللہ تعالیٰ مجھ عاجز و ناتواں پر بھی اپنا فضل و کرم کرے اور میری اس کی راہ میں حقیر کوششوں کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین ثم آمین۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۱ء

ڈاکٹر ارشد اللہ۔ ہومیو
۱۰، حسین شاہ سٹریٹ۔ پارک لین
ٹمپل روڈ، لاہور۔ فون۔ ۶۳۵۴۴

نوٹ: اس سلسلہ میں مرکزی جماعتِ غوثیہ کا اعلان صفحہ ۲۸۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔
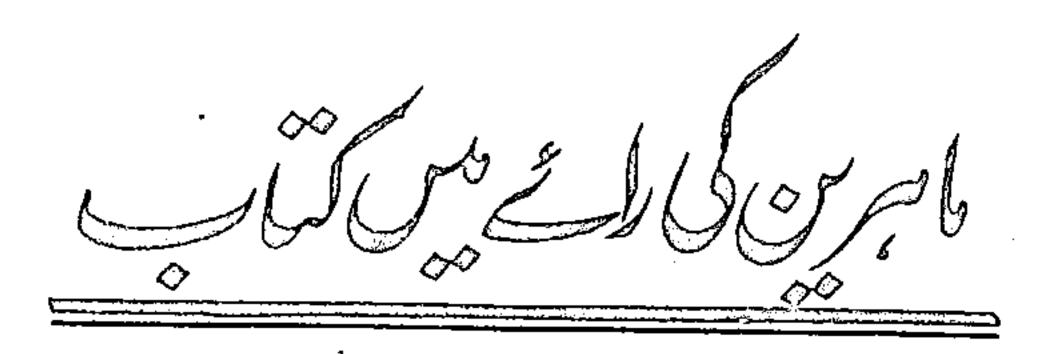
قارئین حضرات کو کتاب کے آسانی سے سمجھنے اور اس کے متعلق شک و شبہات سے بالا ایک واضح پختہ رائے قائم کرنے میں معاونت کی غرض کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کتاب میں جن علوم پر روشنی ڈالنے کی خاطر بحث اٹھائی گئی ہے۔ ان علوم کے ماہرین میں سے جن حضرات تک اندریں حالات رسائی ممکن ہو۔ ان کا گراں قدر تبصرہ حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف رجوع کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں معزز جج صاحبان۔ نامور سائنسدان۔ مدیرانِ اخبارات۔ ماہرینِ تعلیم اور میرے واجب الاحترام علمائے دین حضرات کی طرف رجوع کیا گیا۔

چنانچہ اب کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کتاب پر ہر مکتبہ فکر کے حضرات سے کافی حد تک ایک ہمہ گیر قسم کا تبصرہ حاصل کیا گیا ہے اور مصنف اپنے تمام واجب الاحترام بزرگوں اور دینی بھائیوں کا نہایت ممنون و مشکور ہے جنھوں نے اس مادہ پرستی کے دور میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس کتاب کے مطالعہ میں اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور اپنے گراں قدر تبصرات سے نوازا۔ جو کہ کتاب میں ذیل میں درج کر دیئے گئے ہیں۔

ان تبصروں میں سے دو تبصرے ایسے حضرات کے بھی ہیں، جو کہ ماہرین کے زمرے میں تو نہیں آتے۔ بلکہ عام قارئین میں سے ہیں اور یہ اس لئے کیا گیا ہے تاکہ اس طبقہ کی بھی تبصرات میں مناسب نمائندگی ہو جائے۔ تاکہ قارئین حضرات کو کتاب کے متعلق شک شبہات سے بالا ایک واضح پختہ رائے قائم کرنے میں ان کی ہر ممکن مدد کی جائے۔

ماہرین سے جو تبصرات وصول ہوئے۔ ان کو بغیر کسی کمی بیشی کے جوں کا توں شائع کر دیا گیا ہے۔ البتہ تبصرات میں جو چند اختلافی نقاط اٹھائے گئے ہیں، ان کی کتاب میں مناسب جگہ [illegible]

دی گئی ہے۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۷۵ء کو اس دن شائع ہوا جس دن کہ مصنف لاہور سے بذریعہ ریل عازمِ حج ہوا۔ اس لئے مناسب وقت نہ ملنے کی وجہ سے پہلے ایڈیشن کی کتابت پر پوری توجہ نہ دی جا سکی اور اس طرح متعدد اغلاط کتاب میں درج ہو گئیں جس کے لئے معذرت پیش کی جاتی ہے اور امیدِ واثق ہے کہ موجودہ ایڈیشن ایسی تمام اغلاط سے اب مبرا ہو گا۔

مصنف کو یہ احساس ہے کہ موجودہ ایڈیشن قدرے تاخیر سے پیش کیا جا رہا ہے۔ لیکن محدود مالی وسائل کی بنا پر یہ سعی کوشش اس سے پہلے کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔ اللہ تبارک تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس کارِ خیر کو سرانجام دینے کی توفیق بخشی۔

اس کتاب میں جو تبصرات شامل ہیں۔ ان کا اطلاق صرف پہلے ایڈیشن میں شائع شدہ مواد پر تو لازماً ہوتا ہے۔ لیکن جس مواد کا اضافہ دوسرے ایڈیشن میں کیا گیا ہے۔ اس پر ان کا اطلاق اصولی طور پر نہیں ہوتا۔ اس اضافہ میں مندرجہ ذیل عنوانات قابلِ ذکر ہیں۔

اوّل: "اسلام پر ناپاک حملے" ——— دوم: "واقعہ معراج بطور اللہ کی نشانی کے" ———

سوم: "واقعہ معراج اور احادیثِ نبوی" چہارم: "کیپٹن عثمانی اور توحید خالص" ———

پنجم: "عقیدت مند شاہ ولی اللہ کی آنکھوں سے دیکھیں" کا وضاحتی حصہ کتاب کے پانچویں ایڈیشن میں "اسلام میں پردہ کی حقیقت"۔ "اسلام۔ سوشلزم۔ جمہوریت اور پاکستان"۔ "جدید سائنسی تحقیق کے مطابق قرآن خدا کا کلام" اور "اسلام میں انتخابات ان کی گنجائش و شرائط"، کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔

کتاب کی تکمیل و اشاعت میں جن حضرات نے تعاون فرمایا ہے۔ مصنف ان صاحبان کا بھی تہ دل سے شکر گزار ہے۔ ان میں بشیر انجم۔ محمد عارف۔ انوار الحق۔ محمد افضال۔ قاضی محمد اسماعیل چوہدری احمد دین حامد سعید شاہ۔ محمد اکرم شاد اور امجد اللہ افضل کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

مصنف

حکومتِ پاکستان کا تبصرہ

حکومتِ پاکستان
وزارتِ قانون و پارلیمانی امور
(پارلیمانی امور ڈویژن)

No. F. 6 (1)/82-PA. مورخہ: ۱۱، مارچ ۱۹۸۲ء

عنوان خط: مقالہ۔ ڈاکٹر ارشد اللہ ہومیو

جنابِ والا!

آپ کے خطوط مورخہ ۱۴، جنوری اور ۲۵، جنوری جو کہ آپ نے بمعہ منسلکہ جات کے صدر (پاکستان) صاحب کو ارسال کئے ہیں۔ اُن کا بہت بہت شکریہ۔ چونکہ صدر صاحب کو روزانہ ہزاروں کی تعداد میں خطوط وصول ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے ہر خط کا جواب خود دینا ناممکن ہے۔ اس لئے میں آپ کو مطلع کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ کا کتابچہ (اسلامی نظام میں انتخابات، اُن کی گنجائش و شرائط) ہمارے لئے اس بات میں مددگار ثابت ہوگا کہ ہم پاکستان میں اسلامی نظام کے کام کو آگے بڑھا سکیں۔

آپ کا خیر اندیش
ڈپٹی سیکرٹری، حکومتِ پاکستان

نوٹ: مذکورہ بالا کتابچہ اس کتاب میں اب صفحہ نمبر ۲۸۱ پر شامل کر دیا گیا ہے۔

جمود یاسیت اور ہزیمت کی سوگوار فضاؤں میں تڑپ رہی ہے۔ اگر وقت کے مدبر زعمائ اپنی تمام تر ذہنی توانائیاں اختلافات کو وسیع کرنے کی بجائے امت کی مجموعی فلاح اور نوع انسانی کے ارتقاء کے لئے غور وفکر کریں تو اس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہونگے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے گروہی اختلافات اس قدر سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں کہ ہمیں نسلِ جدید کی اصلاح کی کوئی ہوش نہیں۔ جوان طبقہ اخلاق باختہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے گروہی اختلاف کی وجہ سے جو کمزوریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ان سے بھرپور فائدہ اٹھا کر غیر مسلم اسلام کو ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں۔ جس امت نے قیادتِ عالم کا جلیل فریضہ ادا کرنا تھا۔ اب وہ زندہ رہنے کیلئے غیروں کی بیساکھیوں کا سہارا لے رہی ہے۔ بہر طور ڈاکٹر صاحب کی زیرِ نظر تصنیف وقت کی اہم ترین ضرورت تھی جسے انہوں نے کافی حد تک پورا کیا۔ میری دعا ہے کہ ربِّ جلیل ڈاکٹر صاحب کی کاوش کو مستجاب و کامیاب فرمائے۔

فقط

صاحبزادہ فیض القادری

صدر مجلس عمل تحفظِ ختم نبوت لاہور

---

۵ ـــــ آج دنیائے اسلام میں جو حالات رونما ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی شاندار تاریخ کو یکسر بھلا دیا ہے۔ اسلام کا نام لیتے ہیں۔ مگر اسلام کے فروغ اور غلبے کے لئے خاطر خواہ اقدامات کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اسلامی اقدار اور دینی اخلاق سے مسلسل انحراف جاری ہے۔ آپس کے اختلافات اور باہمی افتراق نے مزید مسلمانوں کی ساکھ کو اور ان کی ہوا کو اکھاڑ پھینکا ہے۔ حالات کا شدید تقاضا ہے کہ دنیائے اسلام میں بالعموم اور حکومتِ خداداد پاکستان میں بالخصوص پورے زور اور قوت سے اس سلسلہ میں بھرپور تحریک چلائی جائے کہ مسلمان عملی طور پر اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے

علماے دین

۱۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

محترم ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی تالیف "دین کے آئینے میں" دیکھنے کا موقع ملا۔ موصوف نے جس دلسوزی سے ملت کے مختلف مکاتبِ فکر کو متحد ہونے کی دعوت دی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلک اہلِ سنت کے بارے میں پیدا کی گئی۔ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اور اپنے عقائد کی حقانیت کو جس طرح عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالٰے نے آپ کو دلِ دردمند۔ فکرِ رسا اور قلمِ حقیقت نگار ارزاں فرمایا ہے۔ اگر انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو ان کی نگارشات سے ملت کا خواندہ طبقہ خصوصاً بیش از بیش مستفید ہو گا۔ اللہ تعالٰے اس مجاہد کی عمر اور علم میں برکت دے اور اس کے ذوق و شوق کو فزوں تر فرمائے۔ اور اس خدمت کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین

جسٹس محمد کرم شاہ
ایم۔ اے الازہر یونیورسٹی
شریعت بنچ

---

۲ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جناب ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کا کتابچہ "دین کے آئینے میں" جذبہ اخلاص و اصلاح کے تحت لکھا اور چھاپا گیا ہے جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مصنف اور ناشرین نے اس کا ہدیہ محض دعائے خیر رکھا ہے اور اس کے بلا قیمت پھیلانے کا اہتمام کیا ہے۔ مادیت کے اس دور میں ایسی بلا مزد دینی خدمت قابلِ تحسین ہے۔

مولف نے دلنشیں پیرائے میں ایسا مواد سپردِ قلم کر دیا ہے۔ جو علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لئے یکساں طور پر عبرت اور افادیت کا موجب بن سکے گا اور انہیں انشاء اللہ اس پر آمادہ کر سکے گا

کہ وہ جزوی اختلافات سے صرفِ نظر کر کے اعدائے اسلام کے بالمقابل اتحاد و یک جہتی اختیار کریں۔ البتہ اس کتاب کے آخری حصہ میں بعض وہی فروعی مسائل چھیڑ دیئے گئے ہیں، جو ہمارے مذہبی حلقوں میں مناظرانہ طبع آزمائی کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ اور جنہیں عوام الناس کے ذہنوں میں تازہ کرنے کے بجائے ان سے توجہات کا ہٹانا بہتر ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی یہ کاوش قابلِ قدر ہے اللہ تعالیٰ اسے مفید اور نتیجہ خیز ثابت کرے۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

---

۳ ——— بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجھے جناب ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی تصنیف "دین کے آئینے میں" سرسری طور پر دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور اس کے بعض حصے پڑھے۔ آپ نے جس سادگی کے ساتھ اپنے زورِ قلم سے مسائل کو حل فرمایا ہے۔ وہ قابلِ داد ہے۔ حالات کا تقاضا اور ضرورت بھی یہی ہے کہ ایک ایسے معاشرہ میں جو اسلام سے دن بدن دور ہوتا جا رہا ہے۔ پیارے اور دلنشین انداز میں دعوتِ اسلام دی جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کوشش کی ہے۔ اس پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل ان کی اس سعی کو قبول فرمائے۔ (آمین)

(مولانا) شاہ احمد نورانی (سینیٹر) صدیقی

صدر ورلڈ اسلامک مشن۔

صدر جمعیت علماء پاکستان

راقم: محمد اکبر ساقی (صوبائی جنرل سیکریٹری جمعیت علماء پاکستان) ۵.۲.۷۶

---

۴ ——— ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے خلوص نیت کے ساتھ مسلمانوں کے گروہی اختلافات پر جس دکھ کا اظہار کیا ہے، واقعی وہ ایک ایسا المیہ ہے جس سے امتِ مسلمہ آج تک

نور اور اس کی ہدایت سے معمور اور پرنور بنائیں۔ نیز تمام اختلافات وانتشار کو دور کرکے اتحاد اور اتفاق کی فضا پیدا کریں۔

اس سلسلے میں محترم ڈاکٹر ارشد اللہ ہومیو صد تحسین و تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی ایمانی بصیرت اور ایقانی فراست سے نہایت اخلاص اور پاکیزہ جذبہ کے پیش نظر ایک قابلِ قدر کوشش فرمائی ہے آپ کی پہلی سعی سعید ایک کتابچہ "دین کے آئینے میں" کے نام سے میرے سامنے ہے جس میں ضروری اور اہم پہلوؤں کو نہایت سنجیدگی، متانت اور مدلل نیز پرخلوص جذبات کے ساتھ تحریر فرمایا ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر علمائے دین کے بارے میں سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ جبکہ علمائے دین کی زریں خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ آج اگر عوام مسلمین کسی قدر دین سے لگاؤ رکھتے ہیں تو وہ علمائے دین ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

دراصل اصلاح قوم اور پاکیزہ معاشرہ بنانے میں تین گروہ بڑی حد تک ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اولاً علمائے دین۔ دوم اغنیاء۔ سوم امراء یہ تین فریق اگر اسلام کی طرف سے مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دیں۔ تو بہت جلد خاطر خواہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ کتابچہ مجموعی طور پر نہایت مفید اور مسلمانوں کے لئے نظر و فکر کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس کی اشاعت اور ترویج وقت کی اہم ضرورت اور دین کی زریں خدمت ہے۔ مولیٰ تعالےٰ اپنے فضل وکرم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے اور طفیل اس کتابچہ کو قبول فرمائے اور ڈاکٹر صاحب موصوف کو اس کا اجر جزیل عطا فرما کر آپ کو دین و دنیا میں کامیابی مرحمت فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

المفتی محمد حسین نعیمی
ناظم دارالعلوم جامعہ نعیمیہ لاہور

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ ط

زیرِ نظر کتاب "دین کے آئینے میں"، کے بعض مقامات کو ملاحظہ کیا۔ جس سے تین پہلو سامنے آئے۔ اولاً مسلمانوں میں افراق و انتشار سے پیدا شدہ حالت ثانیاً امت کا اخلاقی انحطاط ثالثاً غیر مسلموں کے اسلام پر حملے ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے ان تین باتوں کا ذکر کر کے امت کو ایک خوفناک تباہی کی طرف متوجہ کیا ہے۔ لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جو دین، روحانی، اخلاقی سیاسی اور معاشی اعتبار سے بے مثل ہے اور دنیا کے مدبرین نے جس دین کی عظمتوں کا اعتراف ہر زمانہ میں کیا۔ اب ہماری بدعملیوں کیوجہ سے بدنام ہو رہا ہے۔ اپنے دوسری تہذیب وافکار کی طرف راغب ہیں اور بیگانے مکمل ڈھٹائی کے ساتھ دین اسلام پر پئے در پئے حملے کر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی فکر انگیز تالیف میں یہ تمام باتیں بیان کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاتی اغراض مسلمانوں کے باہمی انتشار کا باعث بنی ہوئی ہیں اور اس انتشار نے ہمیں ملی کردار سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ہر شخص ہوس و نفس کا پیروکار بن گیا ہے۔ جس سے آج پورا معاشرہ اخلاقی برائیوں کی آگ میں جل رہا ہے اب اس امر کی ضرورت ہے کہ قوم کے زعماً علماً اور مفکرین اسلامی تعلیمات کو عام کریں۔ تبلیغی محاذ کو مضبوط بنائیں اور امت کی تعمیر کردار پر توجہ دیں۔ بلا شبہ اسلامی تعلیمات کے فروغ سے ہماری تمام برائیاں دم توڑ جائینگی اور مسلمان اسلام کی نشاۃ ثانیہ قائم کر کے اندرونی بیرونی دشمنانِ اسلام کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔

میں ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے نفسا نفسی کے اس دور میں "دین کے آئینے میں"، کتاب رقم کر کے پوری ملت کو حق و صداقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔

ابن الحسنات سید خلیل احمد قادری

خطیب مسجد وزیر خان

صدر دار تبلیغ اہل سنت۔ لاہور ۳۱.۵.۷۵

۷ ——— بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

فقیر نے ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کے کتابچہ "دین کے آئینے میں" کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ اور علمائے دین کو اپنے فہم و صوابدید کے مطابق خصوصی دعوتِ فکر پیش فرمائی ہے۔ زبان نہایت ہی سلیس ہے۔ اندازِ بیان نہایت ہی ناصحانہ و مخلصانہ ہے۔ تبلیغِ دین کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے جذبات و تاثرات کو جس والہانہ انداز میں پیش فرمایا ہے، اس سے موصوف کی دین سے بے پناہ وابستگی نمایاں ہے۔ وقت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر دین حق کی نشر و اشاعت ان کا نصب العین ہے۔ اس سلسلے میں علمائے دین سے ان کا یہ مطالبہ بالکل برحق ہے کہ موجودہ لادینی اور الحاد کے سدّباب کے لئے فروعی مسائل کو ان کے درجے میں رکھا جائے اور اصل دین کی حفاظت و صیانت کے لئے اجتماعی طور پر بھرپور جدوجہد کی جائے۔ بالخصوص تعلیم یافتہ نئی پود کو دشمنانِ اسلام کے ناپاک حملوں سے بچانے کے لئے اندازِ تبلیغ میں حسبِ ضرورت تبدیلی لانی چاہیئے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا غلام علی اکاڑوی
امیر اہلِ سنت پاکستان
صدر جمعیت علمائے پاکستان صوبہ پنجاب

سائنسدان اور ماہرین تعلیم

۱ ——— مکرمی ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی تصنیف "دین کے آئینے میں" میری نظر سے گزری ہے۔ موصوف ڈاکٹر صاحب نے بڑے پیارے پیرائے میں اسلامی فرقوں میں فکری دعوت

پہ زور دیا ہے اور بڑے لطیف انداز میں واضح کیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو دشمنان اسلام کی یلغار کے
خلاف متحد ہو جانا چاہیئے۔ مصنف نے مشہور دشمنانِ اسلام پروفیسر فلپ ہٹی اور ڈاکٹر فرائی کے
اعتراضات کا مدلل جواب دیا ہے۔ موجودہ مادی نظریات (ڈاروِن کا نظریہ ارتقاء اور کارل مارکس کا
فلسفہ اشتراکیت) جو کہ ہمارے نوجوان طبقہ میں بہت مقبول ہیں، کو مصنف نے مذہبی نقطہ نگاہ کے
علاوہ سائنسی زاویہ نگاہ سے بھی پرکھا ہے اور ان نظریات کی خامیوں کی بڑے عالمانہ طریق سے نشان
دہی کی ہے۔ پورے ایک سو برس کی تحقیق و تجربے سے یہ بات واضح طور پہ سامنے آتی ہے کہ ڈاروِن
کا نظریہ بھی مندرجہ ذیل چار نقاط کا تسلی بخش حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔

۱۔ زندگی کے عملِ ارتقاء کا تاریخی ثبوت موجود نہیں۔

۲۔ پودوں اور حیوانوں کے بڑے گروہوں میں عملِ ارتقاء کے سلسلہ میں بے شمار عبوری صورتیں (FORMS) کی غیر موجودگی کسی طرح بھی واجب قرار نہیں دی جا سکتی۔

۳۔ عملِ ارتقاء کے داعی کے پاس تبدیلی کے لئے کوئی خاطر خواہ طریق کار یا ترتیب موجود نہیں۔ یہ ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عام تغیر و تبدل (MUTATION) سے نئے اعضاء اور نہایت پیچیدہ قسم کی زندگی پیدا ہو سکتی ہے۔

۴۔ عمل ارتقاء کے داعی کوئی ایسا تسلی بخش طریق نہیں پیش کر سکے جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اس عمل کے ذریعہ پہلا خلیہ (CELL) کیسے معرضِ وجود میں آیا۔

یہ یقینی امر ہے کہ آنکھ جیسے پیچیدہ عضو میں کوئی بڑا تغیر و تبدل پیدا ہو جائے تو اس عضو کی
افادیت ہی ختم ہو جائے گی۔ اگر آنکھ کی پیمائش، جسامت یا ساخت میں کوئی تبدیلی رونما ہو جائے
تو وہ بالکل بیکار ہو جائے گی۔ یہ بات کہ آنکھ جیسے نازک اور پیچیدہ عضو میں عمل ارتقاء کے ذریعے یک
لخت تبدیلیاں پیدا ہو جانے سے اس کی افادیت میں اچانک ترقی ہو جائے گی، موجودہ سائنسی تحقیقات
کی رو سے محض قیاس آرائی ہونے کے علاوہ ناممکن ہے۔ چند ایک کیمیاوی مرکبات کا عمل ارتقاء کے
ذریعہ نو سو کھرب خلیات پہ مشتمل نہایت پیچیدہ انسان (جس میں آنکھ، ناک، کان، دانت، دل

ہاضمہ کا نظام خون کا تمام نظام موجود ہیں) میں تبدیلی ہو جانا جسے زمین پر ہر جانور اور پودے سے امتیازی حیثیت حاصل ہے، محض قیاس آرائی ہی نہیں، بلکہ خام خیالی بھی ہے۔ شماریات (STATISTICS) کی رو سے کروڑ ہا کروڑ میں سے ایک دفعہ بھی ایسا ہونا ممکن نہیں۔

کیلیفورنیا (امریکہ) کے تعلیمی بورڈ نے ۱۹۶۹ء میں سفارش کی کہ آغاز زندگی کے متعلق "تخلیق کا نظریہ" نصاب میں شامل کیا جاوے۔ پس مادہ پرست مغربی دنیا بھی ڈارون کے نظریۂ ارتقار سے مطمئن اور متفق نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور عقیدت سے مصنف کی سرشاری قابلِ تعریف ہونے کے علاوہ قابلِ تقلید بھی ہے۔ میں مصنف کے جذبہ ایمانی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مخلصانہ کوشش کا اجرِ عظیم عطا فرمائیں اور ان کے دینی اور دنیاوی درجات بلند ہوں۔ آمین ثم آمین۔
موجودہ حالات میں وطن عزیز کی وحدت اور بقا کے لئے مسلمانوں میں صحیح جذبہ ایمان پیدا کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ امید ہے یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ثابت ہو گی اور ہمیں مصنف کے تخلیق علم سے مستفید ہونے کے مزید مواقع نصیب ہوں گے۔

احقر
ڈاکٹر عبد السلام

ایم۔ ایس۔ سی (پنجاب) پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما
فوڈ ٹیکنالوجی (یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز۔ آسٹریلیا)
پی۔ ایچ۔ ڈی۔ فوڈ ٹیکنالوجی (یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز۔ آسٹریلیا) سینئر ریسرچ آفیسر بائیولاجیکل
الویلوایشن اینڈ فرمنٹیشن ڈویژن پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر

لاہور

۱۸ ـــــــ جناب ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی کتاب "دین کے آئینے میں" پیش نظر ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر کوشش ہے۔ جو انہوں نے مسلمانوں کو دین کی طرف راغب کرنے کے سلسلے میں فرمائی ہے۔ ان کا مخاطب خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقہ ہے، جو موجودہ دور کے سائنسی اور معاشی نظریات سے بھی متاثر ہے۔ دین اسلام ایک عالمگیر ضابطۂ حیات ہے اور رشد و ہدایت کا ابدی سرچشمہ ہے۔ اس کے برعکس سائنس کا تعلق ہمارے گرد و پیش کی اشیاء۔ ان کی ماہیت اور خصوصیات سے ہے۔ سائنس میں مشاہدات سے اخذ کردہ نتائج پر مبنی نظریات پیش کئے جاتے ہیں، جو کہ معلوم حقائق کی کسی حد تک توضیح کر سکتے ہیں، موصوف نے ان نکات پر روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے سائنس کی کم مائیگی، جزوی کامیابی اور خامیوں کی خاص طور پر وضاحت کی ہے۔ اس لئے سائنس کو دنیائے اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کے ذریعے ان مسلمانوں کو دعوتِ فکر دی ہے۔ جو دین کو اپنا کر بھی دنیاوی برائیوں اور بدعتوں کے ساتھ مصالحت کر لیتے ہیں، انہوں نے مسلمانوں اور خاص طور پر نوجوانوں سے دردمندانہ اپیل کی ہے کہ وہ فروعات کے جھگڑوں کو ختم کر کے دین اسلام پر پختہ ایمان رکھیں اور اس کی تعلیمات پر پورے اعتماد کے ساتھ عمل کریں، کیونکہ اسی میں بنی نوع انسان کی بھلائی ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالٰے ڈاکٹر صاحب کی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کرے اور ہمارے دینی بھائیوں کو دینِ اسلام کو پورے یقین کے ساتھ اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

خیر اندیش
ڈاکٹر ایم۔ اے۔ شوکت

ایم۔ ایس۔ سی (پنجاب) پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)
پروفیسر آف فزکس پنجاب یونیورسٹی۔
نیو کیمپس لاہور۔

۲ ـــــــ یہ امر میرے لئے باعث فخر ہے کہ میرے محترم ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے اس ناچیز کو اپنی کتاب "دین کے آئینے میں" پر بحیثیت میڈیکل سائنسدان تبصرہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ میں نہ تو کوئی دینی راہنما ہوں اور نہ ہی کوئی مفکر کہ آپ کی کتاب پر کسی ماہرانہ انداز میں تبصرہ کر سکوں۔ لہٰذا میں صرف ایک سچے مسلمان کے طور پر (اللہ تعالیٰ مجھے اس کی توفیق دے) اس پر کچھ حروف پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مجھے ایک عرصہ سے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ ہم لوگ اپنے مذہب سے دور ہٹ رہے ہیں۔ اور پاکستان کے حصول و وجود کے اصلی معنوں سے بالکل بے بہرہ و بے نیاز ہیں۔ ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔ اپنے پیارے دین کو سرے سے بھول گئے ہیں اور اسلامی بھائی چارہ نام کو بھی باقی نہیں ہے۔ چاہتے ہیں کہ اسلام کو اپنی مرضی و خواہش کے مطابق بدل لیں۔ حالانکہ اسلام ایک سیدھا سادہ مذہب ہے جو ہر طرح سے مکمل ہے۔
میرے نزدیک کتاب "دین کے آئینے میں" وقت کی سخت ضرورت ہے لہٰذا آپ کا یہ کام قابل تحسین و ستائش ہے کہ آپ نے صاف طور پر اس کتاب میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کے تجزیہ سے سو فیصد اتفاق ہے۔ البتہ ایک لحاظ سے ان سے متفق نہیں ہوں، وہ یہ کہ کتاب کے طرز بیان میں ضروری سختی نہیں ہے۔ کیونکہ دور حاضر میں اگر کوئی بات نرم زبانی اور محبت سے کہی جائے تو وہ عام طور پر ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر پھر آپ کو جانتے ہوئے میں کسی طرح یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ زبان کی سختی اور تلخی کو بروئے کار لا سکیں گے۔ بہرحال آپ کی کتاب سمجھنے والے کے لئے ایک خزانہ ہے۔ اور ہمارے دینی راہنماؤں کے

لئے ایک چیلنج ہے۔ خداوند انہیں اور ہماری جوان فکر کو اس سے پورا پورا استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

پروفیسر اے۔ کے۔ توفیق

ایم۔ بی۔ بی۔ سی۔ ایچ (ویلز) ایل۔ آر۔ سی۔ پی (لندن)
ایم۔ آر۔ سی۔ ایس (انگلینڈ)۔ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس (ایڈن)
سابق پروفیسر و مہتمم شعبہ جراحی۔ فاطمہ جناح میڈیکل کالج
لاہور اور سابق میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سرگنگا رام ہسپتال لاہور

---

۴ ــــــــ کفر اور ملحدیت کے اس دور میں ہر وہ کوشش جس سے مخلوق کا خالق سے تعلق پیدا ہو۔ قابلِ ستائش ہے۔ ڈاکٹر ارشاد اللہ صاحب کی تصنیف " دین کے آئینے میں" بھی ان چند کاوشوں میں سے ایک ہے۔ جسے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے عام فہم طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

مصنف نے نہایت خلوص سے مسلمانوں کی دینی یکجہتی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ دشمنان اسلام کی تحریرات کا کھوکھلا پن عیاں کرنے کی کوشش کے علاوہ موجودہ مادی نظریات جو بظاہر بہت پرکشش اور جاندار نظر آتے ہیں۔ کو رَد کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان سوالات کا جواب بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کہ نئی نسل کے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔ کتاب کو اس طریق سے پیش کیا گیا ہے کہ مذہب سے بیزار نوجوان جو کہ راہِ حق سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ سے کم نہیں۔ مختلف مسائل کا حل پیش کیا ہے۔

یہ کتاب لکھ کر مصنف نے ایسے موضوعات پر کتابوں کی اہمیت و افادیت کا مزید احساس دلایا ہے اور موجودہ زمانے میں اس تصنیف جیسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔

بہر حال یہ کتاب ایک صدقۂ جاریہ ہے اور یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔ امید ہے۔ یہ کتاب نہ صرف مصنف کی مزید تخلیقات کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔ بلکہ کئی اور پروانے بھی عشقِ رسول ؐ کی متعین کی ہوئی راہوں سے نکل کر دشمنانِ اسلام کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

ڈاکٹر فرخ حسن شاہ
ایم۔ ایس۔ سی (پنجاب) پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)
سربراہ شعبہ بائیولوجیکل ایویلوایشن اینڈ فرمنٹیشن۔
پی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر۔ لاہور۔

مدیرانِ اخبار

اسّی کم و بیش سو صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ مصنف کے ان خیالات کی پوری پوری عکاسی کرتا ہے جو ان کے دل میں اسلام کی ترویج و اشاعت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے متعلق موجزن ہیں۔ موصوف نے اس مختصر مگر جامع کتابچہ میں معاشرے کو ایک ایسا صاف اور روشن آئینہ دکھایا ہے۔ جس میں وہ اپنی ہیئت کذائی کو پوری طرح دیکھ سکتا ہے۔ اور اسلام اور صرف اسلام کی مدد ہی سے اسے از سرِ نو اپنی فطری حالت پر لا سکتا ہے۔ بلکہ اس کی زیبائش و آرائش بھی کر سکتا ہے۔

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور
شمارہ ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء

۴۔۔۔۔۔۔سو صفحے کی اس مختصر کتاب کا مقصد دین کے بنیادی عقائد کی تبلیغ، معاشرے کی اصلاح اور مسلمانوں میں احکامِ دین پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اندازِ بیان واعظوں اور خطیبوں کا سا نہیں۔ جس میں پند و نصائح کے دفتر کھولے جاتے ہیں اور پُرشکوہ الفاظ سے جذبات میں ہل چل پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر ارشد اللہ ایک سائنس دان ہیں۔ اس لئے ان کا انداز تحریر بھی عقلی اور سائنسی ہے۔ انہوں نے بڑے مدلل سنجیدہ اور دل نشین انداز میں اسلامی احکام کی وضاحت اور ان پر عمل پیرا ہونے کی افادیت واضح کی ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب کا تعلیم یافتہ افراد کو خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیئے۔ کتاب کی کوئی قیمت نہیں، محض خدمتِ دین کے جذبے سے مفت تقسیم کرنے کے لئے شائع کی گئی ہے۔

روزنامہ "مشرق" لاہور

مورخہ ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء

۳۔۔۔۔۔۔مقصود اس کتاب کا تبلیغ ہے۔ خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں میں اس کوشش کی افادیت کا اعتراف ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے سابق اور حالیہ ججوں نے کیا ہے۔ کچھ علماء نے بھی اس کوشش کو سراہا ہے اور واقعی جذبہ بڑا صادق ہے۔ کتاب پیدا اس سوال سے ہوئی کہ اسلام ہماری زندگیوں میں کیوں نہیں۔ جواب میں باتیں زیادہ تر نظریاتی کی گئیں۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلام کا اقرار اور نفی کی صورتیں سامنے نہیں آئیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کون اعلٰے سے اعلٰے اور ادنیٰ سے ادنیٰ فرد کہہ سکتا ہے۔ کہ اس کی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق گزر رہی ہے۔ اور اس آوازے کا جواب اگر خاموش ہے تو کیوں؟ اس لئے کہ ہمارے تمام ادارے سارا معاشی، سیاسی، معاشرتی ڈھانچہ "لادین" ہے۔ جس معاشرہ میں انصاف حاصل کرنے کے لئے بھی فیس ادا کرنا ہو۔ وہ کیسے اسلامی کہلا سکتا ہے۔ اس میں کسی کی انفرادی زندگی میں کیسے آسکتا ہے۔ اور پھر یہ معاشرہ کسی بھی سطح پر اسلام کا عملی نفاذ نہ ہونے اور محض زبانی اور تحریری

جمع خرچ کے سبب لادینی معاشرت اور معیشت کی طرف جا رہا ہے تو کیوں؟ کرنے کا کام یہ ہے کہ پورے معاشرے کی غیر اسلامی قدروں خصوصاً معاشی قدروں کو سر بسر بدلا جائے۔ اور اسی مقصد کے لئے ہر تحریری۔ زبانی اور تبلیغی کوشش کی جائے تو ایسی نیک مطبوعات سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ ورنہ سعیٔ لاحاصل ہے۔

روزنامہ "امروز" لاہور

شمارہ ۲۹/ فروری ۱۹۷۶ء

---

۴ ـــــ ڈاکٹر ارشد اللہ نے زیر نظر کتاب میں جن تاثرات کو بذریعہ قلم عوام الناس تک بلا معاوضہ پہنچایا ہے۔ حقیقتاً قابلِ ستائش ہے۔ اس دورِ الحاد و زندقہ میں ایسی عام فہم دینی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے۔ فقیر کے خیال میں اعمال کی بنیاد عقیدے پر ہے۔ اگر عقیدہ نادرست ہے تو اس پر عمل کا اعتبار محض اعتباری ہے۔

دین کا آغاز فخرِ آدم و بنی آدم نورِ مجسم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے ہوتا ہے اور خدا کرے کہ انجام بھی اس ولائے مصطفٰے پر ہی ہو۔

کاش! اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والے بہ نیت صادق اپنے جسمانی اور روحانی خد و خال کو "دین کے آئینے میں" دیکھنے کی ضرورت محسوس فرمائیں۔

ارشد صاحب کی زبان گو بالکل سادہ ہے اور انشا پردازی اور زبان دانی کے چٹخارے اس میں نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی اس کوشش کو سراہنے سے نہیں رہا جا سکتا۔ کیونکہ اگر اللہ اور رسول کو حبِ صادق بلال رضؓ کا "اشہد" کی جگہ "اسہد" کہنا پسند ہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ کریم بہ طفیل رسولِ کریم ارشد صاحب کی اس کوشش کو بھی شرفِ مقبولیت عطا فرمائے گا۔

عشق کی یہ بجھ نہ جائے آگ اب سینے میں دیکھ
اے مسلماں! چہرہ اپنا "دین کے آئینے میں" دیکھ

خدا کرے دین پسند اس کتاب کے مضامین کو اپنے قول و عمل کا جزو بنائیں۔ آمین!

تبصرہ نگار علامہ قربان نظامی

روز نامہ "مساوات" لاہور۔

شمارہ ۲۸، مارچ ۱۹۷۶ء

---

۵ ——— زیر تبصرہ کتاب "دین کے آئینے میں"

پڑھنے سے تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ فاضل مصنف مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں باہمی محبت ہم آہنگی اور برادرانہ جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سب سے یہ استفسار کرتے ہیں کہ کیا دشمنانِ اسلام کی یلغار کے مقابلہ میں ہمارے دینی اختلافات زیادہ اہم ہیں۔ انہوں نے ذیلی عنوانات کے ذریعے مختلف برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ بعض تجاویز بھی پیش کی ہیں

بلاشبہ فاضل مصنف کا درد نمایاں ہے۔ وہ جو کچھ ایک اچھے مسلمان کی حیثیت میں محسوس کرتے ہیں۔ رقم کر رہے ہیں۔ ان کی بات دل میں ترازو ہوتی جاتی ہے۔ کتاب

کے آخری حصہ میں انہوں نے اختلافی مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ مثلاً محفل میلاد۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے۔ یا نور تھے۔ کون زندہ اور کون مر چکا۔ اللہ کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنا جائز ہے کہ نہیں۔ کسی متوفی کو ہدایت کے لئے پکارنا کفر نہیں وغیرہ۔ ان ذیلی عنوانات کے تحت ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے جو کچھ بیان کیا وہ اس اعتبار سے تو قابلِ قدر ہے کہ انہوں نے اختلافی مسائل بیان کئے۔ لیکن ان موضوعات پر ان کے خیالات واضح ہو جانے سے تشنگی

محسوس ہوتی ہے۔ بات سیدھی سادی ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ اختیارات کا سرچشمہ خود اللہ تعالیٰ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جزوی طور پر اختیارات اپنی مخلوق کو منتقل کئے ہیں۔ وہ ان اختیارات ہی کے باعث جزا وسزا کے مستوجب و مستحق قرار پاتے ہیں۔ رہا نور اور بشر کا معاملہ عقیدت کا معاملہ الگ ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم محض نور ہیں۔ تو پھر کیا صرف فضیلت یہ ہوئی کہ وہ نور ہیں۔ اصل فضیلت تو یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ ایک یتیم کے طور پر پروان چڑھے۔ دنیا کے مصائب میں گھرے رہتے۔ لیکن ایسا شاندار عملی مظاہرہ کیا کہ تمام دنیا انہیں صدیق و امین کہنے پر مجبور تھی۔ وہ اتنے عظیم انسان تھے کہ ساری دنیا میں ان کا کوئی مثیل نہیں بے مثال شخصیت تھے۔ وہ اتنے محاسن و کمالات رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد کسی اور کو یہ فخر و قدرت حاصل نہ تھی۔ دراصل یہی کمالات رشد و ہدایت کا باعث بنے اور انہی عظیم و جلیل اوصاف کے باعث وہ دنیا بھر کے عظیم ترین انسان اور سردار الانبیاء قرار پائے۔ اب اگر ان سے بشریت کے تقاضے ہی چھین لئے جائیں اور کہا جائے کہ وہ بشر تو تھے ہی نہیں۔ وہ صرف نور تھے تو پھر سوال یہ ہے کہ جب نور نے غلطی ہی نہیں کی تو غلطی نہ کرنے پر اس نور نے امتیازی کام کیا کیا؟ پوری کائنات اللہ کا نور ہے اور اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "سراج منیر" کا لقب ملتا ہے۔ بہر حال یہ موٹی سی بات ہے۔ اسی طرح غیب کا مسئلہ ہے۔ ——— ۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ اس مفید کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہ کتاب بلا معاوضہ ناشر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

ہفت روزہ "چٹان" لاہور۔

شمارہ ۱۹ جنوری ۱۹۷۶ء

۱۶ــــــ اس مہنگائی کے دور میں جہاں اچھے اچھے ناشرین نے کتابیں شائع کرنی چھوڑ دی ہیں، وہاں مفت کتاب شائع کرنا قابلِ تعریف ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی کوشش یہ ہے کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں تاکہ وہ اسلام سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

"دین کے آئینے میں" مختلف مسائل پر بڑی سادہ اور سلیس زبان میں بحث کی گئی ہے اور ان کا حل بڑی آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ ہماری خدا سے یہ دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش کامیاب ہو اور اسے زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھیں اور اس سے مستفید ہوں۔

از ماہنامہ "حکایت" مارچ ۱۹۷۶ء

قارئین حضرات

۱ــــــ میں نے آپ کی تصنیف "دین کے آئینے میں" منگوائی۔ بنظرِ تعمق اور بالاستیعاب پڑھی۔ غیر معمولی بصیرت حاصل ہوئی۔ جزاک اللہ۔ میں ایک اہل سنت والجماعت اور حنفی العقیدہ مسلمان ہوں۔ ملازمت کے دوران کسی قدر اور بعد میں بہت حد تک مذہبی لٹریچر کے مطالعہ کا موقعہ ملا ہے۔ تقریباً تمام مذاہب اور ادیان کی کتابیں پڑھی ہیں۔ بالخصوص اسلامی فرقوں کی کتب۔ تحقیق کی نیت سے مطالعہ کرنے والا مسلمان ہر نئے مطالعہ کے وقت نئے تذبذب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں اہل حدیث کا لٹریچر میرے زیر مطالعہ رہا ہے۔ جس میں فروعی مسائل پر کافی مدلل بحث کی گئی ہے۔ جس نے مجھے کافی حد تک مذبذب کر دیا۔ میں یہ تائید غیبی سمجھتا ہوں کہ کہیں آپ کی مذکورہ تصنیف کے بارے میں اشتہار پڑھ لیا۔ تذبذب کی حالت میں جوابی اور اصلاحی لٹریچر کا متلاشی تو پہلے ہی تھا۔ فوراً خط لکھ کر کتاب منگوائی۔ بڑے اشتیاق اور شغف سے گہرائی اور گیرائی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ جس نے میری کایا پلٹ دی۔ دعا ہے کہ آپ عنداللہ اور عندالرسول ماجور ہیں۔ آمین۔ آپ کا طرز نگارش نہایت موزوں اور تبلیغی لحاظ سے قابل

ستائش ہے اللہ تعالیٰ آپ کی ملی خدمت کو قبول فرمائے۔ آپ نے کتاب کی مفت تقسیم کا بیڑا اٹھا کر ملی اور قومی دردمندی کا بین ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ جزاک اللہ۔

نیاز مند

چوہدری احمد دین ریٹائرڈ ٹیچر

سدوال کلاں۔ ضلع گجرات

۱۴ــــــ موجودہ پُرفتن دور میں ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی کتاب " دین کے آئینے میں " ایک قابلِ صد تحسین کوشش ہے کہ انہوں نے فقط سادہ لوح مسلمانوں کو ہی نہیں، بلکہ گلشن قوم کے گل غنچوں کو بہار آشنا کرنے کی ایک قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا ایسی کتاب تصنیف کرنا خصوصاً قائدین اور علماء کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور قرآن کریم کے اس فرمان کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ " اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ " فقط انہیں ہی نہیں بلکہ ان طلباء کے لئے بھی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو نظم و ضبط کو دیکھ کر حق ناحق کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

ایک سنجیدہ ذہن اور خوش ذوق ہونے کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نے قوم کے بیمار ذہنوں اور پژمردہ روح کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے اور دل دردمند کی تڑپ سے اس کی اصلاح کا ایک مفید کام لیا ہے۔ ایسا ذہن اور ذوق رکھنے والے ہر فرد پر یہی فرض عائد ہوتا ہے کہ ؎

حق سے ملی ہیں دوسری دوسری خدمتیں تیرے سپرد
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے۔
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
تجھ کو اس ظلمت کدہ میں نور پھیلانا بھی ہے

ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ کوشش تڑپنے تڑپانے اور چمکنے چمکانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ مولا کریم انہیں اس کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ کتاب کے اختتام پر ان اختلافات کو جنہیں واضح دلائل کے باوجود شرک و بدعت کا نام دیا جاتا ہے۔ جس

پیارے انداز میں حل کیا گیا ہے۔ وہ قابل صد قدر ہے۔

محمد یوسف فاروقی گجرات

جج صاحبان

۱ــــ ڈاکٹر اسرار اللہ صاحب نے "دین کے آئینے میں" لکھ کر ایک بہت بڑی قومی اور دینی خدمت سر انجام دی ہے گو کہ ہمارا ملک اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا اور ہر وقت تحریر و تقریر میں اور قومی ذرائع ابلاغ عامہ پر اسلام کا ذکر رہتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے درست طور پر محسوس کیا کہ ہماری موجودہ پود کا ایک بہت بڑا حصہ گو کہ نام کا مسلمان ہے یا اسلام پر یقین رکھتا ہے۔ مگر اس کے دل میں بہت سے شکوک ہیں چونکہ یہ طبقہ سائنس اور مغربی تعلیم سے بہت متاثر ہے۔ اس لئے دین کی بہت سی باتوں کو ذہنی طور پر تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ اس سائنسی تعلیم کے منافی ہوتی ہیں، اور ان کے ادراک کو نہیں بھاتیں۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے لوگوں کے شکوک و شبہات کو دُور کرنے کے لئے دلیل کا جواب دلیل سے دیا جائے اور اس کے لئے لازمی ہے کہ ہمارے علمائے دین کو نہ صرف دینی امور پر عبور حاصل ہو۔ بلکہ ان کو نفسیات سائنس، مادہ پرستی، سوشلزم اور مغربی علوم و افکار پر بھی دسترس حاصل ہو تاکہ وہ اپنے سامعین کے مختلف طبقوں۔ ان کے ذہنی معیار کے حقائق کو سمجھ سکیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے بہت سے مسائل کا جو عام طور پر نوجوانوں اور پڑھے لکھے طبقہ کو پریشان کئے ہوئے ہیں، خاطر خواہ جواب دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس امر کی طرف بھی بروقت توجہ دلائی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کی دین سے بددلی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علمائے دین کا فروعی امور پر ایک دوسرے سے شدید اختلافات ہیں اور مختلف طبقات کے زعما ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ یہ تفرقہ ہمارے لئے زہر مہلک ہے اور اس کا دور کرنا ہمارے اولین فرائض میں سے ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تمام زندگی خدمتِ خلق میں گزری ہے۔ ان کی زندگی سراپا ایثار ہے۔ انہوں نے اپنی دنیاوی ضروریات کو بالکل نظر انداز کر کے اپنا وقت اور اپنے تمام تر مالی وسائل دین کی خدمت

کے لئے وقف کر دیئے ہیں اور یہ کتاب جو انہوں نے خود اپنے خرچ پر طبع کروائی ہے اور جس کو وہ مسلمان بھائیوں میں مفت تقسیم کرنا چاہتے ہیں، لکھ کر واقعی ایک عظیم مثال قائم کی ہے جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کی کوششوں کو کامیاب فرمائے اور ان کے نظریات زیادہ سے زیادہ فروغ پائیں تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں مستفید ہو سکیں۔

جسٹس اسلم ریاض حسین۔
سپریم کورٹ آف پاکستان، لاہور

۲ ــــــ ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے ایک کتابچہ "دین کے آئینے میں" لکھا ہے جس کے مندرجات استحاد، نظم اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کیلئے مفید ہیں۔ فکری و نظریاتی اختلافات کی موجودہ پرہیجان دنیا میں یہ کتاب ایک کھوئے ہوئے پریشان دل کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ درحقیقت موجودہ دور کے مذہبی مسائل پر واضح اور تعمیری انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس کاوش میں کامیاب ہوں اور توقع کرتا ہوں کہ جس مقصد کے مدِ نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے اس کے حصول کے لئے اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو گی۔

جسٹس شمیم حسین قادری
ریٹائرڈ چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ، پنجاب

۳ ــــــ ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی کتاب کا عنوان "دین کے آئینے میں" اس کی غرض و غایت اور مقصدیت کا کماحقہ ترجمان ہے۔ اس لئے کہ اس مختصر کتاب کے ذریعہ جو حقائق سے لبریز اور حق گوئی سے مرقم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے موجودہ معاشرہ کو ایک ایسا صاف اور روشن آئینہ دکھایا ہے۔ جس میں وہ اپنی مسخ شدہ صورت اور بگڑے ہوئے خدوخال کا جائزہ لے کر انہیں پھر سے سنوارنے اور انہیں صحت مند بنانے کی سعی کر سکتا ہے۔
کتاب اختصار کے باوجود معنویت اور افادیت سے بھرپور ہے۔ جوں جوں میں اسے پڑھتا گیا۔ اس میں میرا انہماک بڑھتا گیا۔ ایک تجربہ کار معالج کی طرح ڈاکٹر صاحب نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کی موجودہ بیماری اور تمام عوارض کا نقشہ کھینچا ہے۔ فی الحقیقت اس وقت ہمارا سب

سے سنگین قومی عارضہ بیگانہ اقدار کی یورشں کے سامنے ہماری اپنی اقدار کی تسخیر اور ان سے بیگانگت ہے۔ ہمارا اخلاقی انحطاط۔ قول و فعل میں تضاد۔ مادہ پرستی۔ تصنع۔ جھوٹ۔ منافقت۔ مکر و فریب یہ سب اسی عارضہ کا لازمی نتیجہ اور علامتیں ہیں۔ جو معاشرہ کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتی جا رہی ہیں اور جن کی ڈاکٹر صاحب نے بڑی عمدگی کے ساتھ نشاندہی کی ہے۔ مرض یقیناً لا علاج ہوتا جا رہا ہے۔ اسکا واحد اور مجرب علاج وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے بڑی تشخیص اور کاوشں سے تجویز فرمایا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ جس خلوص نیت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ وہ بار آور ہوگی اور اس کتاب کو تمام حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ نوجوان نسل کے دلوں میں بالخصوص یہ دین اسلام کی صحیح پہچان پیدا کر کے ان کے لئے ہدایت اور راہنمائی کا باعث بنے گی۔ میں ڈاکٹر صاحب کو ان کی اس بے لوث خدمت پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

جسٹس سجاد احمد جان

سابق جج سپریم کورٹ آف پاکستان

چیف الیکشن کمشنر حکومت پاکستان

۴ــــــ میں نے جناب ڈاکٹر ارشد اللہ (ہومیو) صاحب کی کتاب "دین کے آئینے میں" کو خاصی دلچسپی سے پڑھا ہے اور اسے انتہائی اُجالا کرنے والی پایا ہے۔ انہوں نے بڑے واضح انداز میں ہمارے بگڑتے ہوئے معاشی حالات کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس عارضہ کی نشاندہی کی ہے جو گھن کی مانند اُسے کھا رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جس سادہ لیکن مؤثر انداز میں ان سوالات پر بحث کی ہے۔ جو سائنس اور مذہب، سوشلزم اور اسلام اور جدید رجحانات کے مدِمقابل اسلامی اقدار کے متعلق ہیں اور جو کہ خصوصی طور پر ہمارے جوان ذہنوں کو آجکل اپنے طلسم سے مغلوب کر لیتے ہیں۔ اس سے ان جھوٹی اقدار کو چھوڑنے میں مدد ملے گی۔

اس لئے میں نوجوان نسل کو اس کتاب کے پڑھنے کی ترغیب دینا پسند کروں گا۔ اور مصنف کو اس کی مبارک باد دوں گا۔ کہ انہوں نے اس مرض کی صحیح تشخیص کی ہے جو کہ ہمارے معاشرہ پر اثر انداز ہو رہی ہے اور اسکا صحیح علاج بھی تجویز کر دیا ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی کوشش کو کامیابی سے ہمکنار کرے۔

جسٹس حمود الرحمٰن

سابق چیف جسٹس آف پاکستان ــــ چیئرمین اسلامی مشاورتی کونسل پاکستان

کچھ مزید تبصرے (دوسرے ایڈیشن پر)

آپ کی مرسلہ کتاب " دین کے آئینے میں" دیکھنے کا اتفاق ہوا الحمد اللہ و ماشاء اللہ تعالےٰ آپ نے وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کر کے دعوتِ فکر و عمل دی ہے آپ اس کی مبارکباد قبول فرمائیں

دستخط - محمد بشیر - صدر ورلڈ اسلامک مشن - آزاد کشمیر

آپ کی مطبوعہ کتاب " دین کے آئینے میں" پڑھ کر دل سے دعائیں نکلتی ہیں درحقیقت اس کتاب نے ہمارے دل کو جیت لیا ہے۔ یہ کتاب مغربی طبقہ کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

دستخط - سید نصیب علی شاہ بخاری - دفتر جمعیت طلباء اسلام اکوڑہ خٹک ضلع پشاور

مدیر "چٹان" کا تبصرہ انصاف کے خلاف ہے۔ یہ تبصرہ پڑھ کر بندہ نے زیر بحث موضوع تلاش کئے نامعلوم مدیر چٹان نے صرف سرخیاں پڑھ کر مگر مضمون پڑھے بغیر رائے قائم کر دی مثلاً چٹان نے اپنے تبصرہ میں یہ تاثر دیا کہ کتاب مذکورہ میں حضور پاکؐ کو محض نور بتایا گیا ہے اور بشریت کا بالکل ہی انکار کیا گیا ہے اور واقعی ایسا عقیدہ ارشاد ربانی کے خلاف ہے لیکن جب بندہ نے کتاب کا متعلقہ مضمون پڑھا تو ایمان تازہ ہو گیا۔ میری ارسال کردہ جناب شورش کاشمیری صاحب (مرحوم) کی نعت "چٹان" کے اس تبصرہ کی مکمل تردید کرتی ہے۔

دستخط - اقبال حسین چشتی - جامع مسجد کانجن - شاہ عالم - تحصیل بھکر

آپ کی قابل قدر تصنیف "دین کے آئینے میں" سرسری طور پر نظر سے گزری اللہ تبارک و تعالےٰ جزائے خیر دے مجھے خوشی ہو گی۔ کہ ایک جلد آپ مجھے اپنے دفتر کے لئے عنایت فرما سکیں تاکہ وقتاً فوقتاً میں اخبار میں کچھ نہ کچھ درج کر سکوں

دستخط - غلام غوث صحرائی - ایڈیٹر روزنامہ " ہمارا پاکستان" پشاور

"دین کے آیئنے میں" پانچ جلدیں ارسال فرما کر مشکور فرمائیں اس کے متعلق عرض ہے کہ چند احباب کو میں نے آپ کی پہلی ارسال کردہ جلد پڑھنے کے لئے پیش کی دوستوں نے نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کیا ہے۔ عورتوں نے بھی پڑھی مزید احباب نے فرمائش کی ہے کہ یہ کتاب ہمیں منگوا دیں یہ کتاب پڑھی لکھی بچیوں کو پڑھنے کے لئے ضرور پیش کرنی چاہیئے۔ اخلاق محبت اور شوق دین اس کو پڑھنے سے زیادہ ہوتا ہے جن کے دل میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے وہ تو اس کا بار بار مطالعہ کرتے ہیں اور جی نہیں چاہتا کہ نظر کسی اور طرف جائے جس شوق اور پیار سے آپ نے اس کتاب کو لکھا ہے اللہ تعالے آپ کو اس کی جزائے خیر دے آپ کو دین و دنیا میں ترقی عطا فرمائے اور آپ کے درجات بلند کرے۔

دستخط۔ محمد شریف قادری منہاس۔ سمبڑیال۔

آپ کی ارسال کردہ کتاب پڑھی ہے یقین کریں بہت ہی پسند آئی ہے اس کتاب سے طالبعلم طبقہ پر بہت اچھا اثر پڑے گا آپ کی اس محنت پر اپنے دوستوں اور خود اپنی طرف سے بھی مبارکباد پیش کرتا ہوں ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالے آپ کو استقامت عطا کرے۔ نیز آپ کے عشق مصطفےٰ میں اضافہ ہو

دستخط۔ عبدالغفور رضوی۔ گوجرانوالہ

انجمن طلباء اسلام طلباء کے قلوب میں محبت رسولؐ پیدا کرنا چاہتی ہے آپ کی لکھی ہوئی کتاب "دین کے آئینے میں" مکمل طور پر سوادِ اعظم کی نمائندگی کرتی ہے اسے لاہور میں اقبال کانفرنس پر دیکھنے کا موقع ملا براہ کرم کتاب بھیج کر ہماری لائبریری میں اضافہ فرمایئے۔

دستخط۔ عاصم رشید۔ سیکرٹری نشرواشاعت انجمن طلباء اسلام (پاکستان) شکر گڑھ

محترم ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب کی کتاب "دین کے آئینے میں" پڑھنے کا موقع ملا اسلام کی روشنی میں موجودہ سائنسی علوم اور معاشرتی مسائل کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جس خوبصورت انداز سے قلم اٹھایا ہے اس کی تعریف نہ کرنا بخل ہوگا۔ عام فہم زبان میں مدلل تحریر اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہے آج کے تعلیم یافتہ نوجوان اسلام کے بارے اپنے بہت سے سوالوں کا جواب اس کتاب میں ڈھونڈ سکتے ہیں یہ صرف میری ذاتی رائے نہیں بلکہ جن حضرات کو بھی میں نے یہ کتاب پڑھنے کیلئے دی انہوں نے بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا۔

ڈاکٹر رشید اللہ صاحب کا دینی جذبہ قابل ستائش ہے اسلام کی سرفرازی کے لئے ہزاروں روپے کا خرچہ برداشت کر کے ایسی کتب مفت تقسیم کرنا صرف انہی اللہ کے بندوں کا کام ہے جنہیں وہ کریم آقا توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالے ڈاکٹر صاحب اور ان کے معاونین کو اپنی نعمتوں سے نوازے آمین!

دستخط۔ فرید احمد محبوب ترمذی سینئر انسٹرکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (نیپا)۔ لاہور۔

آپ کی انقلاب آفریں کتاب "دین کے آئینے میں" کا شہرت چار دانگ عالم روشنی کی طرح پھیل رہی ہے بسیار کوشش کے باوجود یہ کتاب نہیں مل سکی آپ سے گذارش ہے کہ یہ کتاب خط ملتے ہی اپنی اولین فرصت میں بندہ کے نام ارسال فرمائیں بندہ آپ کے حق میں دعائے خیر کے فرض کی بجا آوری کی حتی الوسع کوشش کرے گا۔ انشاء اللہ۔

دستخط۔ شبیر احمد گوندل متعلم بی۔اے۔ فائینل۔ سندا۔ ضلع گجرات۔

التماس خدمت ہے کہ آپ نے جو کتاب "دین کے آئینے میں" لکھی ہے یہ بہت ہی لاجواب ہے آپ نے بڑے محققانہ طریقہ سے بحث فرمائی ہے آپ نے بڑے عاشقانہ انداز میں عثمانی صاحب کے اعتراضات کے جوابات مرحمت فرمائے ہیں خدا تعالےٰ آپ کو دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

دستخط۔ حافظ نورالدین جمیل القادری۔ فتح گڑھ۔ سیالکوٹ۔

آپ کی تحریر کردہ کتاب بلاشک وشبہ ایک نہایت ہی عمدہ کتاب ہے اور مسلمانوں کیلئے بالخصوص نوجوان نسل کے لئے مشعل راہ ہے انجمن طلبائے اسلام کے توسط سے یہ کتاب پورے ملک میں متعارف ہو چکی ہے اور اسے بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ مجھے خود بھی انجمن کے ساتھیوں نے خطوط لکھے ہیں اور آپ کی گراں قدر تصنیف کی تعریف وتوصیف کی ہے خدا کرے کہ آپ جیسے بزرگوں اور نیک لوگوں کے ذریعہ معاشرہ اور قوم کی اصلاح ہوتی رہے اور دین سے برگشتہ نوجوانوں کو اپنی منزل سے آگاہی نصیب ہو۔ اللہ رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالےٰ آپ کو دین مصطفےٰ کی خدمت کا مزید عزم وحوصلہ عطا فرمائے۔

دستخط۔ محبوب علی مجاہد۔ قائم مقام صدر سٹوڈنٹس یونین۔ زرعی یونیورسٹی۔ فیصل آباد۔

آپ کی لاجواب اور مفید کتاب "دین کے آئینے میں" کا سردست سرسری مطالعہ کیا ہے خاصا

متاثر ہوا ہوں۔ آپ نے جس انداز میں غیر مسلم مؤرخین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے اور ہمارے دیگر مسلمان محققین اور علماء و فضلاء کرام کے لیئے دعوت فکر ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے فضلاء نے اس طرف کیوں عدم توجہی برتی ہے۔ آپ کی مرسلہ کتاب میں اپنے ذاتی مطالعہ کے لیئے رکھتا ہوں اور آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ میری طرف اس کتاب کے مزید چند نسخے اور ارسال فرمادیں جو میں اپنے شہر کے خطباء اور اپنے احباب کو مطالعہ کے لیئے دونگا۔ اس طرح لاتعداد لوگ آپ کی اس قابل قدر کتاب سے مستفید ہونگے۔ اور اللہ کرے کہ آپ دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں اور اس کتاب کی مزید اشاعت کے بہتر اسباب بن جائیں آمین! آپ کے پر خلوص جذبۂ دین سے راقم الحروف بہت متاثر ہوا ہے

دستخط۔ محمد ارشاد احمد مرزا۔ جنرل سیکرٹری۔ انجمن فدایان رسول پاکستان جہلم

گزشتہ دنوں لاہور میں داتا سرکار کے عرس مبارک پر آپ کی کتاب "دین کے آئینے میں" نظر سے گزری۔ سب سے پہلے ہم آپ کو یہ کتاب لکھنے پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کو اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق دیں میرے خیال میں اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے اس کے لئے میں آپ کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلاتا ہوں ویسے بھی اسلام کی خدمت و تبلیغ کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے میں نے اپنے طور پر جمعیت علماء پاکستان فیصل آباد کے تمام علاقائی دفتروں میں "دین کے آئینے میں" کتاب دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ فیصل آباد میں ہر دفتر کے ساتھ دارالمطالعہ جمعیت علماء پاکستان بھی کھلے ہوئے ہیں، میرے خیال میں ان دارالمطالعہ میں آپ کی کتاب رکھنے سے بھی اسلام کی کافی تبلیغ ہو سکتی ہے۔

دستخط محمد ارشاد اختر۔ جنرل سیکرٹری۔ جمعیت علماء پاکستان منصور آباد فیصل آباد

آپ کی کتاب "دین کے آئینے میں" کی گرد و پیش میں جب تعریفی القابات کی بھرمار دیکھی تو مجھے بھی تجسس ہوا۔ کتاب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ واقعی ایسے ہی دینی لٹریچر کی اشد ضرورت ہے اور آپ کی کوشش خوش آئند ہے لیکن میرے مکمل استفادہ کے لئے کتاب نذارد۔ اور مارکیٹ میں بھی معدوم سنا ہے کہ آپ نے اس کی مفت تقسیم کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ ماشاء اللہ فی زمانہ یہ اخلاص! اللہ تعالیٰ

اجر عظیم عطا فرمائے۔ مجھے بھی ایک نسخہ سے نواز دیجئے۔

دستخط۔ ضیاءُ الحق۔ ۲۷۴ قاسم ہال نشتر میڈیکل کالج۔ ملتان۔

آپ کی تصنیف "دین کے آئینے میں" کو اپنے ایک طالب علم دوست سے لے کر پڑھنے کا
اتفاق ہوا کتاب کو تھوڑا سا پڑھنے کے بعد حالات ہی اور ہو گئے اور اس کو بار بار پڑھنے کو دل چاہا
یہ کتاب ہر فرقہ اور ہر پیشہ سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کے لئے لمحہ فکریہ اور راہبر ثابت ہوئی ہے اور
نوجوان نسل خاص کر طالب علم کے لئے اس مادی اور سائنسی دور میں انتہ ضروری ہے۔

منظور احمد۔ گلبرگ اے۔ فیصل آباد

ایک طالب علم دوست کے پاس آپ کی لکھی ہوئی کتاب "دین کے آئینے میں" پڑھی۔ کتاب بہت
اچھی لکھی ہے اور ہر پہلو سے کامیاب نظر آتی ہے۔ یہ کتاب ہر نظریہ کے فرد کے لئے ایک دعوتِ فکر ہے
آپ نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں قرآن و حدیث کی روشنی میں تمام مسائل کو حل کر کے پیش کیا ہے طالبعلم
طبقہ کے لئے یہ کتاب راہ ہدایت کا کام دے گی۔

طارق رسول۔ فدائی ہال۔ زرعی یونیورسٹی۔ فیصل آباد۔

کل میں اپنے دکیل جناب فرخندہ سے ملنے گیا تھا۔ تو اُن کے پاس آپ کی کتاب "دین کے آئینے میں"
دیکھی رات میں نے آپ کی کتاب پڑھی اور محسوس کیا کہ آپ نے کافی محنت سے کتاب تصنیف کی ہے
اگر اس کی کچھ جلدیں ارسال فرمادیں تو عین نوازش ہو گی کیونکہ میں اب چاہتا ہوں کہ یہ کتاب میں اپنے
کچھ دوستوں کو بھی پڑھنے کے لئے دوں۔

شاہد لطیف۔ یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ سکھر۔

محترم میں بی۔ایس۔سی۔ کا ایک طالب علم ہوں جب اپنے معاشرے کو دیکھتا ہوں اور اپنے دوست
احباب کو دیکھتا ہوں تو پریشان ہو جاتا ہوں ایک نوانئی جہالت ہے۔ کہ ذہن بہت پریشان ہوتا ہے۔ اور
دوسرے اگر کسی کو مذہب سے لگاؤ ہے تو وہ بھی بیچارہ اسلام کی صحیح اسپرٹ کو سمجھ نہیں پاتا ان حالات
میں بہت ضروری ہے کہ ہر آدمی معاشرے کی اصلاح کے لئے نکلے تاکہ ہمیں سلجھا ہوا معاشرہ نصیب ہو سفر میں مجھے

ایک صاحب سے آپ کی تحریر کردہ کتاب "دین کے آئینے میں" دیکھنے کا موقع ملا پڑھ کر بے حد خوشی ہوا کہ چلیئے ہم میں سے کسی نے تو ہمارے اخلاق اور ہمارے نظریات پر توجہ دینے کا ارادہ کیا ہے۔ لہذا میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی ذمہ داری کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔

ظفر علی معرفت چوہدری علی اکبر۔ ساہوالی۔ سیالکوٹ۔

آپ کی کتاب بندہ نے ذوق و شوق سے منگوائی اور اس کا خوب مطالعہ اول تا آخر کیا ماشاءاللہ موصوف کتاب میں سلیس زبان استعمال کی گئی ہے اور انداز بیان نہایت احسن طریقے سے مرکوز ہے اس دورِ الحاد اور نازک ترین وقت میں ایسی کتاب لکھ کر مفت تقسیم فرما کر تعلیم یافتہ طبقہ اور علمائے ذی فہم کو خصوصی دعوتِ فکر پیش فرمائی ہے۔

ڈاکٹر قاری محمد عبدالغفور نوری، قادری دواخانہ۔ پاک پتن شریف۔

آپ کی مؤلفہ کتاب "دین کے آئینے میں" صد قابلِ قدر کاوش ہے میں نے اس کا اول تا آخر بغور مطالعہ کیا ہے۔ بے حد متاثر ہوا ہوں یہ کاوش مذہبی نقطہ نگاہ سے ہی نہیں بلکہ سائینس کی رو سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے اس گئے گزرے دور میں یہ مذکورہ تصنیف ان تمام مسلمان بھائیوں کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جو کفر و الحاد کے اندھیروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اُن سب کے لئے مشعل راہ بنے گی جو شرک و بدعت کی تنگ و تاریک گھاٹیوں میں صراط مستقیم کی تلاش میں سرگرداں ہیں دعا ہے مولائے لم یزل آپ کے لئے مایہ یوم النشور بنائے اور عالم اسلام کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔

محمد امیر چشتی۔ دارالعلوم حنفیہ فریدیہ۔ بصیر پور۔ ساہیوال۔

نہایت ادب سے معروض ہوں کہ میں فرنٹیئر کا ایک سیدھا سادہ دیہاتی مسلمان ہوں میں نے کتاب کا کچھ حصہ پڑھ لیا ہے۔ آپ نے دین اسلام کے لئے جو مالی قربانی اور دماغی محنت کی ہے صدقہ جاریہ ہے اور صدقہ جاریہ کے ثواب جیسے آپ خود باخبر ہیں۔ نیکی بھلائی کی جزا جنت ہے اور برائی و شر کی جزا دوزخ یہی اللہ تعالےٰ کا سچا وعدہ ہے میرا ایمان ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ کو اس دنیا میں باعزت اور سرخ رو رکھے گا اور آخرت میں جنت نصیب فرمائے گا۔ میں آپ کی کتاب کو پڑھنے کے بعد امام مسجد کے خود حوالے کرونگا

تاکہ وہ اس سے بچوں کو نصیحت کر کے مستفید کیا کرے میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو دین کی خدمت کے لئے تادیر زندہ و سلامت اور باصحت رکھے آمین!

میاں امیر شاہ کاکاخیل۔ اسماخیل پایان۔ نوشہرہ۔

آپ کی تحریر کردہ کتاب "دین کے آئینے میں" آج کے پرفتن لادینیت اور بدعقیدگی کی دور میں بھٹکی ہوئی ملت محمدیہ کیلئے مشعلِ ہدایت و ترقی ثابت ہو سکتی ہے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اس کے انگریزی عربی، فرانسیسی، جرمنی، افریقی، اور دیگر غیر ملکی زبانوں میں تراجم کر کے شائع کئے جائیں تاکہ دیگر مسلم و غیر مسلم لوگ بھی اس سے ضروری افادہ حاصل کر سکیں، اس سلسلہ میں آپ ورلڈ اسلامک مشن "جو کہ علامہ شاہ احمد نورانی کی سربراہی میں پوری دنیا میں کام کر رہا ہے اور جس کا مرکزی دفتر برطانیہ میں ہے ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں یا پھر کسی اور بین الاقوامی تنظیم سے۔

محمد افضل چیمہ (سٹوڈنٹ بی۔اے) جنرل سیکرٹری پاکستان طلباء اتحاد۔ تحصیل وزیرآباد۔

آج ہم ایک عرصہ کے بعد آپ کی خدمت میں معروض ہو رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے شعبہ نشر و اشاعت کیلئے جو آٹھ عدد کتب "دین کے آئینے میں" بھیجی تھیں اس پر ہم بے حد ممنون و مشکور ہیں کتاب کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بہت سی باتیں آشکارہ ہوتی ہیں جن میں سب سے اہم مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی فضا برقرار رکھنے اور دیگر مذاہب کے حملوں کا جواب دینا ہے۔ واقعہ معراج بہت سے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا ہے۔ بہر حال میرے اور میرے ہم خیال اراکین جمعیت کی طرف سے آپ کو داد تحسین قبول ہو کیونکہ ہمارے پاس اس کے علاوہ ایسے الفاظ نہیں ہیں جن کو تحریر میں لا کر آپ کی نایاب کوشش کو داد تحسین کا خراج پیش کر سکیں۔

عبدالصبور، عبدالقدوس، حافظ اللہ دتہ، ملک محمد لطیف، محمد اسلم، اختر امتیاز احمد، محمد اشرف، مخدوم عبدالکریم، فضل الرحمٰن۔ اے رحمٰن، ممتاز محمد محمود چوہدری محمد عزیز، حافظ محمد اسحاق، حکیم عطا محمد، قاضی محمد ظریف، عبدالرؤف، سید مسعود الحسن شاہ اور قاضی عبدالشکور ملک۔۔ نائب ملی۔

موجودہ دور میں مسلمان ہر جگہ پریشانی اور زبوں حالی کا شکار ہیں مغرب کے لادینی افکار اور اشتراکیت کی یلغار نے ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ دنیا بھر کی اسلام دشمن سامراجی طاقتیں مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے در پے ہیں مگر ایک ہم ہیں کہ بظاہر تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی دشمنوں کی یلغار سے بے نیاز آپس میں ایک خوفناک نظریاتی اور سیاسی انتشار کا شکار ہیں۔ الحاد و مادہ پرستی پر مبنی معاشرہ نے نئی نسل کو اسلام کی عظیم تعلیمات۔ اخلاق اقدار اور ثقافتی روایات سے بیزار و بیگانہ کر دیا ہے اور وہ افکار و کردار میں غیروں کی نقال ہے بقول علامہ اقبال رح

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود

اس بحران سے نجات حاصل کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلامی تعلیمات کا تابع بنائیں اور ہماری عقیدت و محبت مرکز و محور صرف حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکت ہو اور اسلام کا جو انقلاب آفریں پیغام اولیائے کرام کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے اس پر نہ صرف ہم خود عمل پیرا ہوں بلکہ خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہو کر دنیا کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچا دیں تاکہ نبی نوع انسان میں اس انقلاب کی بدولت باہمی اتحاد اخوت و محبت کے جذبات نشو و نما پاسکیں اور کرہ ارض امن و سلامتی کا گہوارہ بن سکے چونکہ صرف اسلام ہی انسانیت کے شرف و عظمت کا امین ہے اس لئے ملت اسلامیہ ہی اسلامی انقلاب کے سیدھے اور سچے اصولوں کو عملی جامہ پہنا کر امن عالم کی ضامن ہو سکتی ہے۔

محترم جناب ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے اپنی کتاب "دین کے آئینے میں" میں نئی نسل کے لئے حیات آفریں خیالات پیش کئے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر ملت اسلامیہ کے قلب و ضمیر عقل و ذہن اور فکر و کردار میں صحیح اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے قابل صد مبارک وہ لوگ ہیں جن کے قلوب مشکوٰۃ نبوت سے اکتساب نور کے لئے بے قرار ہیں

راؤ مرتضیٰ حسین اشرفی ناظم انجمن طلبائے اسلام ۔ پنجاب

آپ کی کتاب "دین کے آئینے میں" کا مطالعہ کرنے کا موقع کراچی میں میسر آیا کتاب کی تعریف کرنے سے عاجز قاصر ہے صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ ایک گمراہ انسان کے لئے یہ کتاب راہ نجات ہے اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس سے بے حد سبق حاصل ہوتا ہے اور میرے جیسا گنہگار شخص اس کے ذریعے خدا اور رسول کو پہچان سکتا ہے

مشتاق احمد ۔ سعودی عرب

جناب ڈاکٹر ارشاد اللہ صاحب کا کتابچہ "دین کے آئینے میں" نظر سے گزرا جس کے مطالعے سے روحانی مسرت ہوئی ہے کہ اس پر فتن دور میں اہل دنیا کو صراط مستقیم کی طرف اشارہ کرنے والے لوگ مسلمانوں میں موجود ہیں اس کتاب میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کی اخلاقی کمزوریوں اور ان کے علاج کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے نیز جنا تفیش اسلام اور غیر اسلامی نظریات کی اندھی تقلید کی قلعی کھول دی گئی ہے اور حقیقت پہ مبنی دلائل سے باطل کو باطل اور حق کو حق ثابت کیا گیا ہے پہلے ایڈیشن کے اضافہ میں عنوانات سونے پر سہاگہ کے مترادف ہیں خصوصاً واقعہ معراج اور بزرگان دین کی زندگی کے بارے میں اس انداز سے گفتگو کی گئی ہے گویا کوزے میں دریا بند کر دیا گیا ہے اس کے ساتھ ہی مسلک اہل سنت کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کا ازالہ بطریق احسن قرآن وسنت کے مطابق کر کے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کتاب کا طرۂ امتیاز مزید یہ ہے کہ قارئین حضرات کو "دین کے آئینے میں" اپنا آپ بخوبی نظر آتا ہے اور دین بھی اس آئینے میں سے جھک کر دلوں کو منور کر رہا ہے میری رائے میں اس کتاب کو طلبا کے نصاب میں ضرور شامل کرنا چاہیئے نیز اس کا غیر ملکی جدید زبانوں میں ترجمہ کروا کر تبلیغ دین کے لئے اسے شائع کروانا چاہیئے میری دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ تحفظ مقام مصطفیٰ اور نفاذ شریعت مصطفیٰ کی ایک کڑی کے طور پر جناب ڈاکٹر صاحب موصوف محب صادق امت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان مخلصانہ کوشش کو قبول فرمائے آمین، ثم آمین ۔ ! حاجی رحمت اللہ صدر انجمن رضائے مصطفیٰ چنیوٹ، صدر جامعہ شمسیہ نظامیہ، چیئرمین بزم جمعیت علماء پاکستان ۔ چنیوٹ ۔

ارشادِ ربانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَاِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَ لَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِھٰدِ الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِھِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَھُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

(سورت روم - آیات ۵۲، ۵۳)

ترجمہ: بے شک تو مردوں کو نہیں سناتا اور نہ ہی بہروں کو اپنی پکار سُنا سکتا ہے۔ جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر مڑ جاتے ہیں اور نہ ہی تو اندھوں کو ان کی گمراہی سے ہدایت کرنے والا ہے۔ تُو تو صرف ان ہی لوگوں کو سناتا ہے۔ جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ہیں بھی وہ اطاعت گزار۔

تشریح: ان مندرجہ بالا آیات مبارکہ کی رُو سے صرف وہی مسلمان قرآن مجید کی آیات سُن سکتے ہیں۔ یعنی سمجھ سکتے ہیں۔ جو ایمان لانے کے بعد اپنی زندگی میں عملاً اطاعت بھی کرتے ہیں اور جو لوگ قرآن پاک کی آیات کی اطاعت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ تو وہ اپنی نافرمانی کی وجہ سے سُن نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ تمام لوگ ... قرآن کے مطابق بظاہر کان رکھتے ہوئے بھی بہرے ہیں اور آنکھیں

ہوتے ہوئے بھی وہ اندھے ہیں اور دنیا میں بظاہر ان چلتے پھرتے لوگوں کو اللہ پاک مردوں کے نام سے منسوب کرتا ہے لہٰذا اب محسوس ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں کو شدت سے جھنجوڑا جا رہا ہے کہ ہم سب فرداً فرداً اپنا محاسبہ کریں اور قرآن مجید کی آیات کو صحیح طور پر سمجھنے کی صدق دلی سے کوشش کریں اور اپنے اعمال کی مناسب اصلاح کر کے اپنی زندگی کو ان کے مطابق ڈھالیں۔

سورۃ الطلاق میں ارشاد ربانی ہے کہ (مسلمانو) تم اللہ سے اتنا ڈرو جتنا کہ ڈر سکتے ہو۔ اور (اس کی آیات کو غور سے) سنو اور (ان کی) فرمانبرداری (یعنی اطاعت) کرو"۔ لہٰذا مسلمانوں کے لئے اس سے زیادہ اور کیا تنبیہہ ہو سکتی ہے ہوش مندوں کے لئے تو یہ لرز جانے کا مقام ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف پورے خلوص، عاجزی اور انکساری کے ساتھ رجوع کرنے کا۔

میری دُعا

بحضور ربّ ذُوالجلال

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنّا دے
جو قلب کو گرما دے جو رُوح کو تڑپا دے

محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے
دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

بشکریہ اقبال

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد وثنا اور دعا

اے اللہ تمام تعریفیں تیری ذاتِ بابرکات کے لیئے ہیں. تو عالی شان ہے. زمین و آسمان کی ہر شے تیری تسبیح کرتی ہے. تو علیم ہے. بصیر ہے. حکیم ہے. تو کائنات کا خالق و مالک ہے. غیب کا علم جاننے والا ہے. تو نہایت ہی رحم کرنے والا مہربان ہے. تو وحدہٗ لاشریک ہے. سب جہانوں کا پالنے والا ہے. تیری ذات ہر عیب سے پاک و بے نیاز ہے. میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں. تیرا ہی سہارا اور مدد چاہتا ہوں. اے اللہ تو میری زندگی کے ہر لمحہ اور ہر مرحلہ پر میری راہنمائی فرما اور مجھے اپنے فضل و کرم سے سیدھی راہ پر چلنے کی اس طرح توفیق عطا فرما کہ میرا شمار تو اپنے اُن بندوں میں کرے. جن پر کہ تو اپنا انعام کرتا ہے. اے اللہ میں تو تیرا نہایت ہی عاجز و مسکین بندہ ہوں. تو میری اس عاجزانہ دُعا کو شرفِ قبولیت بخش اور اس کتاب کی صورت میں میں جو اپنے دین کی خدمت کی کوشش کر رہا ہوں اسے قبول فرما اور اس کتاب کے بیان کرنے میں مجھ ناچیز سے اگر کوئی غلطی سرزد ہونے لگے تو تُو مجھے اس سے بچا اور معاف فرما. کیونکہ میں صدق دل سے تیرے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ اس کتاب کے لکھنے سے میری نیت و مقصد سوائے اس کے اور قطعاً کچھ نہیں کہ میں اپنے پیارے اور سچے دین کی اپنی حقیر بساط کے مطابق کچھ

خدمت کر سکوں اور اس طرح تیری خوشنودی کی سعادت حاصل کرلوں۔ ورنہ میں محدود ہوں۔ میری عقل محدود ہے اور میری بصیرت بھی۔ تو میری کمزوریوں اور مجبوریوں کو مجھ سے کہیں بہتر طور پر جانتا ہے کیونکہ تو ہی میرا خالق ہے، میرا مالک ہے اور میرا پاک پروردگار ہے اور جس وقت تیرا بندہ تجھے پکارتا ہے تو تُو اس کی پکار کو سنتا ہے اور جواب بھی عنایت فرماتا ہے۔

اس لئے اے اللہ! تو میری پکار کو سُن اور مجھے اپنے فضل وکرم سے توفیق عطا فرما کہ میں تیری نشانیوں پر تیرے حکم کے مطابق صحیح غور کرکے تجھے پا سکوں۔ اے اللہ تُو نے تو اپنی لاتعداد نشانیاں تمام کائنات میں ہر طرف بکھیر رکھی ہیں لہٰذا جس وقت میں تجھے دل کی آنکھوں سے ڈھونڈنے نکلتا ہوں تو حجابات اُٹھنے شروع ہو جاتے ہیں اور میں ہر طرف تجھے ہی موجود پاتا ہوں۔ ہر پھول میں، ہر شجر میں، ہر پرند میں اور ہر چرند میں ۔ سمندر کی تہ کے خزانوں میں اور بلند آسمان کے چاند ستاروں میں۔ ہر شے سے ہر ذرہ سے تیری قدرت ظہور پذیر ہے اور تیری قدرت تیری ذاتِ اقدس کی پوری شدت سے نشاندہی کر رہی ہے اور تیری ان تمام نشانیوں میں سے عظیم ترین نشانی تیرے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جن کی بدولت تیری سب سے نمایاں نشاندہی اور معرفت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ تیرا احسانِ عظیم ہے کہ تو نے انکو قرآنِ حکیم کے ساتھ ہماری ہدایت و راہنمائی کے لئے مبعوث کیا ہے اور میں تیری ہر ہر نعمت کا جتنا بھی شکر ادا کروں۔ کم ہے۔ لیکن ایک میں ہوں کہ نہ مجھے تیری حمد وثنا ہی کرنی آتی ہے اور نہ ہی تیری بے شمار نعمتوں کا شکر ادا کرنا آتا ہے اے اللہ۔ تو میرے اعمال پر نہ جانا۔ بلکہ میری انتہائی عاجزی اور بے بسی کو مدِ نظر رکھنا اور مجھے اپنی بے پایاں بخشش اور رحمت سے نوازنا۔ آمین۔ ثم آمین۔

کتاب لکھنے کا مقصد

اس کتاب کو لکھنے کا مقصد دین کی خدمت کے لئے سعی کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کا مقصد ہرگز سیاسی نہیں ہے اور نہ ہی راقم کے کوئی دنیاوی اغراض و مقاصد اس سے وابستہ ہیں اور نہ ہی اپنے مسلمان بھائیوں کے کسی طبقہ کی دلآزاری مقصود ہے۔ راقم کے لئے سب مسلمان واجب الاحترام ہیں اور اس کے دینی بھائی ہیں اور وہ ایک ادنیٰ اور حقیر کوشش کر رہا ہے کہ مسلمان صدقِ دلی سے آیاتِ قرآنی کی روشنی میں اپنی صفوں میں مکمل اتحاد و یگانگت پیدا کریں کیونکہ یہی وقت کی پکار ہے اور عین دینی تقاضا ہے۔

راقم یہ بات واضح طور پر ذہن نشین کروانا چاہتا ہے کہ ہر معاملہ کا صحیح و مکمل علم تو اللہ جلِ شانہٗ ہی کو ہے۔ راقم کا علم و بصیرت محدود ہونے کے باعث اس سے کسی معاملہ کو صحیح طور پر سمجھنے میں غلطی کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ اس واسطے یہ عین ممکن ہے کہ آپ کسی معاملہ میں راقم سے پوری طرح ہم خیال نہ ہو سکیں اور اگر راقم کی کوئی بات آپ کی طبع پہ ناگوار گزرے تو آپ نہایت فراخدلی سے اسے معاف فرمادیں۔ کیونکہ اول تو یہ سارا معاملہ دینی عقائد و جذبات کا ہے جو بذاتِ خود نہایت نازک اور حساس ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کتاب لکھنے کا مقصد آپ کے دل میں تنگی یا نفرت پیدا کرنا نہیں بلکہ آپ کا پیارا تعاون حاصل کر کے آپ کی خدمت میں کچھ ضروری باتیں عرض کرنا ہے۔ تاکہ آپ ان پہ مناسب غور و فکر کر کے اپنے پیارے دین اور دینی بھائیوں کے متعلق کچھ صحیح فیصلہ کر سکیں۔

مسلمانوں کی بڑی قسمیں

موجودہ دور کے مسلمانوں کو اس کتاب کی غرض و غایت کے مطابق تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ہیں جو اپنے ایمان میں سچے اور پختہ نظر آتے ہیں۔ ان میں ہمارے علمائے دین اور ان کے پیروکار ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جو اپنے آپ کو جہاں مسلمان سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہاں وہ خود کو تعلیم یافتہ اور مہذب بھی سمجھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے نظریات و اعمال میں بظاہر

اتنی لچک پیدا کر لی ہے کہ جہاں وہ گاہے بگاہے نماز روزہ اور دینی کام کر لیتے ہیں۔ وہاں وہ دنیاوی
مفادات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اپنے معمول میں اگر جھوٹ بول لیں، رشوت لے لیں، جوا
کھیل لیں، ٹیلی ویژن یا سینما میں کوئی فلم دیکھ لیں، رقص و سرود کی کسی محفل میں کبھی کبھار شرکت
کر لیں تو قطعاً کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنے ذہنی اور نظریاتی تقاضے کے مطابق اپنا شمار
موجودہ معاشرے میں تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں میں کروانا چاہتے ہیں جو بظاہر ایک اچھی صحت
مند طلب و خواہش ہے۔ لیکن ستم یہ ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم یافتہ ہونے کے لئے تعلیم کا
حصول اتنا معیار نہیں سمجھا جاتا کہ بعض جھوٹی دکھو کھلی اقدار کو اپنانے کا۔ کیونکہ ان میں سے اکثر
و بیشتر کا حال یہ ہے کہ اسلام یعنی اپنے دین کی مناسب تعلیم حاصل کرنے سے اس لئے گریز
کرتے ہیں کہ کہیں وہ اپنے ماحول میں جہاں وہ مقبولیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، جاہل و دقیانوس
نہ سمجھے جائیں اور علمائے دین اور مولوی حضرات سے تو یہ لوگ یوں بھاگتے ہیں۔ جیسے شیر سے گیدڑ
یا لومڑ۔ اس طبقہ میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کی سند اخلاق اور تعلیم
کو اتنا نہیں سمجھتے جتنا کہ اپنے ماحول میں تاثر دینا کہ چونکہ انہوں نے اپنے گھروں میں سے پردہ کو
جہالت و دقیانوسیت کی نشانی کے طور پر اب اٹھوا دیا ہے۔ لہٰذا اب وہ خود بخود پردہ اٹھوانے
کی بدولت مہذب و تعلیم یافتہ دور کے لوگوں میں شمار ہونے لگے۔ ان کے معیار میں ایک دسویں
پاس یا ایف اے پاس جس نے پردہ ختم کر دیا ہے ایک بی اے یا ایم اے پاس سے جس نے
ابھی تک پردہ کو اپنا رکھا ہے کہیں زیادہ مہذب و تعلیم یافتہ ہے تیسرا طبقہ ان مسلمانوں کا ہے جن کے
نام محض اس لئے اسلامی ہیں کہ انہوں نے مسلمان گھرانوں میں جنم لیا اور ان کے والدین نے
ان کے نام رکھنے کا فریضہ تو ضرور ادا کیا۔ لیکن اگر آپ انہیں اپنے دل کی بات کہنے کی اجازت
دیں تو وہ آپ کو بتائیں گے کہ وہ اللہ پاک کے وجود اور اسلام دونوں کے سرے سے انکاری
ہیں کیونکہ انہوں نے مغربی تہذیب پر لٹریچر پڑھ رکھا ہے۔ انہوں نے (VOLTAIRE)
DARWIN, KARL MARX, LENIN, اور MAO اور

سے نظریات کو اپنایا ہوا ہے۔ وہ مادہ پرستی کے قائل ہیں، ان کے نزدیک دین کی پابندیاں بے حقیقت ہیں، جو ان کے آباؤ اجداد نے اپنے اوپر اس لئے مسلط کر رکھی تھیں، کیونکہ وہ ایک ایسے فرضی خدا (نعوذ باللہ) سے ڈرتے تھے، جسکا حقیقت میں نہ کوئی وجود ہے اور نہ آج تک کسی نے اسے دیکھا ہے۔

یہ اندازہ کرنا تو قدرے مشکل ہے کہ مسلمانوں کے ان تینوں طبقوں یا حصوں کا آپس میں کیا تناسب ہے، کیونکہ راقم کے پاس اس بارے میں کوئی اعداد و شمار نہیں ہیں اور نہ ہی ایسے ذرائع موجود ہیں، جن سے یہ اعداد و شمار فی الحال حاصل کئے جا سکتے ہوں البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ستائیس برس پہلے تک جب کہ پاکستان بنا مسلمانوں کی واضح اکثریت پہلے حصہ ہی کے مسلمانوں سے تعلق رکھتی تھی، مسلمانوں نے بحیثیت قوم اپنے دینی جذبے کا بے پناہ مظاہرہ کیا، اسلام کے نام پر بے شمار قربانیاں دیں اور پاکستان ان قربانیوں کی بدولت معرض وجود میں آیا۔ وہ زمانہ تھا کہ مسلمان اسلامی اخوت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ لیکن دکھ کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دینی غلبہ ماند پڑتا گیا اور مادہ پرستی شدت سے اس کی جگہ لینے لگی، یہ ہماری زندگی کا وہ لمحہ تھا۔ جہاں ہمیں سنبھلنا چاہیئے تھا لیکن میری دانست میں ہمارے دینی رہبر اپنے اس اہم ترین دینی فرض کی ادائیگی سے غافل رہے اور جو پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ اس میں دین کا شیرازہ بکھرتا گیا، حتیٰ کہ ۱۹۷۱ء کا زمانہ آگیا اور اغیار نے مسلمانوں کی بے دینی اور انتشار سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مشرقی پاکستان مسلمانوں سے چھین لیا، ہو سکتا ہے کہ میرے بعض بھائی مشرقی پاکستان کے المیہ کی ذمہ داری ہندوستان پر ڈالیں اور بعض شیخ مجیب الرحمٰن پر یا جنرل یحییٰ خان پر، مگر میرے نزدیک اس المیہ کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہ رہے آپس میں اخوت و یگانگت نہ رہی، بڑی سیدھی سی بات ہے کہ جب اکثریت بے دینی کی طرف مائل ہو جائے اور لوگ آپس میں بات بات پہ لڑنا جھگڑنا شروع کر دیں۔ وہاں اسلامی اقدار پامال نہ ہوں گی تو اور کیا ہوگا۔

پاکستانی معاشرے کا حال

اب صورتِ حال یہ ہے کہ باقی ماندہ پاکستان بظاہر ایک نظریاتی اسلامی مملکت ہے جہاں اسلامی ماحول اور دینی اقدار کا غلبہ ہونا چاہیئے تھا. لیکن ماننا پڑتا ہے کہ اس اسلامی مملکت کے موجودہ معاشرہ میں جوا، شراب، رشوت، فریب دہی، چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت بتدریج زیادہ ہیں. اگر ہم ایمانداری سے اپنے حالات کا تجزیہ کریں اور اپنا محاسبہ کرنے سے نہ کترائیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے دین سے وابستگی کا دم بھرتے ہیں. خصوصاً ہمارے علمائے دین حضرات دین کی اس تمام بگڑی ہوئی صورتحال کے ذمہ دار ہیں. کیونکہ مسلمانوں میں عوام الناس کی مناسب دینی رہنمائی نہیں کی گئی ورنہ موجودہ لادینیت کی صورت پیدا نہ ہوتی. جس زمانہ میں پاکستان بنا ہم میں جذبۂ ایثار و قربانی بدرجہ اتم موجود تھا. ہم ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہونے کو سعادت سمجھتے تھے. لیکن جونہی پاکستان بنا اور ملک کے تمام ذرائع و وسائل ہمارے سامنے ظاہر ہوئے تو راتوں رات امیر بننے کی ہوس نے ہمیں آن گھیرا، ہم نے خطرہ محسوس کیا کہ مال و دولت حاصل کرنے کی دوڑ میں ہم کہیں اپنے ساتھیوں سے پیچھے نہ رہ جائیں لہٰذا ہم جائز و ناجائز، حلال و حرام اور بھلے بُرے کی تمیز کئے بغیر اپنی دینی اساس کو اس طرح بھول گئے. جیسے کہ اسکا ہم سب کے ساتھ شاید دور کا بھی تعلق نہیں. ہم اس طرح بتدریج اپنے دین سے دور تر ہوتے چلے گئے. ہمارے زوال کی انتہا اس وقت ہوئی جب کہ ہم نے روٹی اور کپڑے کے حصول کی خاطر پاکستان کی بنیادی و نظریاتی اساس سے اعلانیہ کنارہ کشی اختیار کی اور ہم میں سے کسی کو یہ احساس نہ ہوا کہ بغیر بنیاد کے پاکستان کی عمارت کیسے کھڑی رہ سکتی ہے.

مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

مقام مسرت ہے کہ اب محسوس ہو رہا ہے کہ عرصہ دراز کے زوال کے بعد عالمِ اسلام ایک بار پھر کروٹ لے کر بیدار ہو رہا ہے. اور اپنے عروج کی جانب قدم بڑھانے کی تیاریاں کر رہا ہے. سعودی عرب کے شاہ فیصل عالم اسلام کو بیدار کرنے میں اور ان میں اسلامی اخوت و محبت پیدا کرنے میں

پیش پیش تھے۔ وہ اللہ کی راہ میں اس کے دین کا غلبہ حاصل کرنے کی خاطر اپنی جان و مال اور وقت سب کچھ صرف کرتے رہے ہیں۔ لاہور میں پچھلے سال جو تاریخی اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد ہوئی اس کے دور رس نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کا اسلام کے نام پر اس شدومد کے ساتھ سعی کرنا ایک ایسی بات ہے جس نے مغربی تہذیب کے فلاسفروں اور حواریوں کو محوِ حیرت کر دیا ہے۔ اسلامی سربراہی کانفرنس کا سہرہ جہاں پاکستان کے سر ہے۔ وہاں شاہ فیصل بھی اس میں برابر کے شریک ہیں اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس کی دراصل روحِ رواں ہی وہ ہیں۔ اللہ پاک کے حضور دعا ہے کہ وہ سعودی عرب کے شاہ فیصل جنہوں نے اپنی جان اپنے پیارے دین کی سربلندی کے لئے قربان کر دی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے ولی عہد بھائی شاہ خالد بن عبد العزیز کو مرحوم کے نقشِ قدم پر چلنے اور عالمِ اسلام کو متحد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مسلمان دینی بھائی ہیں

سب مسلمان تو دین کی بدولت آپس میں بھائی بھائی ہیں، چاہے وہ پاکستان میں ہوں یا ہندوستان میں ترکی میں ہوں یا ایران میں، مصر میں ہوں یا شام میں شرط صرف یہ ہے کہ وہ اسلام پر عمل پیرا ہوں۔ سورۂ حجرات میں ارشادِ ربانی ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

ترجمہ: "یاد رکھو سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس اپنے دو بھائیوں میں ملاپ کروا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

اس آیت مبارکہ میں حق تعالےٰ ہم سب مسلمانوں کو واضح ہدایت فرما رہا ہے کہ دیکھو تم کہیں بھول نہ جانا کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے لئے حقیقی معنوں میں بھائی کی محبت اور جذبات پیدا کریں۔ آپس میں لڑائی جھگڑے سے ہر ممکن گریز کریں اور اگر اس کے باوجود کبھی دو بھائی آپس میں ناراض ہونے لگیں یا جھگڑنے

لگیں تو ان کو ایسا نہ کرنے دیں بلکہ ان کی فوراً صلح کروا دیا کریں اور ساتھ ہی اللہ پاک نے یہ تنبیہہ بھی فرمائی ہے کہ اس کے اس حکم کو کبھی نہ بھولیں اور نہ کسی حالت میں نظرانداز کریں بلکہ ہر وقت اس کی ذاتِ عالی شان سے ڈرتے رہیں تاکہ اس بارے میں اس کی حکم عدولی نہ ہو اور اس طرح ہم پر اللہ اپنا رحم کرے۔ اس مقام پر غور طلب مسئلہ یہ پیدا ہو رہا ہے کہ ہم سب مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ ہمارا ایمان اللہ پہ بھی ہے اور قرآن مجید پر بھی اور اس کی ہر ایک آیت مبارکہ پر بھی۔ میری دانست میں ایمان لانے کی دو بڑی علامتیں یہ ہیں۔

پہلی کیفیت یہ ہے کہ ایمان کا اعلان و اقرار صرف زبان یا ذہن کی حد تک ہو۔ دوسری کیفیت یہ ہے کہ ایمان کا اعلان و اقرار دل کی گہرائیوں سے اس طرح ثابت ہو کہ اس کے اثرات عمل کی صورت میں واضح طور پر نمودار ہوں اور ہر دیکھنے اور سننے والا اس قلبی ایمان کی بلاجھجک تصدیق کر سکے لہٰذا ہم سب مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہم دین کے اس آئینہ میں اپنے اندر انفرادی طور پر جھانکیں تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ ہم نے کون کون سی شکل و صورت اختیار کر رکھی ہے اور کون کونسا لبادہ اوڑھ رکھا ہے تاکہ یہ ممکن ہو سکے کہ جہاں ہم ضرورت محسوس کریں، ہم اپنی شکل و صورت میں، لباس میں اور اپنے قول و فعل میں دین کے تقاضوں کے مطابق ضروری تبدیلی کریں۔

تفرقہ نہ کرنے کی ہدایت

اس ضمن میں حق تعالیٰ سورہ آل عمران میں ارشاد فرماتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَآءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ

ترجمہ: "اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور آپس میں تفرقہ مت ڈالو اور خدا کی اس وقت کی نعمت کو یاد رکھو۔ جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے اپنی مہربانی سے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور جب کہ تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے۔

اس نے تمہیں بچالیا۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لئے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم راہِ ہدایت پاؤ۔

اس آیت مبارکہ کی روشنی میں ہماری زندگی کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں جنہیں ہمیں اپنے خلوص و مکمل ایمانی کیفیت سے ذہن نشین کرنا چاہیئے تاکہ ہماری عملی زندگی میں اس آیت مبارکہ کے ثمرات مرتب ہوں۔ پہلی بات جو سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان اللہ کے دین پر قرآنِ حکیم اور رسولِ پاک کے ارشادات کے مطابق سختی سے جمے رہیں۔ اللہ کے احکامات کو انفرادی و اجتماعی زندگی پر لاگو کریں تاکہ ہمارے اعمال کی مناسب اصلاح ہو۔ پھر یہ تنبیہہ فرمائی گئی ہے۔ کہ مسلمان آپس میں ہرگز ہرگز تفرقہ نہ کریں۔ بظاہر یہ تنبیہہ (نعوذ باللہ) معمولی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ علمی سطح پر بھائیوں میں تفرقہ اس لئے نہیں ہونا چاہیئے کہ بھائیوں میں تو جذبۂ اخوت ایثار و قربانی غالب ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں تفرقہ پیدا ہونے کا کیا سوال۔ لیکن چونکہ رب العزت کی ذات غیب کا علم جاننے والی ہے۔ وہ علیم ہے، خبیر ہے اور حکیم ہے اس لئے وہ جانتی ہے کہ ان مسلمان بھائیوں میں تفرقہ پیدا ہونے کا خدشہ موجود ہے۔ چنانچہ ان میں اختلافات پیدا ہوں گے۔ اور یہ شدید ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے آپس میں تفرقہ کریں گے اس لئے اللہ جل شانہ، ہم مسلمانوں کو ہدایت و تنبیہہ دینے کی ضرورت محسوس کر رہا ہے لہٰذا اس تنبیہہ کو زیادہ موثر طور پر ہمیں ذہن نشین کروانے کے لئے حق تعالیٰ نے مزید ارشاد فرمایا ہے کہ ہم یاد رکھیں اور ہرگز نہ بھولیں کہ ہم اپنے طور پر اپنے اعمال کی وجہ سے پہلے دشمن دشمن تھے۔ لیکن اس نے ہم پر اپنا بڑا ہی کرم فرمایا کہ آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور یہ اللہ کی ہم پر ایسی نعمت ہے کہ جس کا شکر بجالانا ہم پر لازم ہے۔

اگر کوئی (نعوذ باللہ) اللہ پاک کی نعمت کو نہ پہچانے یا اس کی قدر کرنے سے عملی طور پر انکاری ہو یعنی تفرقہ کرنے پر بضد ہو تو اسے سورہ بقرہ کی وہ آیت ذہن میں لانی چاہیئے کہ جب بنی اسرائیل کی قوم نے من و سلویٰ کی نعمت سے ناشکری کی تو ان سے اللہ پاک نے نہ صرف وہ نعمت واپس لے لی بلکہ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انہوں نے نعمت کی ناشکری کر کے اللہ پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود اپنی ہی جانوں

پر ظلم کیا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اللہ پاک کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے تفرقہ سے ہر حالت میں بچنے کی کوشش کریں اور معاملہ یہاں پر ہی بس نہیں ہوتا بلکہ اللہ پاک مزید فرما رہا ہے کہ یہ اس کی عین مہربانی ہے جو اس نے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت ڈال دی ہے اور ہمیں دینی بھائی بھائی کا رتبہ عطا کیا ہے ورنہ ہم خود تو آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ کا مجموعی تاثر یہ ملتا ہے کہ تفرقہ سے بچنے کی تنبیہ اس خدشہ کی نشاندہی کر رہی ہے کہ امتِ مسلمہ میں اختلافات تو ضرور نمودار ہوں گے۔ کیونکہ جہاں اختلافات پیدا ہی نہ ہوں اور ہر معاملہ اور ہر مسئلہ میں ہم آہنگی ہی ہم آہنگی ہو وہاں تفرقہ پیدا ہونے کا قطعاً سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن چونکہ امتِ مسلمہ میں اختلافات پیدا ہوں گے۔ اس لئے تفرقہ سے بچنے کی تنبیہ کی گئی ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ ہم سب اپنے دین پر سختی سے جمے رہیں کیونکہ اختلافات ہمیں دین پر قائم رہنے سے نہیں ہٹا سکتے۔ بلکہ ہم سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایسا ہونا ہمارے لئے اس کی مہربانی بھی ہے اور نعمت بھی اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس نعمت کو کبھی نہ بھولیں اور نہ اس سے روگردانی کریں بلکہ ہم اپنے اعمال کی رو سے حق تعالیٰ پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ ہم مسلمان واقعی ایمانی ذہنی اور عملی طور پر آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور تفرقہ کی لعنت سے بچنے کے لئے اللہ پاک کی پناہ مانگتے ہیں۔ یہ تو ہے مندرجہ بالا آیت مبارکہ کی شرح جو راقم نے اپنی دانست کے مطابق آپ کی خدمت میں اختصار کے ساتھ پیش کی ہے۔

باپ بیٹے سے بے نیاز

اب اگر ہم اپنے ماحول پر نظر ڈالتے ہیں تو مشاہدہ ہوتا ہے کہ ہم اسلامی مملکت پاکستان میں ابھی اپنے دین سے کافی دور ہیں۔ معاشرہ میں جوا، شراب، رشوت، فریب دہی، چوری، ڈاکہ زنی اور قتل و غارت گری وغیرہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ہم بات بات پر تفرقہ کرتے ہیں۔ مادہ پرستی کے عالم میں اپنے نفس کے غلام ہیں۔ ہم میں بہت کم ایسے خوش قسمت ہیں جو آپس میں واقعی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں اور اگر کبھی آپس میں دو بھائی اُلجھ جائیں تو ان کی صلح کروا دیتے ہیں بے شمار

گھرانوں میں نفسا نفسی کا تو یہ عالم ہے کہ باپ کو بیٹے کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کچھ کر رہا ہے۔ اس کے مشاغل کیا ہیں۔ اس کے دوست کون سے ہیں، وہ اچھے اخلاق کے مالک ہیں یا بد کردار ہیں اور نہ ہی بیٹے کو اپنے والد محترم کی مصروفیات سے کوئی حقیقی دلچسپی و غرض ہے۔ دونوں کو علم ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بعض معاملات میں جھوٹ بول کر ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مصلحت یہی سمجھی جاتی ہے کہ یہ سب کچھ خاموشی و سکون سے برداشت کر لیا جائے اس لئے باوجود اس کے کہ عالمِ اسلام مجموعی طور پر بیدار ہو رہا ہے لیکن پاکستان میں مسلمانوں کو اپنے اعمال کو عین دین کے مطابق ڈھالنے کے لئے ابھی کافی مسافت طے کرنا ہے۔

دینی رہنمائی کون کرے

افسوس کے ساتھ یہ اعتراف بھی کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہمارے علمائے دین جن کے ذمہ یہ اہم ترین فرض ہے کہ وہ بوقتِ ضرورت امتِ مسلمہ کی صحیح دینی رہنمائی کریں وہ بھی اس تفرقہ کا بری طرح شکار ہیں۔ حالانکہ وہ آیاتِ مذکورہ کا پورا پورا علم رکھتے ہیں۔ ان کی شرح سے بھی بخوبی واقف ہیں اور وہ اپنے عقیدتمندوں کی رہبری کے لئے بار بار یہ اعلان کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی کسی بھی ایک آیت سے انکار پورے قرآنِ پاک پر ایمان کی نفی کے مترادف ہے۔ ازیں حالات کیا تفرقہ کی موجودہ کیفیت مندرجہ بالا آیات کی بظاہر نفی نہیں کرتی؟ ہماری اس تفرقہ بازی نے جوان تعلیم یافتہ ذہنوں کو جو اسلام کی طرف پسندیدہ انداز میں رجوع کرنا چاہتے ہیں، وسوسے کی سخت الجھنوں میں ڈال رکھا ہے۔ اس وقت ہمارے اندر کم و بیش ۷۲ فرقے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے تئیں پوری طرح مطمئن نظر آتا ہے۔ کیونکہ وہ یقین کئے بیٹھا ہے کہ صرف وہ ہی حق پر ہے اور باقی تمام فرقے گمراہ ہیں۔ ایسی افراتفری کے عالم میں جوان فکر تعلیم یافتہ ذہن کیسے فیصلہ کرے کہ ہم ہیں کونسا فرقہ واقعی حق پر ہے جب کہ وہ بیچارہ خود اپنے دین سے ابھی بے بہرہ ہے اور مناسب دینی رہنمائی کے لئے علمائے دین کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان حالات میں ڈرتے نہ تو کیا کرے۔ دین سے

بھاگے نہ تو کیا کرے اور ادھر ہم ہیں کہ اس کو کھلائے ہوئے نووارد سے اپنے مخصوص عمل کی بدولت اس سے یہ تقاضا کرتے ہیں کہ وہ ہم میں شامل ہونے سے پہلے اپنا فیصلہ صادر کرے اور یہ ڈگری دے کہ ہم میں سے کون سا فرقہ راہِ حق پر ہے اور بعد میں ہم اس نووارد کو جو ہمیں اپنے امتحان میں پاس قرار دے دے۔ اسلام کی تعلیم دینے کے لئے تیار نظر آتے ہیں۔

راقم نہایت عجز و انکساری کے ساتھ اس ضمن میں یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر ہم نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی تبلیغ و فروغ کی کچھ ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوتی ہے اور ہم نے عملی طور پر ان کے لئے بہتر مسلمان اور نیک مسلمان بننے کا ماحول پیدا کرنا ہے تو ہم سب پر عموماً اور علمائے دین پر خصوصاً یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ موجودہ تفرقہ کی صورتِ حال کو یکسر بدل ڈالیں۔ وہ اپنے دینی معاملات میں پھوٹ نہ پیدا ہونے دیں۔ یہ مت بھولیں کہ دین کسی ایک مکتبہ فکر یا فرقہ کی ملک نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے اپنی بساط کے مطابق سمجھے اور تحقیق کر کے نتائج اخذ کرے۔ اس طرح ہر فکر کرنے والا اللہ پاک کی کبریائی جس مخصوص رنگ میں دیکھتا ہے۔ اس میں وہ رنگا جاتا ہے، اسی کو پہچانتا ہے، اسی رنگ کو حقیقت سمجھتا ہے اور صرف اسی کو صحیح سمجھتے ہوئے بیان کرتا ہے۔ شاید اسی لئے دوسروں کی تحقیق، تجربہ و مشاہدہ اس کو بے معنی و بے حقیقت لگتا ہے۔ اس لئے آپس میں تحقیق، تجربہ و مشاہدہ کے اختلافات تو پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو ہمیں نہایت خوش اسلوبی سے بردباری سے اپنے رویے میں مناسب لچک کے ساتھ طے کر لینے چاہئیں اور تفرقہ کی لعنت سے ہر حالت میں بچنا چاہیئے تاکہ مسلمان بھائیوں میں وہ اتحاد پیدا ہو جس کا ذکر حق تعالےٰ سورہ صف میں یوں فرماتا ہے "بے شک اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو اس کی راہ میں صف باندھے اس طرح جہاد کرتے ہیں۔ جیسے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار"، اس لئے اگر ہم واقعی یہ صدقِ دل سے چاہتے ہیں کہ ہم اللہ پاک کے دوست سمجھے جانے کے اہل ہوں تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی صفوں میں وہ مثالی اتحاد و یگانگت پیدا کریں۔ جس کی بدولت ہم جہاد میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند بن سکیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ میں تبلیغ کی ضرورت

میری دانست میں دین کی تبلیغ و فروغ کا کام دو سطحوں پر ہونا درکار ہے ایک تو مسلمان کو دین کی بنیادی ضروریات سے پوری طرح آگاہ کرنا اور اس طرح انہیں بہتر مسلمان بننے کی ترغیب و تربیت دینا تاکہ وہ ان تمام غیر دینی افعال سے بچ سکیں جو گناہ کی فہرست میں آتے ہوں اور اس تبلیغ کی زیادہ تر ضرورت ان مسلمانوں میں ہے جو پہلے طبقہ کو چھوڑ کر دوسرے اور تیسرے طبقہ میں آتے ہیں۔ یعنی وہ مسلمان جو اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہوئے دینی کاموں کے ساتھ ساتھ بے شمار غیر دینی اور موجب گناہ کام بلا تامل کر جاتے ہیں اور وہ مسلمان جو صرف نام کے مسلمان ہیں اور دل سے خدا پر کوئی یقین و ایمان نہیں رکھتے۔ اس میں شک نہیں کہ دوسری قسم کے مسلمانوں کو دین کا پابند بنانا تیسری قسم والوں سے نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے لئے بھی یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے دین کو جہاں دینی امور پر عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہاں انہیں انسانی نفسیات، مغربی تہذیب، مادہ پرستی اور سوشلزم جیسے امور پر بھی خاطر خواہ دسترس حاصل ہو۔ تاکہ وہ ان مسلمانوں سے ان ہی کے انداز زبان و بیان میں انہیں مطمئن کر سکیں اور ان پر ثابت کر سکیں کہ مجموعی تجزیہ میں اسلام ہی وہ واحد نظریہ و دین ہے جو دنیا و آخرت کے تمام مسائل بخوبی حل کر سکتا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے اگر مسلمانوں کو ہمارے علمائے دین یہ تاثر دیں کہ وہ ان سے کسی طرح کم پڑھے لکھے نہیں ہیں اور جو نظریات ہمارے مسلمانوں کو دین سے دور لیجانے کا باعث بنتے ہیں۔ ان کا خاطر خواہ علم علمائے دین نے بھی حاصل کیا ہوا ہے مگر اس کے باوجود وہ سب اسلام پر پوری دلجمعی سے کاربند ہیں۔ لیکن اگر ہمارے علمائے دین کی بیشتر تعداد اپنی موجودہ روش پر قائم رہی اور صرف ان نظریات کے حامل مسلمانوں کو برا بھلا کہنے اور کوسنے پر ہی اکتفا کرتی رہی تو ان مسلمانوں کے ذہن کو اسلام کی طرف خاطر خواہ انداز میں راغب کرنے کی بجائے ان میں نفرت و حقارت کے جذبات کو پروان چڑھائے گی اور یہ وہ صورت حال ہوگی جسے کسی بھی انداز سے تبلیغ اسلام کہنا سراسر زیادتی ہوگی۔ سیدھی سی بات ہے کہ کسی بھی شخص کو

اپنا ہم خیال صرف اسی وقت بنایا جاسکتا ہے اور اس کا خاطر خواہ تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کے لئے حقیقی معنوں میں خیر خواہی کے جذبات رکھے جائیں اور اس کے خیالات کو ہمدردی اور غور سے سنا جائے اور پھر اس کے شک و شبہ کو دُور کیا جائے۔ اس کے تمام سوالات و اعتراضات کا تحمل مزاجی سے جواب دے کر اسے قائل و مطمئن کیا جائے اور اس دوران اس کے جذبات کو کسی طرح اپنی تلخ کلامی سے مجروح نہ ہونے دیا جائے لیکن اس کے برعکس اگر کسی فرد میں حقارت و نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے جائیں تو اس وجہ سے وہ فرد ہم سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ حقارت و نفرت تو لوگوں کو آپس میں مرنے مارنے پر بھی بعض اوقات آمادہ کر دیتی ہے۔ میں نے تبلیغ کے سلسلے میں جو مندرجہ بالا دلائل گوش گذار کئے ہیں۔ ان کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہ اندازِ تبلیغ جس پر میں نے زور دیا ہے۔ اگر اختیار کیا جائے تو لازماً اور شرطیہ ہر شخص صحیح اسلام لے آئے گا۔ یہ معاملہ تو توفیق کا ہے۔ جسے چاہے۔ اللہ پاک صراط مستقیم اختیار کرنے کی توفیق بخشے اور جسے چاہے اس کے دل پر کفر کی مہر لگا رکھے۔ البتہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے پیارے دین کی نہایت ہی پیارے مدلل اور مہذب انداز میں تبلیغ کریں۔ جس سے لوگ خاطر خواہ انداز میں متاثر ہوں۔

علمائے دین سے مسلمانوں کو شکایات

مجھے یہاں ایک واقعہ یاد آگیا ہے۔ مناسب ہے کہ اسے اپنے نقطہ نظر کی تشریح میں بیان کرتا جاؤں۔ میں ایک دفعہ مسجد حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ میں حاضر تھا۔ وقت عصر کے بعد کا تھا۔ ایک مولانا اپنے مخصوص انداز میں تقریر کر رہے تھے۔ تقریر میں انہوں نے بار بار فارسی کے شعر پڑھے۔ سامعین میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو فارسی زبان نہیں جانتے تھے۔ اس لئے کچھ لوگوں نے شکایت کی۔ مولانا فارسی زبان میں شعر پڑھنے پر توجہ کیوں دیتے ہیں۔ مولانا کو یہ شکایت ناگوار گزری۔ انہوں نے اپنے احباب میں ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنے دل کی بات سے کوئی نہیں روک سکتا اور اگر کسی ایم اے پاس نے کبھی یہ شعر پہلے نہیں پڑھے یا سُنے تو اس میں

میرا کیا قصور ہے۔ کتنے افسوس کی بات کہ یہ محترم مولانا صرف اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے کہ وہ اپنے ذاتی روحانی تقاضے ہی پورے کریں اور صرف اپنی روحانی پیاس اپنے انداز میں بجھائیں انہیں اس سے کوئی غرض یا سروکار نہ تھا کہ وہ سامعین کی بھی رہنمائی کریں اور اپنے کلام سے مستفید کر کے ان کی روحانی پیاس بھی بجھائیں۔ وہ بظاہر اپنی اس ذمہ داری سے بالکل بے نیاز نظر آتے تھے۔ جو ان پر اپنے مسلمان سامعین میں تبلیغ کے بارے میں عائد ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تبلیغ کے بارے میں کچھ ذمہ داری تکلف کی حد تک تو محسوس کرتے ہوں لیکن اس کو اتنا اہم نہ تصور کرتے ہوں۔ جتنا کہ اپنے علم کا سامعین میں مظاہرہ کر کے دادِ تحسین حاصل کر کے اپنے نفس کو تسکین پہنچانا۔ حالانکہ معاملہ تو بالکل اس کے برعکس ہونا چاہیئے تھا۔

ہمارے علمائے دین سے عام مسلمان بھائیوں کو یہ بھی خدشہ اور شکایت ہے کہ مسلمان علمائے دین میں سے اکثر اپنے وعظوں میں ایسے من گھڑت قصے اور کہانیاں بیان کر جاتے ہیں جن کی صداقت صرف جاہل اور بے وقوف لوگ ہی تسلیم کر سکتے ہیں اور پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں پر تو ایسے وعظوں کا الٹا ہی اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ بقول ان کے وہ اس اسلام سے جو یہ واعظ بیان کرتے ہیں۔ دور ہی بھلے۔ پھر یہ لوگ بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسے واعظ بازاری مجلس لگانے میں تو کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن باشعور پڑھے لکھے لوگوں کو متاثر نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی تعلیم اور عقل پر اتنا اعتماد اور ناز ہوتا ہے کہ اگر وہ کوئی ایسا دینی مسئلہ اپنے علمائے دین سے سن لیں جو ان کی سمجھ میں نہ آسکے تو وہ اس مسئلہ کی صحت پر شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر علمائے دین مسئلہ کی وضاحت میں کسی حدیث مبارکہ کا حوالہ دیں تو یہ لوگ پھر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔ بلکہ حدیث کو ضعیف وغیر معتبر قرار دیتے ہیں۔ چاہے وہ حدیث متفق علیہ ہی کیوں نہ ہو۔ وجہ اس صورتِ حال کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی خطبہ کا سامعین پر خاطر خواہ اثر صرف اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب کہ علمائے دین اپنے سامعین کے ذہنی معیار اور دینی علم کی مطابقت سے خطبات دیا کریں اور اس طرح سامعین کی دینی اور علمی سطح پر اتر

کہ ان کو علمائے دین اپنا ہمسفر بنائیں اور بغیر گھسیٹے ان کی رضامندی اور ولولے سے انہیں ان کی دینی منزلِ مقصود پر پہنچائیں اور یہی وجہ ہے کہ راقم بھی اپنی موجودہ تحریر میں حدیث مبارک یا دوسری مستند کتب کا حوالہ دینے سے حتی الوسع گریز کر رہا ہے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے قرآن پاک کی آیاتِ مبارکہ کا ہی زیادہ سے زیادہ سہارا لے رہا ہے. کیونکہ اگر کوئی ایک متفق علیہ اور مستند حدیث مبارک کو بھی ضعیف سمجھتے ہوئے راقم کے نقطۂ نگاہ پر غور کرنے اور اتفاق کرنے سے انکار یا گریز کرے تو راقم کی اس کتابچہ کو لکھنے کی سعی اس فرد کی حد تک لاحاصل اور بے مقصد ہو جائے گی. اس لئے راقم ایسی صورتِ حال سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہے. کیونکہ اس کا مقصد ہر ذی شعور اور صحت مند ذہن تک اپنا نقطۂ نظر نہایت صدق دلی سے پہنچانا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے. کہ بغیر کسی تعصب کی پٹی باندھے ان کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے اور ان کی زبان میں انہی کی علمی سطح پر اخوت و محبت کے جذبہ کے تحت بات چیت کی جائے تاکہ ہمارے اپنے پیارے دین سے وہ وابستگی پیدا ہو سکے. جس کے ہم خواہاں اور متمنی ہیں.

دشمنانِ اسلام کی یلغار

دشمنانِ اسلام جو ہمارے دین پر اپنے سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت جو پے در پے گھناؤنے حملے کر رہے ہیں. ضرورت ہے کہ ان کا قدرے تفصیل کے ساتھ علیحدہ باب میں ذکر کیا جائے. اس وقت اتنا ہی کہنا مقصود ہے. کہ یا تو ہمارے مسلمان بھائی عموماً اور علمائے دین خصوصاً ان حملوں کے بارے میں بے بہرہ ہیں یا پھر ان ناپاک حملوں سے اسلام کو بچانے میں اپنی ذہنی، علمی اور نفسیاتی بے بسی محسوس کرتے ہوئے راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں. ان میں سے اکثر و بیشتر بلا لحاظِ تفریق و تمیز چپ سادھے ہوئے ہیں اور کفر سے نمٹنے کے لئے بظاہر کوئی کوشش کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے ورنہ میری دانست میں ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ وہ آپس میں مکمل اتحاد و یگانگت کو حقیقی معنوں میں اپنے اندر پیدا کریں اور سادہ لوح اور کم علم مسلمانوں

کو اس خطرناک پھیلنے والے شر کے ہر پہلو سے آگاہ کر کے بچانے کی سعی کریں۔ راقم یہاں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اسے مختلف مکاتیبِ فکر کے علمائے دین کی مجالس میں گاہے بگاہے حاضری دینے کا کچھ شرف حاصل ہوا ہے اور اس نے اس بنا پر یہ بات خاص طور پر محسوس کی ہے کہ ہمارے علمائے دین نے شاذ و نادر ہی کبھی سوشلزم پر، مادہ پرستی پر، مغربی تہذیب پر یا موجودہ دَور کے نفسیاتی و جنسی تقاضوں پر اسلام کی روشنی میں کبھی کوئی سیر حاصل تقریر یا بحث کی ہو جس سے موجودہ دَور کے جوان تعلیم یافتہ ذہن کو مطمئن کرنے اور اس کا اسلام سے ضروری لگاؤ کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ ایسی تقاریر و خطبات ممکن بھی کیسے ہو سکتے ہیں۔ جب تک کہ ہمارے علمائے دین کو ان کے تمام امور پر خاطر خواہ حد تک دسترس حاصل نہ ہو اور وہ اس جوان فکر کے ذہن میں جو اس بارے میں متعدد سوالات اٹھتے ہیں، ان کا تسلی بخش جواب اسلام کے حوالے سے نہ دیں۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے علمائے دین جن مسئلوں پر بحث کرتے ہیں۔ وہ سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن میں یہاں نہایت ادب و احترام سے یہ پوچھنے کی جسارت کرتا ہوں کہ مجھے بتایا جائے کہ ہمارے لئے دین کی رو سے کون سا مسئلہ اہم ترین ہے۔ محفل میلاد کا منعقد کرنا یا نہ کرنا حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بندائی درود و سلام بھیجنا یا نہ بھیجنا۔ انبیاء علیہ السلام کا اپنی قبور میں زندہ ہونا یا نہ ہونا۔ جناب رسالتِ مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا نور ہونا یا بشر ہونا۔ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا کلی طور پر علم تھا یا نہیں، نماز ہاتھ باندھ کر یا چھوڑ کر پڑھنا، شلوار ٹخنوں سے اونچی باندھنا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اہل بیت کے روحانی درجہ کا مقابلہ کرنا، احادیث مبارکہ کے ضعیف یا مستند ہونے کی بحث کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ مسائل وہ ہیں جن پر ہم بحیثیت مسلمان آپس میں شدت سے الجھتے ہیں اور تفرقہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کفار اسلام کو باطل قرار دیتے ہیں اور خدائے عز و جل کے وجود سے سرے ہی سے انکاری ہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) اپنی تقریروں اور پراپیگنڈے میں دھوکہ باز اور دیوانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن پاک کو جھوٹی کتاب گردانتے ہیں اور اسلام پر شہوت پرستوں اور

عیاشوں کا دین ہونے کا گھناؤنا الزام عائد کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارے مسلمانوں کو عموماً اور جوان تعلیم یافتہ مغربی تہذیب کے دلدادہ ذہن کو تعصب سے پراگندہ کر کے اسلام سے بیزاری پیدا کر رہے ہیں۔ وہ اپنی ان مذموم کوششوں میں کافی حد تک کامیاب ہیں۔ کیونکہ بے دینی کے رجحان کو اندرونِ ملک پھیلانے کے لئے جو بیرونی عناصر شامل ہیں، ہم ان کا خاطر خواہ محاسبہ کرنے سے یا تو غافل ہیں اور یا پھر اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے۔ ان کا محاسبہ کرنے سے قاصر و لاچار۔ اور یہ سنگین صورت حال ہم سب مسلمانوں کے لئے بحیثیت امتِ مسلمہ ایک کھلا چیلنج ہے اور ایک لمحۂ فکریہ۔

البتہ ان دشمنانِ اسلام کی بین الاقوامی یلغار کے خلاف ہماری دینی بہن مریم جمیلہ نے جو صحیح اسلامی جذبہ کے تحت مساعی کی ہیں اور جس طرح یکے بعد دیگرے انگریزی زبان میں کتابیں لکھ کر اس نیک سیرت خاتون نے موجودہ مغربی نظریات کی نہایت مدلل انداز میں ایک ایک کر کے نفی کی ہے اور اسلام کی ان نظریات پہ بالادستی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نہایت اطمینان بخش ہے۔ مریم جمیلہ پیدائش سے امریکن یہودی ہیں۔ جنہوں نے مغربی تہذیب کے ترقی یافتہ امریکی ماحول میں آنکھ کھولی۔ اپنے گرد اگرد ماحول کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور جس وقت مغربی تہذیب و تمدن اور اس کی موجودہ اقدار سے بیزاری انتہا کو پہنچی اور دنیا کے تمام موجودہ مسائل کا حل صرف اسلام ہی میں نظر آیا تو اپنا ملک، ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب، مغربی تہذیب و تمدن کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ کر پاکستان میں رہائش پذیر ہوئیں اور پچھلے دس بارہ برس سے اپنے پیارے دین کی خدمت میں اپنی صلاحیت کے مطابق خدمت میں ہمہ تن مشغول ہیں اور ان کی تمام کتب جوان تعلیم یافتہ ذہن جو مغربی نظریات سے کسی نہ کسی انداز میں وابستگی محسوس کرتا ہے کے لئے دعوتِ فکر کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن دین کی اس انداز میں خدمت کا فریضہ صرف بہن مریم جمیلہ کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے۔ ہمارے علمائے دین میں بھی بہت سے پڑھے لکھے اور اس انداز میں تعلیم یافتہ ہیں کہ وہ بھی مادہ

پرستی کے مغربی نظریات کو باطل ثابت کر کے جوان ذہن کو مطمئن کر سکتے ہیں اور ان کی اسلام کے لئے مناسب رغبت پیدا کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے ذہن و خطاب کی سمت کو بدلیں اور اس طرف متوجہ ہوں۔ ان کے علاوہ ہمارے اونچے طبقہ کے وہ دانشور ہیں، یونیورسٹی اساتذہ ہیں، وکلاء اور جج ہیں، ڈاکٹر اور انجینئر ہیں، اعلیٰ سرکاری افسران ہیں جو مسلمان ہیں۔ جو چوری چھپے نماز تو پڑھ لیتے ہیں۔ لیکن کھلے بندوں اسلام کی حمایت کرنے سے کچھ کچھ گریز کرتے ہیں۔ اگر یہ سب صاحبان اپنے دین کی پکار کو سنیں اور پہچانیں اور کھلے بندوں اسلام کا دم بھرنا شروع کر دیں اور اپنے بچوں کو اسلام پر چلنے کی تلقین کریں تو جوان تعلیم یافتہ ذہن جو ان کی تقلید کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے۔ ان کی قیادت کا نہایت صحت مندانہ اثر لے اور بہت جلد مثبت انداز میں اسلام کو اپنا لے۔ اس ضمن میں حال ہی میں وکلاء کی کل پاکستان کانفرنس کے موقع پر چیف جسٹس آف پاکستان جناب حمود الرحمٰن صاحب نے، جناب سردار محمد اقبال صاحب چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ نے اور جناب اے کے بروہی صاحب نے جس انداز میں اسلام کی پاکستان میں حمایت و تائید کی ہے وہ واقعی حوصلہ افزا ہے اور انشاء اللہ ایسی مساعی جمیلہ کا خاطر خواہ نتیجہ ضرور نکلے گا۔

مادہ پرستی لالچ و خود غرضی پیدا کرتی ہے

مادہ پرستی دین سے دوری کا باعث بنتی ہے۔ یہ انسان میں عموماً لالچ و خود غرضی ہی پیدا کرتی ہے۔ دنیاوی اغراض و مقاصد کا حصول جس وقت منتہائے نظر بن جاتا ہے اور باقی سب تقاضے اور قدریں ثانوی درجہ اختیار کر لیتی ہیں تو انسان جھوٹ اور فریب دہی سے قطعاً گریز نہیں کرتا۔ جھوٹ اور فریب نے ہمارے معاشرہ کو اس وقت بری طرح گھیر رکھا ہے۔ وہ گھرانے واقعی بہت خوش قسمت ہیں جو اس کی لعنت سے بچے ہوئے ہیں ہمارا دین جھوٹ بولنے سے ہمیں سختی سے منع کرتا ہے۔ سورہ صف کے آغاز میں ارشادِ ربانی ہے کہ "اے لوگو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ خدا کے نزدیک یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرتے نہیں ہو۔" پھر ہم بحیثیت مسلمان کیوں جھوٹ بولتے ہیں۔

اس بات کا اگر ہم انسانی نفسیات کی مدد سے جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان جھوٹ صرف اس وقت بولنے کا فیصلہ کرتا ہے. جس وقت یہ محسوس کرے کہ اگر وہ جھوٹ بول کر دوسرے متعلقہ شخص کو دھوکہ نہیں دے گا، اس کا وہ مقصد یا فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا. جو وہ اندریں حالات حاصل کرنا چاہتا ہے. اس جھوٹ بولنے والے شخص کی ذہنی کیفیت کا اس وقت یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے یہ اعتماد نہیں ہوتا کہ اگر اس نے سچ بولا تو اس کو کوئی نقصان نہیں ہوگا یا وہ اپنا مقصد حاصل کرلے گا. اسے اپنے اس متعلقہ شخص سے اپنے باہمی تعلقات اور رشتہ پر اتنا بھروسہ نہیں ہوتا کہ اگر وہ ان تعلقات کا سہارا لے کر سچ بولے تو اس کا مقصد پورا ہو جائے گا. چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آجکل مادہ پرستی کے زیر اثر تقریباً ہر گھر اس کی زد میں ہے. باپ بیٹا، بہن بھائی تک سب ضرورت پڑنے پر آپس میں جھوٹ بول جاتے ہیں. ایک دوسرے کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں.

جھوٹ بولنا اور جیب کاٹنا برابر ہیں

معاشرہ نے اس جھوٹ و فریب کو اپنی ایک ضروری قدر کے طور پر اپنایا ہے اور اس کو یہ مقبولیت زیادہ اس وجہ سے بھی ہوئی ہے کہ اس کو سیاست یعنی "پولیٹیکل سائنس" یہ ایک اہم اور باوقار مقام مغربی تہذیب نے عطا کیا ہے. بعض لوگ تو اسے اب انسان کی ایک خوبی کے طور پر شمار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک ایک شخص کی ذہانت، ہوشیاری اور چالاکی کی سند سمجھی جاتی ہے. حد یہ ہے کہ جس شخص سے جھوٹ بولا جا رہا ہو. بظاہر تو وہ ہنستا بھی ہے. ہاں میں ہاں بھی ملاتا جاتا ہے. لیکن جھوٹ بولنے والے سے ڈرتا بھی ہے. اس کی بات کو ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہوتا. لیکن وہ اپنے دھوکہ باز کو دھوکہ دینے کی کوشش میں ہوتا ہے. حالانکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایک جیب تراش کے فعل میں اور جھوٹ بولنے والے شخص کے طریق کار میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا. جیب تراش اپنے شکار کو ذہنی طور پر غافل کر کے اور اس کی نظروں سے بچ کر اس کی جیب کاٹتا ہے اور اس کی نقدی وغیرہ کا

ناجائز طور پر مالک بن جاتا ہے۔ اب جو شخص جھوٹ بولتا ہے۔ وہ بھی اپنے مخالف کو ذہنی طور پر غافل کرتا ہے اور اس طرح وہ اس سے وہ فائدہ ناجائز طور پر حاصل کرنا چاہتا ہے جسکا وہ خواہشمند ہوتا ہے۔ یہ فائدہ مالی بھی ہو سکتا ہے اور دوسری قسم کا بھی۔ لیکن جیب تراش کے خلاف تو ہم سب متفقہ طور پر صف آرا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جھوٹ بولنے والے شخص کو ہم بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چاہے جیب تراش کو جیب کاٹنے کے عمل سے چند روپوں کے سوا زیادہ حاصل نہ ہوا ہو اور جھوٹ بولنے والا شخص دوسرے شخص یعنی اپنے شکار کو ہزاروں بلکہ لاکھوں کا دھوکہ دے کر ان کا خود مالک بن بیٹھا ہو۔ جھوٹ بولنے والے کا محاسبہ شاید اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کیونکہ جن لوگوں کو جھوٹ مکر و فریب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ سبھی ایک ہی گاڑی کے مسافر ہوتے ہیں اور ان کی منزل مقصود بھی ایک ہی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اگر ایک جیب تراش دوسرے جیب تراش کی جیب کاٹے تو ہو سکتا ہے کہ اسکا بھی محاسبہ نہ ہو راقم کا اس موازنہ کرنے کا مقصد کسی انداز یا طریق میں جیب تراش کی حمایت نہیں بلکہ وہ جھوٹ اور فریب کی لعنت کو اس انداز میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ جو صاحب فکر ہیں تاکہ وہ پوری طرح جھوٹ فریب کے خطرات سے آگاہ ہوں۔

(۴) جھوٹ و فریب ہمارے لئے دینی لحاظ سے ایک بنیادی مسئلہ ہے کیونکہ یہ ایک ایسا گناہ ہے جس کو اگر مسلمان اپنا لیں تو وہ اپنے اندر حقیقی بھائی چارے اور اتحاد کی اس کیفیت سے محروم ہو جائیں گے جس کی اللہ پاک کی جانب سے انہیں ہدایت کی گئی ہے اور جو ان کے دین کے فروغ اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔ ویسے بھی جو لوگ تہذیب یافتہ ہونے کے دعویدار ہوں۔ ان کے شایان شان نہیں کہ وہ جھوٹ فریب کو کسی انداز میں اپنائیں۔ کیونکہ تہذیب کا اولین تقاضا یہ ہے کہ ایک تہذیب یافتہ دوسرے شخص کو جھوٹ بول کر دھوکہ دینے کی ہرگز کوشش نہ کرے اور اسطرح کسی کو ذہنی طور پر غافل یا معطل کر کے اس سے ناجائز فائدہ حاصل

نہ کرے۔ مگر ہم سب کا اس نام نہاد مہذب اور ترقی پذیر معاشرہ کے متعلق یہی مشاہدہ ہے کہ لوگ کسطرح آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ دے کر ان کے مال و دولت، ان کی زمینوں اور کاروبار وغیرہ پہ ناجائز طور پر قابض ہو جاتے ہیں اور حقدار کے حقوق کس بے دردی سے سلب کرتے ہیں۔

تہذیب کے نام پر بدنما داغ

کیا انسان کو محض اس وجہ سے مہذب ترقی پذیر اور جدید مان لیا جائے کیونکہ اس نے ان سب باتوں کا بڑے زور شور سے دعویٰ کیا ہے چاہے اُسکا ذاتی فعل ہر قدم پر اُسکی مذمت و ملامت کر رہا ہو اور اس کے دعویٰ کی نفی کر رہا ہو۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ ذاتی تعریف و تحسین قابلِ اعتبار سند نہیں سمجھی جا سکتی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ دَور کا انسان کچھ اسی قسم ہی کی خود فریبی میں مبتلا ہے۔ مہذب ہونے۔ ترقی پذیر ہونے تعلیم یافتہ ہونے اور جدید ہونے کا تقاضا ان سب کی شرط تو یہ ہونی چاہیئے تھی کہ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال مکمل طور پر ختم ہو۔ امن و امان اور انصاف کا دور دورہ ہو۔ انسانی اور اخلاقی قدریں ہرگز پامال نہ ہوں، ہر شخص کا جان و مال محفوظ ہو۔ لیکن جہاں حالات اس کے بالکل برعکس ہوں۔ انسان اپنی خواہشات اور نفس کا پجاری بن جائے اور دوسرے انسان کی عزت و آبرو۔ مال و دولت پر زبردستی قبضہ کرنا معیوب نہ سمجھتا ہو تو کیا یہ سب کچھ انسانی تہذیب، انسانی تعلیم و ترقی کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ نہیں۔ انسانی تہذیب و ترقی کی اس سے زیادہ اور کیا بھیانک تصویر کھینچ سکتی ہے کہ موجودہ دَور کا انسان اب ایک دوسرے کو ذرّہ بھر بھی برداشت کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ سالہا سال سے جنگوں کے ذریعے ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے کوشاں ہے۔ اس لئے اب ایک دوسرے کو تباہ و برباد کرنے کے لئے ایٹمی ساز و سامان تیار کر لیا ہے۔ ویت نام۔ کمبوڈیا۔ قبرص۔ اری ٹیریا۔ بنگلہ دیش اور مشرقِ وسطےٰ میں اس وقت تک لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتارے جا

چکے ہیں۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں، نادار سبھی شامل ہیں۔ باقی کروڑوں جو بچ گئے ہیں موت ان کو للکار رہی ہے۔ وہ ننگے ہیں، بھوکے ہیں، پیاسے ہیں، بیمار ہیں اور بے گھر ہیں۔ قرآئن یہ ہیں کہ باقی دنیا میں بھی امن کی کوئی تسلی بخش ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اقتصادی مسائل اور تیل کا بحران شدت سے سامنے آرہے ہیں۔ طاقتور کمزور کو نیچا دکھانے کی کوشش میں ہر حربہ استعمال کر رہا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کی بے پناہ قوت بتائی جا رہی ہے اور حریفوں کو مرعوب کرنے کے لیے ان کی تعداد گنوائی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ ہمیں موجودہ جدید دور میں ہماری نام نہاد سائنسی ترقی، مغربی تہذیب و تعلیم سے ملا ہے۔ کاش اگر آج شہرۂ آفاق مغربی فلاسفر دانشور اور سائنسدان زندہ ہوتے تو میں ان سے یہ پوچھنے کی جسارت ضرور کرتا کہ کیا واقعی آپ اس موجودہ دور کی تہذیب و ترقی سے مطمئن اور خوش ہیں۔ کیا آپ حضرات کے افکار و نظریات اس سے بہتر معاشرہ تشکیل نہ دے سکتے تھے۔ آپ نے سائنس کی موجودہ نام نہاد ترقی کے خلاف کیونکر آواز نہ اٹھائی کیا آپ یہ احساس بھی نہ کر سکتے تھے کہ یہ سائنس کے پیدا شدہ ایٹم بم انسانیت کو مکمل تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کریں گے۔ آپ کے افکار نے لوگوں کو آپس میں اتحاد و یگانگت کا سبق نہ دیا۔ آپ نے لوگوں میں جھوٹ و فریب اور لالچ اور خود غرضی کو کیوں اجاگر کر کے دنیا کی شکل و صورت بگاڑ کے رکھ دی۔ راقم کے نزدیک اس صورت حال کا ناقص تجزیہ یہی ہے کہ موجودہ دور کے انسان کا محض یہ دعوے کر دینے سے بات نہیں بنے گی کہ وہ تعلیم یافتہ ہے، مہذب ہے، ترقی پذیر ہے اور جدید ہے۔ چاہے وہ دن رات چلا چلا کر یہ کہتا رہے، حتیٰ کہ اسکا حلق خشک ہو جائے اور اس کی آواز بھی بے شک نہ نکل سکے۔ اس دعوے کے سچا ہونے کی تو لازمی شرط بہر حال یہی رہے گی کہ اس کے افعال اُس کے دعوے کی ہر سطح پر مکمل تصدیق کریں۔ البتہ اگر آنے والی نسلیں یہ کہہ دیں گی کہ ہمارے موجودہ دور کا انسان واقعی تعلیم یافتہ، مہذب اور ترقی پذیر تھا تو وہ سرٹیفکیٹ جو موجودہ دور کا انسان اپنے تئیں حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ اسے مل جائیگا، ورنہ نہیں۔

دلوں میں بیماری ہے

سورہ بقرہ کے شروع میں بھی اللہ پاک فرماتا ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے۔ پس اللہ نے ان کی بیماری بڑھائی اور واسطے ان کے عذاب ہے۔ درد دینے والا۔ کیونکہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔ اس سے پہلے بھی جھوٹ کے ضمن میں ایک آیت مبارکہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر واضح کر دیا ہے کہ جھوٹ بولنا اسے سخت ناپسند ہے اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے اس نے جھوٹے لوگوں کے لئے درد دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہم پوری طرح غور و فکر کریں کہ مسلمان ہوتے ہوئے۔ ہمارے لئے کتنی گنجائش ہے کہ ہم آئندہ آپس میں جھوٹ بول سکیں اور اگر ہم اپنی موجودہ مکر و فریب کی روش پر قائم رہے تو کیا اللہ اور قرآن پر جو ہمارا ایمان ہے، کوئی آنچ آئے گی یا نہیں۔ میری دانست میں اگر واقعی ہم تعلیم یافتہ ہیں تو پھر ہماری تعلیم کو ہماری مدد اور راہنمائی کرنی چاہیئے تاکہ ہمارے قول و فعل کا یہ تضاد ختم ہو جائے کیونکہ قول سے تو ہم مسلمان ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں اور عملاً ایک دوسرے سے جھوٹ بولنے سے گریز بھی نہیں کرتے۔ نہایت معذرت کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ جو تعلیم انسان کو اندھیرے میں رکھے۔ اس کی مناسب راہنمائی نہ کر سکے اور اس کے قول و فعل کے تضاد کو ختم نہ کر سکے۔ وہ تعلیم نہیں بلکہ سراسر گمراہی ہے اور ایسا شخص جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔ علمائے دین سے لہٰذا مودبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنے موجودہ اسلامی معاشرہ کا مناسب جائزہ لیں اور اپنی مجالس میں مسلمانوں کو انبیاء علیہ السلام اور اپنے بزرگانِ دین کے حالات سنانے کے ساتھ ساتھ ان کے اعمال کو درست کر کے دین کی نہج پر ڈھالنے کی ضرورت و اہمیت کو پوری شدت سے محسوس کریں اور مسلمانوں کو بھی اپنے تئیں یہ ذمہ داری فرداً فرداً قبول کرنی چاہیئے کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرتے وقت سچ بولنے کی ترغیب دیں گے اور اپنے فعل سے اس کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ کیونکہ مسلمان اگر آج آپس میں جنسی و مادی تقاضوں کا اثر قبول نہ کرتے

ہوئے ایک دوسرے سے سچ بولنا شروع کر دیں. ایک دوسرے کو تحمل و بردباری سے برداشت کریں اور آپس میں دینی اخوت و محبت پیدا کریں تو ہمارے بیشتر دنیاوی اور دینی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے. ہم حقیقی معنوں میں مہذب بھی بن جائیں گے اور تعلیم یافتہ بھی. اور اس طرح ترقی کی راہ پر پورے عزم و ولولے سے گامزن ہو جائیں گے.

مہلک نظریاتی ہتھیاروں سے دین پر حملہ

ہمیں کسی خوش فہمی یا تعصب کا شکار ہوئے بغیر یہ بات پوری شدت اور شعور کے ساتھ محسوس کر لینی چاہیئے کہ دشمنانِ اسلام چاروں طرف سے ہمارے پیارے دین کی اساس پر اپنے نہایت مہلک نظریاتی ہتھیاروں سے حملہ آور ہیں. ایک طرف سے یہودیت کی یلغار ہے تو دوسری طرف عیسائیت کی. تیسری طرف سے جدید دَور کی سائنسی تعلیم و ترقی کی اور چوتھی طرف سے مادہ پرست سوشلزم کی اور ان سب کے برعکس اللہ پاک جل شانہ کی ذات ہے جس نے قرآن پاک میں عہد و اعلان کیا ہوا ہے کہ وہ اپنے دین کی خود حفاظت کرے گی اور اسے تمام دنیاوی ادیان پر غالب کرے گی. یہودی تو اپنی یلغار کی داستان مشرق وسطیٰ میں مسلمانوں سے میدانِ جنگ میں لکھ رہے ہیں. حالات بتا رہے ہیں کہ موجودہ دَور کی عیسائیت مذہبی لحاظ سے سطحی جنسی و مادی خواہشات کے آگے ہتھیار ڈال کر مغرب میں اب دم توڑ چکی ہے. البتہ مشرق کے غریب ممالک میں اس کی مشنریز (MISSIONARIES) بھوکے ننگے ان پڑھ عوام کو بہکا کر زن اور زر کا لالچ دے کر عیسائی بنانے میں مشغول ہیں. لیکن یہاں بھی انہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی کیونکہ جس مذہبی کام کی بنیاد دوسرے شخص کی لاعلمی اور اقتصادی بدحالی کی وجہ سے اسے لالچ دے کر اسکا استحصال ہو. وہ کیسے کامیاب ہو سکتا ہے. مادہ پرست مغرب میں عیسائیت کی زبوں حالی کا یہ عالم ہے کہ ویسے تو عیسائی مرد ایک وقت میں ایک سے زیادہ شادیاں نہیں کر سکتا. لیکن حقیقتاً جس وقت وہ بڑھاپے میں داخل ہوتا ہے. تو

اسوقت تک وہ عموماً بیسیوں شادیاں کرچکا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ سینکڑوں ہزاروں
عورتیں اس کی جنسی ہوس کا شکار ہوچکی ہوتی ہیں. اس حرام کاری کو قطعاً برا نہیں
سمجھا جاتا. بلکہ یہ ان کی تہذیب اور تعلیم یافتہ ہونے کی سند قرار پاتی ہے. حرام بچوں کی
پیدائش کی تعداد اور حمل ضائع کرانے کی تعداد بھیانک حد تک بڑھ چکی ہے. ماں باپ
اپنے بچوں کو حرام کاری سے روکنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں کرتے. بلکہ بعض اوقات
ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی ہے. چونکہ اس صورت حال نے لوگوں کو بری طرح آتشک اور
سوزاک کے موذی متعدد امراض کا شکار بنانا شروع کر دیا ہے. اس لئے مغربی تہذیب
اپنے بچوں کو اب یہ تعلیم دینے کے لئے کوشاں ہے کہ وہ کس طرح ان بیماریوں میں لاحق ہونے
سے بچ سکیں. جنسی تعلقات اور بچے کی پیدائش پر متعدد فلمیں بنائی جارہی ہیں. وہاں خاندان
اور کنبے کی قدریں پامال ہوگئی ہیں. والدین بوڑھے ہوکر کتے کی موت تو مر سکتے ہیں. لیکن اپنے
بال بچوں کی ضروری توجہ حاصل کرنے سے اکثر محروم رہتے ہیں اور اس بگڑی ہوئی صورتِ
حال کا بظاہر ذمہ دار نفسیاتی ماہر سگمنڈ فرائڈ (SIGMUND FREUD) ہے.
جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان پر سب سے زیادہ غلبہ جنسی خواہش کا ہے. جو اس پر بچپن
سے بڑھاپے تک غالب رہتا ہے اور اسکا بے لگام و بے حدود تسکین پانا ایک قدرتی فعل
کے مترادف ہے. سگمنڈ فرائڈ کو پڑھنے سے بعض دفعہ یہ احساس آئے بغیر نہیں رہتا کہ شاید
یہ فلاسفر جنسی خواہشات کا سب سے بڑا مریض خود ہی تھا. موجودہ دور کے مغربی عیسائیوں
میں شہوت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہاں اب کھلے بندوں پبلک پارکوں
میں جنسی تعلقات کا کاروبار ہوتا ہے. لیکن انہیں کوئی حیا و شرم نہیں آتی کہ ان کے ادیب
و صحافی اپنی تحریروں میں اسلام پر شہوت پرستی کا الزام لگاتے ہیں اور اس مذموم مہم
اپنی مختلف انجمنوں سے انعامات پاتے ہیں.

ہم مسلمان بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں اور انہیں اپنا ایک

جلیل القدر نبی مانتے ہیں۔ راقم اگر ان کے دورِ نبوت میں پیدا ہوا ہوتا تو ضرور عیسائی ہوتا
اس وقت سچے مسلمان بھی عیسائی ہی تھے۔ سچے عیسائی صرف وہ تھے جو حضرت علیہ السلام
کو نبی یا رسول مانتے تھے۔ لیکن خدا کا بیٹا نہ مانتے تھے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ فرماتا
ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنم دیا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ چونکہ حضرت مریم علیہ السلام کے
ہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ اس لئے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ
السلام کی بزرگی اور معجزوں سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ
السلام کو خداوند تعالےٰ کا بیٹا سمجھنے لگے۔ یہ عیسائی حضرت آدم علیہ السلام کے بارے
میں کیا سمجھیں گے۔ کیونکہ وہ نہ صرف بغیر باپ کے پیدا ہوئے بلکہ بغیر ماں کے بھی۔

سائنس کا انحصار عقل پر

جدید سائنسی ترقی اور تعلیم نے موجودہ دور کے
انسان کو اپنی عقل اور دنیاوی تجربے پر اعتماد
و ناز کرنا سکھایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل کا اپنا ایک مقام ہے اور اپنی افادیت
ہے۔ دنیاوی معاملات میں یہ انسان کی بہت خدمت کرتی ہے اور اس کی رہنمائی کرتی ہے۔
لیکن اس سے یہ اخذ کر لینا کہ انسانی عقل لامحدود ہے اور کائنات کی ہر شئے کا بخوبی احاطہ و
ادراک کر سکتی ہے۔ یہ حماقت سے کچھ کم نہیں۔ چونکہ انسان خود بھی طرح محدود ہے اسی
طرح اسکی عقل بھی۔ انسان کی سوچ اپنے ماحول اور گرد و نواح سے متاثر ہوتی ہے۔ ماحول لحظہ
بہ لحظہ بدلتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سوچ کا انداز اور سمت بھی۔ انسان آنکھ سے
جو بدلتے مناظر دیکھتا ہے۔ اور کان جو بدلتی آوازیں سنتے ہیں۔ ان کے مطابق انسان کے
بدلتے خیالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ پہلے خیالات کی جگہ دوسرے خیالات لیتے ہیں اور
ان کے مطابق نہ وہ سوچ سکتا ہے اور نہ سوچ کا عمل ایک ہی انداز میں جاری رکھ سکتا
ہے۔ وہ اس عمل کو نہ تو زیادہ تیز کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے ساکت کر سکتا
ہے۔ انسان کی سوچ ناقص ہے اور قدم قدم پر غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ انسان کی سوچ کی

بساط کا اندازہ اس مثال سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ترقی یافتہ امریکہ جیسے ملک میں جہاں سائنس نے ترقی اس حد تک کی ہے کہ وہاں تو اب سوچ کا اندازہ بھی سائنٹیفک ہو گیا ہے اس سائنٹیفک سوچ نے آج سے کچھ برس پہلے قومی سطح پر یہ فیصلہ کیا کہ امریکہ کی فوجوں کو ویت نام کی جنگ میں براہِ راست شمولیت کرنی چاہیئے۔ لیکن تاریخ نے یہ فیصلہ لکھا ہے کہ کروڑوں ذی شعور افراد کی یہ سائنٹیفک سوچ غلط ثابت ہوئی اور امریکی افواج کو کئی برس برسرِ پیکار رہنے کے بعد ویت نام سے بڑی ہزیمت سے واپس امریکہ لوٹنا پڑا ہے جس سائنٹیفک سوچ کا یہ حشر ہو تو کیا اسے سائنٹیفک کہنا سائنس کے خوبصورت نام پر ایک بدنما دھبہ کے مترادف نہیں ہے۔ کیونکہ سائنس کو آجکل جن معنوں میں استعمال کیا جا رہا ہے اور اس سے جو تاثر عوام کے ذہنوں میں پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ تو یہی ہے کہ سائنس کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ وہ تو صرف حقائق ہی کو پہچانتی ہے اور صرف انہیں ہی تسلیم کرتی ہے۔ لہٰذا اگر ایٹم بم بنانے والے ملک یہ کہہ دیں کہ ا (نعوذ باللہ) وجود نہیں تو یہ حقیقت بن گئی اور درست ثابت ہو گیا اور اگر چاند پر اترنے والے ملک کے لوگ یہ کہہ دیں کہ دین کی کوئی حقیقت نہیں اور اس کو ماننے والا جاہل ہے اور دقیانوسی تو یہ بھی حقیقت اور ٹھیک۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے اور سمجھا جائے تو سائنس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ زیادہ نہیں کہ یہ اس مطالعہ اور مشاہدہ کا نام ہے۔ جو انسان متواتر قدرت کے اصولوں کا اپنی سوچ اور دانست کے ذریعے کرتا ہے اور اس سے سائنس کے نام پر نتائج اخذ کرتا ہے اور یہ نتائج اپنے اپنے حالات میں عموماً حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ سائنسی مطالعہ نے ہمیں بتایا ہے کہ اگر آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسوں کو ایک مقررہ مقدار میں آپس میں ملایا جائے تو پانی بن جاتا ہے۔ انسان جس وقت سائنس کا یہ کرشمہ دیکھتا ہے تو عش عش کر اٹھتا ہے۔ وہ یہ حقیقت اخذ کرنے سے اکثر اوقات قاصر رہتا ہے کہ آکسیجن و ہائیڈروجن کی آمیزش سے سائنسدان نے پانی نہیں بنایا بلکہ مطالعہ و مشاہدہ سے یہ اخذ کیا ہے کہ یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب بھی اور جو بھی

مقررہ مقدار میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کو آپس میں ملائے گا تو قانونِ قدرت ان گیسوں کو پانی میں تبدیل کر دے گا۔ آکسیجن بھی قدرت کی پیدا کی ہوئی ہے اور ہائیڈروجن بھی اور ان سے پانی کا تیار کرنا بھی قدرت کا کام ہے اور سائنسدان تو قدرت میں موجود اشیاء۔ ان کے خواص اور ان کے متعلقہ قانونِ قدرت کا محتاج ہے اور تابع ہے۔ اس پر قانونِ قدرت کی پابندی لازم ہے۔ وہ جب بھی مخصوص انداز میں آکسیجن اور ہائیڈروجن کو آپس میں ملائے گا۔ تو قانونِ قدرت کے تحت ہمیشہ صرف پانی ہی بنے گا۔ دودھ یا اور کوئی مائع نہیں بنے گا۔ چاہے سائنسدان اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا لے۔

سائنس خدا کے وجود کی نفی نہیں کرتی

اندریں حالات یہ سمجھ آتی ہے کہ سائنس انسانی مطالعہ کا نام ہے جو انسان قدرت میں موجود اشیاء اور ان کے متعلقہ قوانینِ قدرت کو سمجھنے کے لئے کرتا ہے۔ اور انہیں اپنے فہم کی بساط کے مطابق اخذ کر کے اپنی زندگی میں ان سے استفادہ کرتا ہے۔ لہٰذا سائنس انسانی فکر و ذہن کی پیداوار ہے اور یہ انسانی فکر و ذہن سے نہ زیادہ اہم ہے اور نہ زیادہ درجہ رکھتی ہے۔ بلکہ یہ اس کی تابع ہے۔ اس لئے جو لوگ سائنس اور اس کی ظاہرہ ترقی کے سہارے دین کی نفی کرتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنی نفسیاتی مرض کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے۔ سائنسدان اگر بے دین ہیں تو دیندار بھی ہیں۔ چاہے وہ مسلمان ہوں، عیسائی ہوں، یہودی ہوں، ہندو ہوں۔ بہر حال سب اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا کو مانتے ہیں۔ پھر سائنس نے آجتک یہ کبھی اپنی تحقیق سے ثابت نہیں کیا کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ سائنس کے آلات کے ذریعے خدا کے وجود کو ثابت کرنا یا یہ ثابت کرنا کہ وہ موجود نہیں۔ ایک دُور کی بات ہے۔ سائنس تو انسان میں موجود اس کے خیالات اور اس کے جذبات محبت خوف ڈر، غصہ و غمی کو اپنے سائنسی آلات کے ذریعہ نہ دیکھ سکتی ہے، نہ چھو سکتی ہے، نہ تول سکتی ہے، نہ ماپ سکتی ہے۔ تو کیا ہم اس سے یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ انسانی خیالات کا، جذبات و احساسات کا

سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ مزید سائنسدان تو کسی بھی حقیقت کو اسوقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک اس حقیقت کا ثبوت ان کو اپنی لیبارٹری اور مشاہدہ کے ذریعہ مہیا نہ ہو اور اگر اس کسوٹی پر خدا کے وجود کے مطالعہ کو پرکھا جائے تو جو سائنس دان یہ کہتے ہیں کہ سائنس کی رُو سے خدا کا وجود ثابت نہیں ہے تو وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سائنس نے خدا کے وجود کے نہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ اس شرح سے وہ زیادہ سے زیادہ یہی دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انسانی سائنس خدا کے وجود کا مسئلہ ثابت کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔

سائنس بے بسی کے چوراہے پر

کیا سائنسدان گھاس سے خون بنا سکتے ہیں اور کیا وہ خون سے آنکھ، ناک، کان، سر کے بال یا دودھ وغیرہ تیار کر سکتے ہیں اگر نہیں کر سکتے تو پھر سائنس پر اس قدر اترانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر گھاس سے خون بنتا ہوا دیکھنا ہو تو اس کو اس فیکٹری میں ڈالو جسے گائے، بھیڑ، بکری یا گھوڑی کہتے ہیں۔ وہ گھاس کھائے گی اور اس کے جسم کے اندر گھاس سے خود بخود خون بنے گا اور اگر خون سے آنکھ، ناک، کان، دانت وغیرہ بنتے دیکھنا ہو تو یہ سب عمل قانونِ قدرت کے تحت ماں کے پیٹ میں حمل کے بعد ظہور پذیر ہوتے دیکھنا چاہیئے۔

سائنسدان کی تحقیق کا سب سے زیادہ اور مسلسل مرکز خود انسانی جسم اس کی ساخت اور مختلف اعضاء کے خواص وعمل رہا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے اگر یہ اخذ کیا جائے کہ سائنسدان نے سب سے زیادہ کوشش انسانی جسم کے عمل کو سمجھنے میں صرف کی ہے تو وہ غلط نہ ہو گا اور یہ بات اس لئے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کے لئے سب سے زیادہ وقعت و اہمیت اس کی اپنی زندگی ہے اور سائنسدان ہر ممکن کوشش میں مصروف ہے کہ موت کا عمل ٹل سکے۔

اس میں شک نہیں کہ سائنسدان نے اپنی لیبارٹری کے آلات کی مدد سے یہاں تک تو دریافت کر لیا ہے کہ انسانی جسم کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ سل (CELL) ہے۔ جو حجم میں ذرہ کی مانند ہے اور ہر سل (CELL) میں بائی پولر الیکٹرک میکنزم

(BIPOLAR ELECTRIC MECHANISM) کے ذریعہ حرارت عزیزی (COMBUSTION) کا عمل جاری ہے۔ اس نے یہ بھی دریافت کر لیا ہے کہ ہر سل (CELL) پر ایک باریک پردہ (FILM) چڑھا ہوا ہے۔ جس کی موٹائی ایک سینٹی میٹر کا کئی لاکھواں حصہ ہے اور یہ کہ جتنی باریک یہ فلم ہوتی ہے۔ اتنی ہی زیادہ اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اس برقی طاقت کو جو بائی پولر میکنزم کے ذریعہ سل (CELL) میں پیدا ہو۔ اس کو اپنے اندر جمع یا جذب کر سکے۔ اب سائنس کی ان دریافت و معلومات پر اگر کوئی شخص جتنا چاہے فخر یا غرور کرے۔ لیکن حقیقت پھر بھی یہی رہے گی کہ سائنس زندگی کو پیدا نہیں کر سکتی اور نہ ہی زندگی کے اسرار کو سمجھ کر ان کا احاطہ کر سکتی ہے۔ زندگی کا عمل، بچہ کی نشوونما، جوانی اور بڑھاپے کا عمل ابھی سائنس کے لئے یہ سب معمہ ہی ہے۔

سائنس نے خوردبین کی مدد سے ہمیں بتایا ہے کہ سائنس پر اترانے والا یہ انسان صرف ایک کرم سے پیدا ہوتا ہے جو اپنی جسامت میں ایک چیونٹی سے ہزاروں گنا چھوٹا ہوتا ہے لیکن سائنس ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ اس کرم کی کوئی آنکھیں، ناک، کان، دل، پھیپھڑے اور جگر وغیرہ بھی ہوتا ہے، یا کہ نہیں اور پھر یہ سائنس ہمیں یہ بھی نہیں بتلاتی کہ اس کرم میں کون کون سی صلاحیتیں کس کس جگہ پر اس میں موجود ہوتی ہیں کہ جن کی وجہ سے انسانی جسم کے تمام اعضاء اس کا گوشت پوست اور اس کی تمام ہڈیاں اپنے اپنے مخصوص حساب اور شکل و صورت میں معرض وجود میں آتی ہیں۔ یہاں تک اس کرم سے پیدا ہونے والا انسان اپنے اپنے والدین کے نقش و نگار کو بھی اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ جو سائنس ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے حامل انسانی کرم کو سمجھنے اور بیان کرنے سے قاصر ہے۔ وہ ایسا کرم اپنے طور پر محض اپنی ہی قدرت و عمل سے کیسے پیدا کر سکتی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ یہ عین انسانی فطرت ہے کہ ہر انسان اپنی بڑائی ظاہر کرنا چاہتا

ہے. لہٰذا اس موجودہ دَور کا انسان اپنی بڑائی جتلانے کے لئے خود کو تعلیم یافتہ اور ترقی پذیر کہتا ہے اور خود کو سماج کی اخلاقی اور دینی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے تہذیب کے نام پر سماج اور اخلاق کی تمام قدروں اور پابندیوں کو پامال کرتے ہوئے خود کو آزاد کرنے کی ناکام کوشش کی ہے. کیونکہ پہلی حالت میں تو پھر وہ نسبتاً آزاد تھا اور معاشرہ کو سنوارنے اور تعمیر کرنے کا شرف اسے حاصل تھا. معاشرہ میں اس کی قدر و قیمت تھی۔ اس کا خاطر خواہ وقار تھا. لیکن اب وہ اپنے جنسی و نفسیاتی جذبات و احساسات کا مکمل طور پہ غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنی مادہ پرستی کی بھوک میں اس بری طرح جکڑا گیا ہے کہ وہ اپنے شہوتی و نفسیاتی جذبات کے تابع ہو کر جھوٹ بولتا ہے. دھوکہ دیتا ہے۔ دوسرے کے مال و دولت کو حاصل کرنے کے لئے قتل کرنے یا اس کوشش میں قتل ہو جانے سے دریغ نہیں کرتا. اس میں دوسرے کو برداشت کرنے اور تحمل و بردباری سے پیش آنے کا مادہ اب ختم ہو چکا ہے. خود غرضی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے اور یہ سب کچھ اب تہذیب و تعلیم قرار پاتا ہے ایک زمانہ تھا کہ اس وقت کے لوگ بھی اپنے آپ کو تعلیم و تہذیب یافتہ کہتے تھے. وہ اپنے جسم کو ننگا رکھنا معیوب سمجھتے تھے. ان کے نزدیک جو لوگ کسی زمانہ میں غاروں میں ننگے جسم رہتے تھے اور صرف پتوں کے ذریعے ہی اپنی شرم گاہوں کو ڈھانپتے تھے۔ وہ جاہل اور غیر مہذب قرار پائے. چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں یونان اور پھر اٹلی کے لوگوں کو خوبصورتی بدرجہ اتم صرف لوگوں کے ننگے جسموں میں ہی نظر آئی اور اس بہانہ سے اپنے جنسی تقاضے پورے کرنے کے لئے ان کے مرد اور عورتیں کھیلوں میں حصہ لیتے تھے اور اب موجودہ دَور میں پھر ننگے جسم کی نمائش انتہائی تہذیب و ترقی سمجھا جانے کا رجحان بتدریج بڑھ رہا ہے. تو اندریں حالات اگر کوئی یہ اخذ کرے کہ موجودہ دَور کا انسان جو تہذیب و ترقی کے نام پر ننگا رہنا پسند کرتا ہے اور اسطرح اپنے جنسی جذبات کا جن کا کہ وہ اب غلام و تابع ہو چکا ہے. ان کی تکمیل میں اسے مدد ملتی ہے. بری طرح خود فریبی میں مبتلا ہے تو کون فیصلہ کرے

گا کہ حقیقت میں سچی تہذیب کیا ہے، سچی تعلیم کیا ہے اور سچی ترقی کیا ہے. محض کسی بات کا دعویٰ کر دینے سے اگر بات بن جاتی ہو تو پھر اور کیا چاہیئے. اسطرح تو سب معاملات خود بخود آسانی سے حل ہو گئے. کیا بہتر ہو کہ ہم خود فریبی کو ہمیشہ کے لیئے خیر باد کہہ دیں اور ہوش کے ناخن لیں.

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ زمین میں ایٹم تو کروڑوں سال پہلے ہی موجود تھا جب کہ کائنات تخلیق ہوئی تھی. اس میں پروٹون اور الیکٹرون اسی وقت سے اپنے تمام خواص کے ساتھ موجود تھے. لیکن سائنسدان جو کائنات کی تحقیق و مشاہدہ میں شروع سے لگا ہوا ہے اس پر یہ راز افشا نہ ہو سکا کہ اس ایٹم میں کتنی بے پناہ طاقت چھپی ہوئی ہے جو کہ اسکو توڑنے کے عمل سے حاصل ہوتی ہے. آج جسطرح ایٹم بم بنا کر ہم آپے میں نہیں سماتے. کون کہہ سکتا ہے کہ قدیم زمانے کا انسان بھی اسی شدت کے ساتھ فخر اور غرور محسوس کرتا ہو جبکہ اس نے پتھروں کے اتفاقیہ رگڑ کھانے سے آگ کو دریافت کیا تھا لیکن ہم اس زمانے کے سائنسدان کو جس نے کہ ہمیں سائنس سے روشناس کرایا جس نے کہ ہمیں آگ و حرارت سے استفادہ کرنا سکھایا اور جس کی بدولت ہم آج بھی پتھر کی رگڑ سے اپنا لائٹر جلاتے ہیں. ہم اسکو جاہل مطلق سے زیادہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں اور آج سے پانچ سو یا ہزار برس کے بعد کا انسان ہمیں کس حد تک جمع خاطر میں لاتا ہے اس بارے میں آپ جو چاہیں قیاس کر لیں. لیکن چونکہ انسان اپنی نفسیات کے ساتھ نہایت قدیم ہے اس لئے ہر دور کا انسان اپنی تہذیب و تمدن اور ترقی کا سہرا صرف اپنے سر پر باندھ کر ہی راضی و مطمئن ہوتا دکھائی دیتا ہے. اس لئے اس نام نہاد اور کھوکھلی موجودہ تہذیب و تمدن کی خاطر اگر کوئی شخص اپنی عزت و آبرو، اپنا اخلاق و وقار داؤ پر لگا دے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں آج دنیا کے چاروں طرف جو توپوں اور جنگی طیاروں کی گھن گرج سنائی دے رہی ہے اور جس بے دردی سے انسانی خون بے تحاشہ بہایا جا رہا ہے. وہ دور تہذیب و تمدن کا دور کہلانے کا اتنا حقدار نہیں ہے. جتنا کہ ظلم و تشدد اور درندگی کا.

پروفیسر فلپ ہٹی کی بدمعاشی

امریکہ میں اسلام کے خلاف جو تعصب آج پایا جاتا ہے۔ وہ زیادہ تر امریکہ میں پرنسٹن یونیورسٹی کے مذہبی امور کے پروفیسر فلپ کے ہٹی (PHILLIP K. HITTI) نے پیدا کیا ہے۔ یہ شخص مغربی ممالک میں اسلام کو غیر مسلمانوں میں سب سے زیادہ جاننے والا مانا جاتا ہے اور اس کے اسلام کے متعلق اقوال ان لوگوں کے لئے ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ملعون جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) دھوکہ باز کہتا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ تبلیغ کا انداز ہجرت کے بعد عملی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ وہ تعصب کی پٹی باندھے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اسلام قادر مطلق خالق کائنات کا مکمل دین ہے۔ اس میں تمام امور زندگی کے متعلق اللہ تعالےٰ کی ہدایات و رہنمائی موجود ہے۔ چاہے وہ سیاسی امور ہوں۔ معاشی ہوں سماجی ہوں یا ازدواجی ہوں۔ اسکا ذہن بالکل پراگندہ اور مفلوج ہے۔ وہ یہ بھی شک کرتا ہے کہ حضور رسالت مآب تعلیم یافتہ نہ تھے۔ کیونکہ بقول اس کے اگر آپ نے کسی جگہ کوئی تعلیم حاصل نہیں کی ہوئی تھی تو پھر نہایت عمدہ و اعلےٰ عربی زبان میں قرآن پاک کس طرح پیش کر سکتے تھے اور یہ حقیقت اس کے احاطۂ ادراک سے باہر ہے کہ قرآن پاک حضور کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا پاک کلام ہے۔ اس میں نہ کوئی سقم ہے نہ تشنگی۔ بلکہ یہ نہایت ہی اعلےٰ و ارفع ہے اور چونکہ یہ اللہ جلشانہٗ کا کلام ہے۔ اسی لئے اللہ پاک نے اپنے بندوں کو چودہ سو برس ہوئے۔ قرآن پاک میں یہ کھلا چیلنج دیا ہے کہ اگر تم سے کوئی اسکو بندے کا کلام سمجھتا ہے تو وہ دنیا کے تمام نامور عربی دانوں کو اگر اکٹھا بھی کر لے اور یہ سب مل کر یہ کوشش کریں کہ قرآن پاک کی کسی سورۃ یا آیت مبارکہ کے مقابلہ میں اس کے برابر کا کلام لکھ لائیں تو وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ اگر اس میں پروفیسر یا اس کے ساتھیوں کو یہ شک ہے کہ قرآن پاک خدا کا کلام نہیں ہے۔ بلکہ ایک دھوکہ باز پڑھے لکھے انسان کا، تو پھر آج چودہ سو سال تک دنیا کو یہ کھلا چیلنج وہ آج تک کیوں نہ قبول کر سکے۔ یہ پروفیسر اپنے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا

ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے تھے۔ لیکن اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ کوئی ٹھوس تاریخی حقائق پیش نہیں کرتا۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے تھے۔ یہ ملعون پروفیسر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے تیرہ سو برس بعد دنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور کس ڈھٹائی اور تعصب کے ساتھ تاریخی حقائق سے بے نیاز ہو کر بے بنیاد الزامات تراشتا ہے اس کی عقل بظاہر اس حد تک معطل ہو چکی ہے۔ کہ وہ یہ معمولی سی بات بھی سمجھنے سے قاصر ہے کہ موجودہ دور میں کوئی شخص کسی کو ایک دفعہ یا حد دو دفعہ دھوکا دے سکتا ہے۔ ہمیشہ نہیں دھوکہ بازی کی کامیابی تو زیادہ سے زیادہ چند دن کی ہوتی ہے اور ادھر صورت حال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہزاروں کروڑوں مسلمان پچھلے چودہ سو سال سے اپنا نبی مان رہے ہیں۔ بلکہ سردار الانبیاء مانتے ہیں اور ان کو ماننے والوں کی کافی تعداد ایسے مسلمانوں کی ہے جو پروفیسر فلپ ہٹی سے کسی طرح کم تعلیم یافتہ اور کم ذہین نہیں ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ جب یہ پروفیسر یہ کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے تھے تو اس کے ثبوت میں تاریخ کے حوالہ سے یہ بتاتا کہ وہ کس سکول اور یونیورسٹی کے پڑھے تھے۔ ان کے نام کیا تھے اور وہ کہاں واقع ہیں۔ اسی طرح جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پاگل کہنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ پھر تاریخ کے حوالہ سے یہ ثابت کرے کہ وہ کس ڈاکٹر کے زیر علاج رہے اور اس نے کب اور کہاں ان کے مرض کی تشخیص کی۔ ہم تو آجکل اس دور میں رہ رہے ہیں جس میں ٹھوس تاریخی ثبوت پیش کئے بغیر کسی کو مطمئن کرنا دشوار ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر ہٹی نے اپنے دلائل کچھ اس انداز میں دیئے ہیں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یا تو وہ کند ذہن واقع ہوا ہے یا پھر وہ اپنا توازن کھو بیٹھا ہے۔ لیکن اگر وہ اس سلسلہ میں دستاویزی ثبوت مانگے کہ وہ ذہنی مریض کب اور کہاں ہوا تھا۔ کس ڈاکٹر نے اس کا علاج کیا تھا۔ اس کے بستر کا کیا نمبر تھا اور ہسپتال کا نام کیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس سے کتنی فیس وصول کی تھی اور اس فیس کی وصولی کی تاریخ اور نمبر کیا تھا۔ اسطرح کا ثبوت میں اگر اپنے قارئین کو مہیا نہ کروں۔ میں انکو مطمئن نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنا ہم خیال بنا سکتا ہوں۔ کیونکہ میرے قارئین ضروری

سوجھ بوجھ رکھتے ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں۔

پروفیسر تعصّب سے اندھا ہے

ڈاکٹر فلپ ہٹی پھر یہ الزام بھی اسلام پر عائد کرتا ہے کہ مسلمان رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پوجا کرتے ہیں۔ اس عقل کے اندھے کو اب کون سمجھائے کہ مسلمان تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور کسی کی نہیں۔ البتہ مسلمان جناب محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا نبی مانتے ہیں، سردار انبیاء مانتے ہیں، سرورِ کائنات مانتے ہیں، آخری نبی مانتے ہیں اور رحمۃ اللعالمین مانتے ہیں۔ مختصر طور پر اللہ پاک کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ مانتے ہیں۔ ان کی اللہ پاک کے بعد باقی سب سے زیادہ عزت و تعظیم کرتے ہیں۔ ان سے مذہبی پیار بھی کرتے ہیں جو اپنے خلوص کی وجہ سے عشق کا مقام بھی حاصل کر لیتا ہے اور حضور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ عقیدت و محبت صرف دیہات میں رہنے والے ان پڑھ مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ شہروں میں رہنے والے یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ مسلمان بھی کرتے ہیں اور ان کی عقیدت و محبت میں شدت اس لئے بعض حالات میں زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی تعلیم اور شعور کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ مقام کو بہتر طور پر سمجھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس ڈاکٹر فلپ نے ہر مقام پر اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے میں یا تو فاش غلطی کی ہے یا پھر وہ اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر تعصب کی پٹی اپنی آنکھوں پر باندھ کر اسلام کے حقائق کو جان بوجھ کر توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہے۔ ڈاکٹر فلپ نے اپنے نقطہ نگاہ کو ثابت کرنے کے لئے سب سے زیادہ سہارا اس بات سے لیا ہے کہ چونکہ اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین نہیں، بلکہ انسان کا بنایا ہوا ہے۔ اسی لئے عراق، شام اور ایران کے مسلمانوں نے صرف اس لئے اسے اپنایا کیونکہ ان کے مدِنظر اقتصادی، معاشی اور سماجی مقاصد کا حصول تھا۔ اسلام کو اللہ کا دین نہ سمجھنا بلکہ اسکو انسان کا بنا ہوا دین سمجھتے ہوئے اسے مادہ پرستی سے ملوث کرنا ایسی شدید غلطی ہے جیسے اگر کوئی پہلی جماعت میں پڑھنے والا مسلمان کرے تو اس کو

اسلام کی تعلیم کے سمجھنے اور حصول میں بری طرح فیل کر دیا جائے۔ کیا ڈاکٹر فلپ ہٹی نے اب مشاہدہ نہیں کیا کہ مشرق وسطےٰ اور فلسطین کی آزادی کے معاملہ میں اور نیل کے معاملہ میں مسلمان کس طرح اکٹھے ہوئے ہیں۔ کس طرح اللہ کے دین سے لگاؤ رکھتے ہوئے کس طرح ایک دوسرے ملک پر کروڑوں روپے بے دریغ خرچ کر رہے ہیں۔ چودہ سو سال گذر جانے کے بعد بھی ان میں اسلام کا وہی جذبہ پھر پیدا ہو رہا ہے۔ جس کی اسلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق تعلیم دی تھی۔ مسلمانوں میں موجودہ اتحاد دین کی بنا پر ہے۔ جس نے امریکہ اور یورپ دونوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جنہوں نے ڈاکٹر فلپ کی کتاب "اسلام اور مغرب" پڑھکر اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے میں شدید غلطی کی تھی۔ اس لئے کتنا ہی اچھا ہو۔ اگر اب یہ ڈاکٹر اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے اپنی کتاب کو دنیا کے بازار سے واپس منگوا لے اور اسے جلا دے تاکہ وہ یورپ اور امریکہ کے لوگوں کو اس تہذیب یافتہ دور میں گمراہ ہونے کا موجب نہ بنے۔

قرآن اللہ کی کتاب ہونے کے ثبوت

قرآن پاک کا اللہ تعالیٰ کی کتاب ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک تو چودہ سو برسوں کے دوران کوئی بڑے سے بڑا عربی دان قرآن پاک کا یہ چیلنج قبول نہیں کر سکا کہ اس کی صرف ایک سورۃ کے برابر ہی کوئی عربی لکھ کر لے آئے۔ اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ دنیا کی آج تک کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ جو حجم میں قرآن پاک جتنی ہی بڑی ہو۔ کئی سو صفحات پر مشتمل ہو اور لوگوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہمیشہ زبانی یاد ہو۔ یہ شرف دنیا میں آج تک صرف اور صرف قرآن پاک ہی کو حاصل ہے کہ اس کے سینکڑوں نہیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں مسلمان قاری اس وقت چودہ سو سال گذر جانے کے باوجود بھی دنیا میں موجود ہیں۔ جو تمام کے تمام کلام پاک زبانی پڑھ جاتے ہیں اور زیر و زبر تک کی غلطی نہیں ہو سکتی اور اس حقیقت کی صرف یہی وجہ ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اسلام اللہ کا دین ہے۔ قرآن پاک اللہ کا کلام ہے۔ جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لیا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ

قرآن پاک چودہ سو سال سے مسلمانوں کے سینے میں محفوظ چلا آرہا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ڈاکٹر فلپ ہٹی کی آنکھوں سے تعصب کی پٹی کون ہٹائے. اگر وہ اسے باندھ رکھنے کی نیت کئے ہوئے ہے. اگر وہ اب بھی راضی نہیں ہوتا کہ اسلام کو اللہ کا دین مان لے تو اسے چاہیئے کہ وہ ہماری مسلمان بہن مریم جمیلہ جو کہ ابھی کے امریکہ سے پاکستان تشریف لائی. ان کی اس موضوع پہ متعدد کتب پڑھ لے شاید اس نیک سیرت خاتون کی باتیں اس ڈاکٹر کے دل میں اتر جائیں.

قرآن پروفیسر کی حیرت کا موجب

ڈاکٹر فلپ نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ اگر حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے لکھے نہیں تھے تو پھر وہ کیسے ہمہ وقت قرآن مجید عربی زبان میں پیش کر سکتے تھے. یہی وہ مقام ہے جہاں یہ ڈاکٹر بظاہر بھٹک گیا ہے وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ چونکہ قرآن مجید اللہ تعالے کا اپنا کلام ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھا لکھا ہونا کوئی ضروری شرط نہ تھا بلکہ ان کا پڑھا لکھا نہ ہونا اس امر کا ڈاکٹر کے لئے واضح دلیل اور ثبوت ہے کہ قرآن اللہ پاک کا کلام ہے اور اللہ پاک نے خود قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے نہیں تھے. اس لئے ان کے ان پڑھ ہونے کا آپ کے تمام صحابہ کرام کو علم تھا اور اگر ان کا ان پڑھ ہونا ایک جھوٹی بات ہوتی تو ان کے صحابہ کرام بلکہ کفارِ دشمن بھی ان کی نجی زندگی کے ہر پہلو کو بہت قریب سے بخوبی جانتے تھے. سب سے پہلے قرآن پاک پر اعتراض کرتے اور کبھی انکو خدا کا پیغمبر نہ مانتے. دین کا معاملہ تو دنیاوی اور سیاسی معاملات سے کہیں اہم ہوتا ہے. اگر ڈاکٹر فلپ واٹر گیٹ جیسے سیاسی معاملے پر سابق صدر رچرڈ نکسن کا اپنی امریکی قوم سے ایسے حشر کی توقع کر سکتا ہے تو کیا مسلمان کسی دھوکہ باز کو اللہ کا پیغمبر مان سکتے ہیں. میں حیران ہوں کہ ایسے نتیجے پہ پہنچنے کے وقت ڈاکٹر فلپ کی دماغی حالت کیا تھی. یہ اسلام کے مخالفوں پر پوری طرح واضح ہو جانا چاہیئے کہ مسلمان نہ تو مادہ پرست ہیں. نہ وطن پرست نہ گورے نہ کالے نہ غریب نہ امیر بلکہ وہ سب آپس میں برابر کے دینی بھائی ہیں.

میں اس وقت سچے اور صحیح مسلمانوں کا ذکر کر رہا ہوں اور اگر کسی شخص کو کسی جگہ اپنے اعمال کی وجہ سے مسلمان آپس میں دینی بھائی دکھائی نہیں دیتے تو قصور اس میں اسلام کا اور اس کی تعلیم کا نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مسلمان جن کے اعمال کے باعث اسلام بدنام ہو رہا ہے۔ وہ اپنے عمل و فکر میں ضروری اصلاح کریں تاکہ اغیار ان کے کردار کا سہارا لے کر اسلام پر انگلی نہ اٹھا سکیں۔

رسالت کے سچ ہونے کا ثبوت

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر فلپ کے ہٹی اور اس کے دیگر ممالک میں ہمنوا اور ہم خیال ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ کسی طرح اسلام کو باطل دین قرار دیا جائے۔ اگر ایک لمحے کے لئے برائے مناسب غور و فکر اس کی یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ اسلام اللہ کا بھیجا ہوا دین نہیں ہے بلکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا جان بوجھ کر اپنا خود ساختہ دین ہے تو پھر ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں کیا۔ ان کی ایسا کرنے کی غرض و غایت کیا ہو سکتی تھی اور آپ اس طرح کن مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر ڈاکٹر فلپ کے الزامات کی اس پس منظر میں تحقیق کی جائے تو پھر یہ اخذ کرنا پڑے گا کہ انسان اپنے نفسیاتی تقاضوں کے تحت یہ سب کچھ اپنے لئے عیش و آرام، مال و دولت اور تخت و تاج کی خاطر ہی کرتا ہے۔ لیکن جس وقت ہم حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کا بغرض تحقیق و تنقید جائزہ لیتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضور نے زندگی نہایت مصائب و آلام میں گزاری۔ جس وقت کہ اسلام دور دور تک پھیل چکا تھا اور مسلمان آپ کے ادنیٰ اشارے پر اپنی جان کا آخری قطرہ تک بہا دینے کو عین سعادت سمجھتے تھے۔ اس وقت بھی آپ معمولی سی چٹائی پر ہی سوتے تھے۔ لباس نہایت سادہ پہنتے تھے، سوکھی روٹی کھاتے تھے۔ اکثر فاقہ کرتے تھے۔ دروازہ پر دستک دینے والے کو بغیر کھانا کھلائے جانے نہ دیتے تھے۔ چاہے خود بھوکا ہی رہنا پڑے۔ اکثر پیدل سفر کیا کرتے تھے۔ یہ تمام اسلامی سلطنت کے سربراہ کی زندگی تھی، نہ تخت

تھا، نہ تاج۔ جھونپڑی ان کا محل تھا۔ خزانے میں جو مال و دولت جمع ہوتا۔ وہ غریبوں، مسکینوں یتیموں اور بیواؤں اور نادار لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ اس میں سے ایک پائی بھی اپنی ذات پر ناجائز خرچ کرنا گوارا نہ کرتے تھے۔ کیونکہ حکم خداوندی ہی ایسا تھا اور جس وقت وہ فانی دنیا سے حق کا پیغام اللہ کے بندوں کو پہنچا کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے تو سب کچھ امتِ مسلمہ کے لئے چھوڑ گئے۔ آپ کی اولاد میں سے نہ کسی کو کوئی تخت ملا، نہ کوئی ملکہ ہی بنی۔ کیونکہ آپ بادشاہ نہ بنے۔ لیکن اسلام کے نام پر حکمِ خداوندی کے تابع ان سب نفسیاتی تمناؤں اور لالچوں سے مکمل طور پر پرہیز و اجتناب کیا۔ اب قارئین حضرات جو کہ مناسب عقل و شعور کے مالک ہیں۔ وہ خود ہی اپنے تئیں سوچیں اور فیصلہ کریں کہ کیا اسلام واقعی خدا کا دین ہے یا کہ کسی دھوکہ باز انسان کا اور اگر وہ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ اسلام بلاشک و شبہہ اللہ ہی کا دین ہے تو پھر وہ شخص جو ڈاکٹر فلپ کے ہٹی کے نام سے اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے، کیا وہ کہیں جان بوجھ کر اپنے قارئین کو گمراہ کرنے کی خاطر دھوکہ تو نہیں دے رہا یا وہ اپنی عقل پر پردہ پڑ جانے سے اس بارے میں غلط نتیجہ پر پہنچنے اور گمراہی میں بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکا۔

اسلام پر ناپاک حملے

کچھ عرصہ سے دیکھنے میں یہ بھی آ رہا ہے کہ خود تراشیدہ عیسائیت دنیا بھر میں اسلام اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر نامناسب قسم کے مختلف الزامات لگانے کے لئے اپنی متعصبانہ سرگرمیوں میں تیز تر ہے۔ طرح طرح کے داؤ پیچ تقریر اور نشر و اشاعت کی شکل میں لگائے جا رہے ہیں۔ اس ناپاک مہم کو جاری رکھنے اور تقویت پہنچانے کے لئے ایک بہت بڑی سرمایہ دار جماعت کام کر رہی ہے جو ہر قسم کے شاخسانے تیار کر کے انہیں دنیا کے ہر گوشے میں پھیلانے کے لئے ایک دوسری تربیت یافتہ جماعت کو استعمال میں لاتی ہے۔ ہر فرد کو اس کی کارکردگی اور کامیابی کے مطابق وظائف دینے کا باقاعدہ انتظام ہے۔ بعض حالات میں اہلکاران پر انعامات کی بارش بھی ہوتی رہتی ہے۔

اس میں شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اس میٹھے زہر کا اثر صحیح اسلام اور بلالی رضؓ کیفیت رکھنے والے مسلمان پر ہرگز نہیں ہو سکتا. کیونکہ اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری قادر مطلق نے خود اپنے اوپر لے رکھی ہے. جسکا اعلان قرآن پاک میں موجود ہے. البتہ چند بیچارے نام نہاد مسلمان جو حقیقی اسلام کی عظمت اور محاسن سے بے بہرہ ہوتے ہیں. ان کے ذہنوں کو اس کا ذبانہ تبلیغ کے ذریعے ماؤف کر کے مذکورہ متعصب عیسائیت کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے. جو اسی کا جزو لاینفک بن کر رہ جاتے ہیں. کاش کہ ایسے بدنصیب ہرجائی اسلام سے دستبردار ہونے کے بعد اگر حقیقی عیسائیت کا دامن بھی تھام لیتے تو کافی حد تک مذہبی گمراہی سے نجات پاتے. کیونکہ فطری عیسائیت اسلام اور پیغمبر اسلام کی برتری کی پیش گوئی اور آمد کی تمنا اور خیر مقدم کرتی ہے اور اسلام بھی عیسائیت کی اس صداقت کی تصدیق کرتا ہے.

مسٹر لوئیس کیسلز یو پی آئی سٹاف رائیٹر نے مسلح افواج امریکہ کے اخبار ("STARS & STRIPES") میں اپنا مقالہ موسومہ

("A DYNAMIC CHALLENGE TO CHRISTIANITY: ISLAM'S ROLE IN EMERGING AFRICA.")

سپرد قلم کر کے نہ صرف اپنی علمی استعداد کا ناجائز استعمال کیا ہے. بلکہ بادی النظر میں باشندگان امریکہ اور عامۃ الناس عیسائیوں کے سامنے اسلام کو ایسے غلط انداز اور مسخ شدہ صورت میں پیش کر کے اول الذکر کے لئے خصوصاً اور آخر الذکر کی صورت میں عموماً انتہائی فریب دہی کا ارتکاب جرم کیا ہے.

ہر ایسے قابل ذکر دیانتدار مصنف کے طرز عمل کے برخلاف جو ضابطہ اخلاق کے تقاضوں کی حدود سے آشنا ہوتا ہے. مسٹر کیسلز نے اپنا متذکرہ الصدر مقالہ پیش کرتے وقت اصل موضوع سے انحراف کرتے ہوئے اسلام کو بدنام کرنے کی غرض سے اپنے انتہائی

غیض و غضب اور اپنی قلبی خصومت کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ باشندگان امریکہ کی ضیافت طبع کے لئے دیدہ دانستہ ایسی چیز پیش کرتا ہے جس سے ان کے صحت مندانہ ذہن زہر آلود ہو جائیں اور ان کے اندر اسلام اور مسلم دشمنی کے جذبات داخل کر دیئے جائیں اور وہ بھی عین ایسے وقت پر جبکہ امریکہ نے اپنی پوری قوت اس غرض کے لئے مرکوز کر رکھی ہے کہ دنیا بھر کے متفق الخیال اور متحد الفکر آزاد لوگوں کو اشتراکیت (کمیونزم) کے حلقۂ اثر سے مامون و مصئون رکھا جائے۔

الزام ۱۳ بقول مسٹر کیلز "اسلام اور بین الاقوامی اشتراکیت میں یہ امر بطور ایک نقطہ مشترک ہے کہ عند الضرورت اپنے اپنے نصب العین کے حصول کے لئے طاقت کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس کی تائید و تصدیق کے لئے تاریخی شواہد موجود ہیں۔

جواب اس الزام کا جواب یہ ہے کہ ایسے الزام کے ذریعے مسلمانوں کو اشتراکیوں کے دامن کے ساتھ باندھنے کی ایک غیر دانشمندانہ ہی نہیں بلکہ ایک بدنما کوشش کی گئی ہے تاکہ امریکہ کے مسلمہ رہنماؤں (جو کہ عالم اسلام کے ساتھ باہمی تعلقات و روابط کو ترقی دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں) کی ذہنی صلاحیتوں کی نسبت باشندگان امریکہ کے ذہنوں میں بے احتیاطی اور شک و شبہ کا ایک خلاف حقیقت تاثر پیدا کیا جا سکے۔

یہ وجوہات ہی تو ہوتے ہیں۔ جو حالات کا عمیق جائزہ لینے کے بعد طاقت کے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا کرتے ہیں۔ کیا یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت نہیں ہے کہ اقوام متحدہ امریکیوں کی متفقہ امداد سے بزور طاقت امن کے نصب العین کے حصول کے لئے ہمہ تن مصروف کار ہے؟ کیا امریکی امن عالم کی حفاظت و برقراری کی خاطر جنگ لڑنے کے لئے آمادہ و تیار نہیں ہیں؟ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ انہوں نے کیوں اور کس خاص مقصد کے لئے تباہ کن جوہری بموں کا ایک ذخیرہ عظیم تیار کر رکھا ہے؟ اور انہوں نے ویٹ نام، کمبوڈیا اور مشرقِ وسطیٰ میں طاقت کے استعمال کو کیوں جائز قرار دیا۔

لفظ اسلام کے معنی ہی "امن وسلامتی" ہے۔ اس لحاظ سے اسلام ہوا۔ امن وسلامتی کا مذہب۔ مگر ان لوگوں کے لئے جو خود امن پسند ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے (معتقدین) پیروؤں کو صبر وتحمل۔ مساوات انسانی (بلا لحاظ تفریق ملت و مذہب) اور آزادیٔ عبادت کا حکم دیتا ہے۔ یہ مسلمانوں پر جنگ کرنے کا صرف ایسی صورت میں فرض عائد کرتا ہے جبکہ دوسروں کے حملہ آور ہونے کی صورت میں حفاظت خود و حفظِ مذہب خود مقصودِ نظر ہو۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ دیانت دارانہ طور پر حفاظتِ خود کی خاطر جنگ کرنا کوئی گناہ نہیں اور اسی بنا پر ایسی جنگ کو فوری طور پر عالمی منظوری و تائید کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

دنیا بھر کے تمام لوگوں اور جملہ مذاہب میں سے یہ صرف اسلام ہے جو کہ نہ صرف عیسائی مذہب سے قریب ترین ہے بلکہ اس کے پیرو عیسائیت اور اس کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے جملہ عزت واحترام کے جذبات رکھتے ہیں اور جناب عیسیٰ علیہ السلام کو بطور نبی اللہ مانتے ہیں۔ بدیں وجہ ایک مسلمان کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ حقیقی عیسائیت کا احترام کرے۔ مگر جملہ نوع انسانی کی طرف مقدس نبی جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بھیجے ہوئے آخری احکامِ خداوندی کی رو سے وہ اتباع اسلام ہی کا کرے۔

الزام ۲ افریقی باشندوں کے زاویۂ نگاہ کے مطابق عیسائی مذہب سفید فام قوم کا بھیجا ہوا ایک دساوری مال تصور کیا جاتا ہے وہ اس کو نوآبادیاتی طرزِ حکومت کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں، جس کی وہ پوری شدت کے ساتھ مخالفت کر رہے ہیں۔

جواب سچی عیسائیت اور صحیح تہذیب و تمدن، رنگ، ذات اور معتقدات سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ اگر افریقی نوآبادیاتی نظام کے خلاف صدائے احتجاج یا اظہار ناپسندیدگی کر رہے ہیں تو اس بارے میں اسلام کو متہم و موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا

سکتا۔ اسکا واحد علاج تو صرف اسی میں مضمر ہے کہ مسٹر لوئیس کیلز جیسے اشخاص جو دوسروں کے مذہب کے تقدس پہ ناپاک حملے کرنے میں مصروف رہتے ہوں اور جن کے ایسے طرزِ عمل سے وحشی پن اور بربریت کی بُو آتی ہو، کو صحیح معنوں میں عیسائی بن جانا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اقوال، افعال اور اعمال کی حیثیت کے ذریعہ دوسروں کو کھینچ کر اپنے حلقہ ہائے اثر کے اندر لا سکیں۔

الزام ۳۲ افریقہ میں اسلام کے حق میں دوسرا بڑا امر یہ ہے کہ عیسائیت کے مقابلہ میں اسلام اپنے نومسلموں پہ نسبتاً بہت کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک افریقی عیسائی مذہب اختیار کر لیتا ہے تو اس کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے۔ لیکن وہی شخص جب مسلمان ہو جاتا ہے تو وہ بیک وقت چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ یہ امر افریقی ممالک میں کوئی کم درخورِ التفات و اہمیت نہیں، جہاں پہلے ہی سے کثرتِ ازدواج وسیع پیمانے پر رائج ہے۔

جواب اس سے بڑھ کر کوئی امر بعید از صداقت تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام اپنے پیروؤں پر عیسائیت کے مقابلہ میں بہت کم پابندیاں عائد کرتا ہے۔

اسلام میں یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ ہر ایک مسلم نماز سے پہلے باقاعدہ وضو کر کے ایک دن میں پانچ دفعہ نماز ادا کرے۔ ہر ایک مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ دیانت دار ہو، صاف گو ہو، مستقل مزاج ہو۔ مگر اس کی دیانت داری صاف گوئی اور مستقل مزاجی میں نرمی حسنِ سلوک اور شرافت کے عناصر موجود ہوں تاکہ وہ دوسروں کے لئے باعثِ مسرت و انبساط ہو۔ اس کو اپنی روزمرہ زندگی میں لازمی طور پہ ہمدرد بھی ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ امر بھی لازمی و لابدی قرار دیا گیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے اعمال و افعال ظاہری میں بلکہ اپنے خیالات میں بھی پاکیزگی کو بدرجہ اتم برقرار رکھے۔ اس کے نزدیک جھوٹ بلاشک وشبہ واضح طور پہ ایک گناہ ہے اور عصرِ حاضر کی مصلحت آمیز حکمتِ عملی اس کے نزدیک بجز اس کے اور کچھ بھی

نہیں کہ یہ ایک ایسا صریح جھوٹ ہے جو دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اپنی ذاتی مصلحت اندیشیوں اور دنیوی فوائد کے حصول کی خاطر بولا جاتا ہے۔

اللہ (بزبان انگلش "گاڈ") نوع انسانی کے اندر جنسی تقاضے کی شدت سے "کلیتہً" واقف ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اسی نے تو اس کو اور اس کے نتیجہ کے طور پر مرد کے ایک زبردست رجحان بغرض تکمیل خواہشات جنسیاتی کو اپنی مخلوق (نوع انسانی) کی فطرت کی گہرائیوں میں سمو رکھا ہے۔ بنا بریں جنسیاتی تعلقات بذریعہ باضابطہ تعلقات ازدواجی مخصوص حالات میں چار بیویوں کی حد تک اور وہ بھی بہت سی پابندیوں کے ساتھ اسی اللہ تعالیٰ کی طرف سے منظور شدہ ہیں۔

عیسائی مذہب میں بھی جنسی تعلقات باضابطہ شادی کے بغیر سختی کے ساتھ ممنوع قرار دیئے گئے ہیں۔ بائیبل اپنے پیروؤں کو اس حقیقت سے روشناس کراتی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام ایک سے زائد بیویاں رکھتے تھے۔ کیا ان ہر دو انبیاء علیہم السلام کا ایسا فعل مذہبی پاکیزگی اور "GOD" (اللہ) کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا؟ (نعوذ باللہ من ذالک) ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ ہے وہ سوال جس کے جواب کی ذمہ داری ایک ہی بیوی رکھنے کے طریقِ کار کو آزادیٔ نسواں کے ہم معنی و مترادف قرار دینے والے علمبردارانِ عیسائیت کے سر پہ عائد ہوتی ہے۔

آنکھیں کھول کر دیکھئے! اس مغرب میں جو ایک ہی بیوی رکھنے کے طریق کار کو اپنانے کا مدعی بنا بیٹھا ہے۔ آج کل کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اگر ہم مختلف اعداد و شمار برائے ناجائز پیدائشِ بچگان و دیگر امورات متعلقہ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس ناقابلِ تردید حقیقت سے دوچار ہونا پڑے گا کہ بوقتِ شادی شاذ و نادر ہی کوئی ایک جوڑا پاکدامنی کے معیاری مقام پر پورا اترتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ قانوناً ایک مرد پر صرف ایک ہی بیوی رکھنے کی کڑی پابندی عائد شدہ ہے۔ مگر وہ بیسیوں غیر قانونی بیویوں کے جھرمٹ میں پھنسا ہوا نظر آ رہا ہے۔ مزید براں جب ہم مغرب

میں بظاہر ایک ہی بیوی رکھنے والے ایک عام مرد کی طلاقوں کی روز افزوں کثرت اور اس کے ساتھ ہی اس کے بعد اس کے شادی پہ شادی کئے جانے کے محبوب مشغلہ کے نتائج' کو پیش نظر رکھتے ہیں تو یہ حقیقت واشگاف ہو جاتی ہے کہ اس کی بیویوں کی تعداد غیر معمولی حالات میں بڑھتے بڑھتے پانچ ۔ چھ ۔ سات یا آٹھ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ اگرچہ ایک ہی وقت میں اس کے لئے صرف ایک ہی "قانونی" بیوی ہوا کرتی ہے۔ بدیں انداز وہ مغرب جو صرف ایک ہی بیوی رکھنے والے اصول کا دعویدار ہے۔ اپنے عام دو رُخے انداز میں شادی کے تقدس مآب تخیل کا گویا کھلم کھلا مذاق اُڑا رہا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں ہم کہاں تک صحیح معنوں میں اپنی ایسی تہذیب و تمدن نیز اپنی مزعومہ حقیقی آزادئ نسواں کے بارے میں فخر محسوس کر سکتے ہیں۔ پوشیدہ و راز دارانہ مشغلۂ زنا کے مقابلے میں ازدواجی زندگی کی چہار گونہ ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے بہت زیادہ مضبوط چال چلن اور اخلاقی جرأت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آزادئ نسواں اور تہذیب و تمدن کا صحیح مقام مردوں کی طرف سے عورتوں کی ایسی مدح سرائی، خوشامد و چاپلوسی کے اندر نہیں، جو موخرالذکر کے دماغی و جذباتی توازن کو متزلزل کر دے۔ برخلاف اس کے ان کا صحیح مقام اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ان کے لئے ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے، جس کے اندر رہتے ہوئے وہ اپنے اپنے مقامات توازنِ طبع و پاک بازی کو قائم و برقرار رکھ سکیں اور ایسی زندگی بسر کر سکیں، جو خوشامد و چاپلوسی کے عناصر سے کلیتہً پاک و مبرا ہو یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ چاپلوسی مرد کے اسلحہ خانہ میں ایک ایسا ہتھیار موجود ہے، جس کو وہ بلا لحاظ مصلحت و ضرورت و موقعہ شناسی کے استعمال کرتا رہتا ہے۔

جملہ انگریزی فلموں کے مضامین بھی ہمیشہ نوعِ انسانی کے اندر ودیعت شدہ جنسی تقاضے کی خطرناک شدت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں، مثال کے طور پر ایک نپولین کو فاتح عالم ہونے کی حیثیت میں بھی ایک عورت کے قدموں پہ بے کسی و بے بسی کے انداز میں گرتا ہوا

دکھلایا جاتا ہے۔ اگر مسٹر سگمنڈ فرائڈ جیسے کہنہ مشق ماہر جنسیات کی رائے اس موضوع پر طلب کی جائے تو وہ ایسی زبردست جنسی قوت کی تشریح کرتے ہوئے شاید اس سے بھی آگے قدم مارنے کی ضرورت محسوس کرے۔ اس لئے ان حالات کے پیش نظر اس کو شومیٔ قسمت ہی تصور کر لینا چاہیئے کہ موجودہ مغرب ایسے زبردست جنسی تقاضے کے مقابلہ میں اس حد تک مغلوب ہو چکا ہے کہ بادی النظر میں اس کے اندر غیر شادی شدہ جوڑوں کے باہمی جنسیاتی تعلقات کے "تکلیف دہ اضافے کے خلاف صحیح اور ٹھوس محاذِ جنگ قائم کرنے کے لئے کسی قسم کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے۔ اب یہ کلیتہً" مغلوب ہو چکا ہے اور اس کی اب تو ایسی حالت ہو چکی ہے کہ یہ اس تلخ حقیقت اور اس کی پیدا کردہ تکلیف دہ بڑھتی ہوئی شرح پیدائش بچگان ناجائز کو بھی تسلیم کر لینے سے احتراز و اجتناب کر رہا ہے۔ اس کے لئے تو اب صرف یہی ایک مسئلہ درپیش ہے کہ کس طرح اپنے ناواقف نوجوانوں کو متعدی امراض مثلاً سوزاک اور آتشک کی بداثری سے نجات دلائی جائے جس کیلئے "باب اور سیلی (BOB & SALLY) جیسی معلوماتی اور تعلیماتی فلمیں وسیع پیمانے پر دکھلائی جا رہی ہیں۔

ایک سچے مسلمان کو نیک اور پاکباز رہنے کا حکم اللہ تعالےٰ کی طرف سے دیا گیا ہے جسکا اطلاق اس کے خیالات پر بھی ویسا ہی ہے۔ جیسا کہ اعمال پر اگر وہ یہ محسوس کرے کہ جنسیاتی تقاضوں کی وجہ سے وہ صحیح معنوں میں پاکباز نہیں رہ سکتا تو وہ بلا توقف اپنے لئے شادی کی صورت پیدا کرے۔ انتہائی تعداد چار مقرر شدہ ہے۔ بشرطیکہ وہ جملہ ایسی شرائط جن سے ایسی شادیاں مشروط کر دی گئی ہیں کو پورا کرنے کی اہلیت اور استطاعت رکھتا ہو اور اس طریق پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے خیالات اور اعمال ہر دو کو مسلسل پاک و صاف رکھے۔

ایسی بات کا پیش کرنا کہ افریقی محض اسی بنا پر جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہو رہے ہیں کہ وہ اس طرح چار بیویاں رکھ سکیں گے۔ نفس دلیل ہی کے برعکس ہے۔ ایک ایسا

شخص جو فی الحقیقت ایسا "جوع الازواج" کا شکار ہو کر رہ گیا ہو۔ اس کے مقابلے میں اس امر کو یقیناً زیادہ پسند کرے گا کہ وہ غیر شرعی بیویوں کی ایک غیر معین تعداد اپنی تحویل میں رکھے اور اپنے ایسے طریق کار سے ایسی جانکاہ ذمہ داریوں سے بھی نجات حاصل کرے جن سے اسکو صرف چار اصلی شرعی بیویوں کے رکھنے کی صورت میں دوچار ہونا پڑے گا۔ جیسا کہ پیشتر ازیں کہا جا چکا ہے ایک سچا مسلمان مذہب کے تقدس کی تنقیص و تحقیر کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سچا عیسائی اور سچی عیسائیت ہر دو اس کے ہمہ تن جذبۂ احترام سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں جو کچھ بھی اوپر کہا گیا ہے اس سے صرف اسی قدر ظاہر کرنا مقصودِ نظر تھا کہ صرف ایک ہی بیوی رکھنے والے کلیہ کے حامل مغرب کے موجودہ رویہ اور سرگرمیوں کے اندر شادی اور مرد و عورت کے جنسیاتی تعلقات کے بارے میں کس قدر غیر مذہبی و لادینی رجحان پایا جاتا ہے۔

الزام: زمانہ ماضی میں سچے اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کو جوا کھیلنے، شراب پینے خنزیر کا گوشت کھانے نیز قرضہ جات پر سود لینے سے منع کیا گیا تھا مگر اب ایسی قیود و پابندیوں کی گرفت آجکل کے آزاد خیال مسلمانوں کے درمیان ڈھیلی پڑ گئی ہے۔

جواب: اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں جس سے آزاد یا تنگ نظر مسلمانوں جیسی تفریق کے مزعومہ وجود کو ایک تسلیم شدہ امر مانا گیا ہو۔ ایک سچا مسلمان وہی ہو سکتا ہے۔ جو اسلام کے احکام و ہدایات (بہ الفاظ دیگر احکام و ہدایاتِ خداوندی) کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اپنے ذاتی مصلحت اندیشانہ و منافقانہ انداز میں نہیں بلکہ دیانت دارانہ اور وفادارانہ انداز میں اپنا لے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں مزعومہ آزاد خیال مسلمانوں کے ایسے مصلحت اندیشانہ و منافقانہ طرزِ عمل کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ اور وہ شخص جو بلا حیل و حجت اسلام کے بتلائے ہوئے راستے پر گامزن نہیں ہوتا۔ وہ خود

ہی اپنی ایسی خلاف ورزیوں کی حد تک ذمہ دار ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر ابتدائے پاکستان میں کچھ ایسے بھی غیر مسلم تھے جنھوں نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کے ساتھ وابستگی اختیار کر لی تھی اور مصلحت اندیشی کی بنا پر تبدیلیٔ مذہب کر کے داخل اسلام ہونے کا اعلان بھی کر دیا تھا اور اپنے نام بھی مسلمانوں کے سے رکھ لئے تھے۔ اس کے باوجود وہ اب بھی اپنے انداز فکر اپنے خورد و نوش اپنے مشروبات۔ اپنی عادات۔ اپنے افعال کے بارے میں اپنے اسی پرانے مکتب فکر کے جزو ہیں۔ ہمارے نزدیک عدل و انصاف اور ایمانداری کی بنیاد پر نہ تو ایسے اشخاص کو سچے مسلمان کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی سچے عیسائی۔

یہ ایک حقیقت نفس الامری ہے کہ مسلمان ہرگز ہرگز جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرستش تو نہیں کرتے مگر ان کو خدا کے کلام پاک کا پیغمبر اور رسول ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالےٰ کے بعد انتہائی مقام عزت و احترام کا حقدار تصور کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالےٰ اور صرف اللہ تعالےٰ ہی کی عبادت کرتے ہیں، کسی اور کی نہیں۔ اُن کی اللہ تعالےٰ کے ساتھ والہانہ محبت علاقائی۔ قومی۔ نسلی اور دنیوی انسیت و وابستگی کی حدود سے کہیں بالاتر ہے۔ جب تک وہ صحیح معنوں میں سچے مسلمان ہیں، وہ ہرگز ہرگز ایسے لوگوں کے ساتھ حقیقی۔ مکمل اور مستقل وابستگی۔ امن اور باہمی مشارکت کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتے۔ جو اللہ تعالیٰ کی ہستی کے قائل نہیں۔ بنا بریں بنیادی تصورات کا نتیجہ ہر ایک شخص پر لازماً واضح ہو جانا چاہیئے۔

یہ آج کہاں گم ہو گئے

جن لوگوں نے دنیاوی جاہ و حشم اور سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خاطر دنیا میں وسیع سلطنتیں قائم کر لیں اور اپنی حکومت کا لوہا دور دور تک منوایا۔ کیا دنیا میں اب بھی ان کی یاد باقی ہے۔ نپولین، ہٹلر، چرچل، روزولٹ اور سٹالن کو آج کتنے لوگ یاد کرتے ہیں۔ یہ بات تو روز روشن کی

طرح عیاں ہے کہ اس مادی دنیا میں نامور سے نامور اشخاص آتے ہیں، اپنے دنیاوی عروج پر پہنچتے ہیں، پھر ان کا زوال آتا ہے اور وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج بھلا دیئے جاتے ہیں اور ایک آدھ صدی گزرنے کے بعد تو بھولے سے ہی یاد آتے ہیں۔ بہت ہوا تو صرف ان لوگوں کا سالانہ دن بطور یادمنا لیا جاتا ہے۔ جن کے کسی فکر و نظریہ کی پیروی کرتے ہوئے کوئی نظام حکومت چلایا ہوتا ہے تاکہ ایسے نظام حکومت سے لوگوں کی نظریاتی وابستگی متعلقہ حکومت اور ملک کے لئے باعث تقویت بن سکے جو لوگ غور و فکر صحت مندانہ انداز میں کرتے ہیں، ان کو ماسوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام انسانی تاریخ میں ایسی والہانہ عقیدت و محبت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ پچھلے چودہ سو برس میں کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا کہ جس میں حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر دنیا کے کروڑوں عقیدتمند مسلمانوں نے دن میں کئی بار درود و سلام نہ بھیجا ہو۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اور اسی شدت اور عقیدت سے قیامت تک جاری رہے گا۔ اعداد و شمار کی اس ہمہ گیر حقیقت سے اگر موازنہ کر کے کچھ اخذ کیا جائے تو صرف یہی طریقہ سامنے آکر رہے گا کہ دنیا بھر کے ذہنوں کی ذہانت اور نامور دھوکہ بازوں کی دھوکہ بازی کو اگر یکجا کر دیا جائے تو شاید ہٹلر، نپولین یا ڈاکٹر فلپ جیسے اشخاص تو پیدا ہو سکتے ہوں، لیکن حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عالیشان مقام ہے جو صرف اللہ پاک کا ہی عطا کردہ ہے۔ انسانی معاملات اور عقل محدود ہوتے ہیں، اس لئے محدود سے محدود توقعات ہی وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی لامحدود حقیقت ظہور پذیر ہو تو اسکا واسطہ بھی صرف لامحدود ہی کی ذات سے کیا جاسکتا ہے اور لامحدود ذات تو صرف اللہ تعالےٰ جلّشانہ، ہی کی ہے جس نے یہ سب بزرگی و فضیلت جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خود عطا فرمائی ہے چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے نبی ہیں۔ اس لئے آپ کے گرد و نواح کے لوگ جو آپ کی سیرتِ مبارکہ اور کردار کو بخوبی جانتے تھے اور آپ کی صاف گوئی اور آپؐ کی دعوتِ حق سے پوری طرح مطمئن تھے اور پورا پورا ایمان رکھتے تھے۔ وہ تو اللہ کی راہ میں آپؐ کے ساتھ اپنا

سب کچھ قربان کرنے کے لئے پیش پیش رہتے تھے۔ انہوں نے آپ کے ساتھ کفار کی بہت اذیتیں برداشت کیں۔ مکہ معظمہ سے آپ کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے پر مجبور ہوئے یہاں تک کہ سب نے اپنے اپنے گھر کا تمام اثاثہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے پیش کیا اور بیشتر نے تو میدانِ جنگ میں اپنی جان کا نذرانہ اللہ تعالیٰ کو پیش کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ دنیا کی ساری تاریخ میں شاید ہی کسی ایسی جنگ کی مثال ملتی ہو کہ جس میں حصہ لینے والوں نے بغیر کسی مالی معاوضہ کے حصہ لیا ہو۔ اس مادہ پرست دنیا میں بمعہ ڈاکٹر فلپ۔ کے ہٹی اور اس کے ہم خیالوں کے سب بخوبی واقف ہیں کہ جتنی بڑی قربانی دینے کا خطرہ کسی شخص کو لاحق ہو گا۔ اتنا ہی زیادہ مالی معاوضہ وہ طلب کرے گا اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہمیشہ فوجی سپاہیوں کی تنخواہ باقی دوسرے ملازموں سے بالعموم زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام بلاشک وشبہ انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے اور لوگ اسے صرف سچا اور صحیح دین مان کر مسلمان ہوتے تھے نہ کہ کسی اقتصادی یا سیاسی غرض کی خاطر۔

ڈاردن کا نظریہ ارتقاء

جدید مغربی تہذیب کا ایک بہت بڑا ستون چارلس ڈاردن (CHARLES DARWIN) بھی ہے جس نے اپنے نظریات کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ بظاہر ڈاردن بائیولوجی (BIOLOGY) کا ایک انگریز سائنس دان ہے۔ جس کے نظریات کو اسی زمانے کے ایک فلاسفر ہربرٹ سپنسر (HERBERT SPENCER) نے انسانی تعلقاتِ عامہ (SOCIOLOGY) میں اپنایا ہے۔ ڈاردن نے جس وقت انسان میں، جانداروں میں اور پودے اور درختوں میں زندگی کے عمل کا بغور مشاہدہ کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ۔

۱۔ جس وقت انسان شروع میں زمین پر پیدا ہوا تو یہ جنگلوں میں رہتا تھا۔ پہاڑوں

کے غار اس کا گھر ہوتے تھے۔ درختوں کے پتوں سے یہ اپنا تن ڈھانپتا تھا۔ ڈارون کے نزدیک انسان جانوروں کی نسل میں سے ایک جانور ہے اور شکل وصورت اور عادات میں یہ بندر کی نسل میں سے ہے۔ البتہ زندگی میں ارتقاء کی منازل طے کرتے کرتے انسان اپنے تہذیب و تمدن کے موجودہ اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا ہے۔

۲۔ ارتقاء کا عمل ترقی پذیر ہے۔ زندگی کے اس عمل میں بڑی چیز چھوٹی چیز کو ہڑپ کر رہی ہے، بڑی طاقت چھوٹی طاقت کو مغلوب کر رہی ہے اور اس کو نیست و نابود کر رہی ہے۔ جیسے کہ سمندر میں بڑی مچھلی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو کھا جائے اور بڑی بڑی مچھلیوں کو ان سے بڑی ویل مچھلی کھا جائے یا جیسے کہ جنگل میں خرگوش کو بھیڑیا کھا جائے اور بھیڑیے کو شیر کھا جائے۔ چونکہ انسان بھی ارتقاء کی منزل طے کرتے ہوئے موجودہ تہذیب و تمدن کے مقام کو پہنچا ہے۔ اس لئے مغربی تہذیب و تمدن کی مخالفت کرنا ارتقاء کے ترقی پذیر اصول کے خلاف ہے۔ جو کہ ایک قانونِ قدرت ہے۔

۳۔ زندگی اپنے طور پر خود بخود قانونِ ارتقاء کے مطابق معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اور کوئی زندگی پیدا نہیں کرتا۔ قانونِ ارتقاء ڈارون کو اس وجہ سے صحیح لگتا ہے، کیونکہ اگر بڑی شے چھوٹی شے کو اپنے اندر ہڑپ نہ کرلے اور وہ اگر نادار و ضعیف ہونے کے باوجود زندہ رہ سکے تو نئی پیدا ہونے والی زندگی تعداد میں اس تیزی سے بڑھے گی کہ زندگی کا موجودہ نظام توازن درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور ارتقاء کے اس عمل کو ڈارون (SURVIVAL OF THE FITTEST) یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس سے تعبیر کرتا ہے اور اس کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔

مغربی تہذیب پر ڈارون کا گہرا اثر

ڈارون کے ان نظریات نے مغربی تہذیب کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ وہ اپنے مذہبی اور اخلاقی عقاید کو باطل و بے معنی سمجھتے

ہوئے بالکل مادہ پرست ہو کر رہ گئی ہے۔ طاقت ور کمزور کو ہڑپ کر جانے یا نیست و نابود کرنے کو اب جائز اور اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ موجودہ دور کا تعلیمیافتہ مسلمان بھی ڈارون کے اس نظریہ کا کسی نہ کسی حد تک اثر قبول کئے ہوئے دکھائی دیتا ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی خاطر اس نظریہ کا تجزیہ کیا جائے۔ ڈارون تقریباً" پونے دو سو سال پہلے اس دنیا میں آیا اور تقریباً" ۴۷ برس تک زندہ رہا۔ وہ جس حد تک زندگی کے عمل کو دیکھ سکا اور دیکھتے ہوئے سمجھ سکا۔ اس نے اپنے نظریہ میں بیان کر دیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا اور مائیکروسکوپ (MICROSCOPE) کے ذریعہ سے بھی دیکھا کہ بڑی شے چھوٹی شے کو یا طاقتور کمزور کو یا تو ہڑپ کر جاتا ہے یا پھر تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ پھر اس نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ نئی زندگی بہت تیزی سے وسیع پیمانے پر ظاہراً" خود بخود جنم لیتی ہے اور اگر بڑی شے چھوٹی اور کمزور شے کو ختم نہ کر دے تو دنیا کا نظام بہت جلد تعطل کا شکار ہو جائے۔ اس مشاہدہ سے ایک تو اس نے ارتقائے زندگی کا اصول اخذ کیا اور دوسرے (SURVIVAL OF THE FITTEST) یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کو اخذ کیا۔ ایک حد تک تو یہ نظریات درست لگتے ہیں لیکن کلیتاً" نہیں۔ کیونکہ وہ جس وقت یہ کہتا ہے کہ زندگی ارتقاء کے قانون کے مطابق خود بخود معرض وجود میں آتی ہے۔ وہ یہ اس لیے کہتا ہے کہ ظاہرہ زندگی کے عمل میں دیکھنے میں کچھ ایسا ہی آتا ہے۔ وہ طاقت کو اور اس کے عمل پذیر ہونے کو ظاہرہ طور پر دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس لئے یہ طاقت اس کے ادراک اور نظریہ کے بیان سے باہر ہے۔ وہ شاید اس معاملہ میں بے خبر ہے یا بھولا ہوا ہے کہ نیوٹن کے قانون حرکت کے مطابق کوئی چیز اپنی ہیئت شکل و صورت، اپنی سکونت یا رفتار اس وقت تک نہیں بدلتی بلکہ جوں کی توں پہلی حالت پر برقرار رہتی ہے۔ جب تک کہ کوئی دوسری طاقت خاطر خواہ انداز میں اس پر اثر پذیر نہ ہو جس کی وجہ سے اس کی

پہلی حالت میں تبدیلی رونما ہو۔ اس سے ثابت ہوا کہ زندگی کے عمل کا آغاز اور اس کا ارتقاء اس طاقت کے مرہون منت ہے جس کو ڈارون نہ تو دیکھ رہا ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کرتے ہوئے اسے بیان کر رہا ہے۔

ڈارون کہاں غلط ہے

دوسرے ڈارون یہ بھی کہتا ہے کہ ارتقاء کا عمل بذاتِ خود ایک قانونِ قدرت ہے۔ جس کے تحت تیزی سے پیدا ہونے والی نئی کمزور زندگی کا خاتمہ نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر دنیا کا نظام زندگی زیادہ دیر چل نہیں سکتا۔ یہاں بھی ڈارون یہ اخذ کرنے سے بھر قاصر ہے کہ یہ کون سی قوت اور طاقت ہے جو زندگی کے ارتقاء کے عمل کو جاری رکھنے کے لئے طاقتور سے کمزور نئی زندگی کا خاتمہ کرا رہی ہے تاکہ اس طاقت کا نظام زندگی کامیابی سے چل سکے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ زندگی کا عمل انتہائی حد تک مکمل اور قانونِ قدرت کے تابع ہے۔ یہاں تک کہ اس میں ذرا سا بھی رخنہ کسی جگہ پڑ جائے تو زندگی کا عمل بہت بری طرح بگڑ سکتا ہے بلکہ سرے سے ختم بھی ہو سکتا ہے۔ جس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس نظام زندگی کو قائم رکھنے والی اور چلانے والی ایک باشعور زبردست طاقت کارفرما ہے۔ اگر کسی کو اس بات کی صحت میں کوئی شک ہو تو وہ ماہرینِ طب سے انسانی جسم اور اس میں زندگی کے عمل کے بارے میں دریافت کرے۔ ماہرین علم طب بھی اپنی لائن میں سائنس دان ہی ہوتے ہیں۔ وہ بتائیں گے کہ کیا انسانی زندگی کے ارتقاء کے عمل میں کوئی بیرونی طاقت کارفرما ہوتی ہے کہ نہیں۔ میرے خیال میں جتنی مسلسل اور پیہم کوشش علم طب کے سائنسدانوں نے انسانی جسم کے عمل کو اور اس میں واقع ہونے والے تغیر و تبدل کو سمجھنے کے لئے کی ہے۔ وہ کسی اور شعبہ کے سائنسدانوں نے نہیں کی۔ لیکن اس تمام تحقیق کا ابھی تک وہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ جتنی کہ اس سلسلہ میں کاوش کی گئی ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حالات میں اس وقت تک کسی قسم کی تبدیلی اپنے طور پر ظہور

پذیر نہیں ہوتی۔ جب تک کہ کوئی موثر بیرونی طاقت اثر پذیر نہ ہو۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ دیکھنے والا اس طاقت کا مشاہدہ یا ادراک کرنے سے قاصر ہو اور اس وجہ سے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ یہ طاقت کیا ہے۔ کتنی ہے، کس کی ہے اور کس انداز میں کارفرما ہے۔

ڈارون نے جو یہ بھی کہا ہے کہ ہر تبدیلی جو ارتقاء زندگی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے اسے صرف ترقی پذیر ہونے کی ہی علامت سمجھا جائے اور اس وجہ سے موجودہ مغربی تہذیب کو ارتقاء زندگی کا عمل سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت ترک کر دی جائے۔ یہ بات بھی تجزیہ کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتی اور اس مقام پر یہ شک گزرتا ہے کہ کیا ڈارون بائیولوجی کا ایک ممتاز سائنسدان تھا یا کہ ایک سیاست دان جو اپنی سائنسی نظریات کا سہارا لے کر موجودہ مغربی تہذیب کو دنیا میں کسی بہانے، مقبول کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ارتقاء زندگی کے عمل کے طور پر جو تبدیلی ظہور پذیر ہوتی ہو، وہ اچھی ہو اور اسے ترقی پذیر عمل کے نام سے تعبیر کیا جا سکے۔ اگر یہ بات واقعی درست ہو تو پھر عالمی جنگ جو ۱۹۳۹ء میں شروع ہوئی تھی تو اس وقت پھر جرمنی، فرانس، برطانیہ، امریکہ اور روس وغیرہ کو اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے تھی بلکہ اس کو ڈارون کے قول کے مطابق ترقی سمجھتے ہوئے قبول کر لینا چاہیئے تھا اور یہ بات بھی کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ اس جنگ میں جو تباہی و بربادی ہوئی، اس کے اثرات ابھی تک نوع انسانی پر موجود ہیں اور جو کچھ اس عالمی جنگ کی بدولت انسانوں کو ملا وہ باقی شاید سب کچھ ہو، بھوک و افلاس ہو یا موت ہو۔ بہر حال نوع انسانی کی ترقی نہیں تھا اور اسکو ترقی کہنے پر اصرار کرنا ایک ذہنی دیوالیہ پن کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا جا سکتا اور پھر یہ دلیل کہ چونکہ ارتقاء کا عمل ترقی پذیر ہوتا ہے، اس کی مخالفت نہیں کرنی چاہیئے، یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس کے بغیر ارتقاء کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ مخالفت بھی تو عمل ارتقاء میں زندگی کی بقاء کے لئے ایک جدوجہد کی حیثیت رکھتی ہے۔ جسے ڈارون نے جس کی لاٹھی اس کی بھینس کی کیفیت سے خود ہی تعبیر کیا ہے۔

عملِ ارتقاء سے دین ثابت ہے

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ زندگی کے ارتقاء کا عمل خود بخود واقع نہیں ہو رہا بلکہ اس ارتقاء کے عمل کے پیچھے ایک واضح طاقت کارفرما ہے اور جس وقت یہ دنیا اور باقی تمام کائنات معرضِ وجود میں آئی اور سورج، چاند، زمین اور دوسرے تمام سیاروں نے اپنے محور کے گرد گھومنا شروع کیا تو یہ سب عمل بغیر طاقت کے ظہور پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ طاقت کس کی ہے؟ کون اسے استعمال کر رہا ہے اور کس انداز میں کر رہا ہے تو مسلمان بھائیوں کو اس کے سوا اور کوئی خاطر خواہ جواب نہیں مل سکے گا کہ یہ صرف اللہ پاک ہی کی ذات ہے جسے یہ تمام قدرت و طاقت حاصل ہے کہ وہ تمام قانونِ قدرت بھی بنائے اور زندگی کے ارتقاء کا عمل بھی پیدا کرے۔ انسان کو ہوا میں سے سانس کے ذریعہ آکسیجن پہنچائے اور جو کاربن ڈائی آکسائڈ انسان اپنے سانس کے ذریعہ خارج کرے اسے درختوں اور پودوں کی خوراک بنا دے اور اس کے بدلے ان سے آکسیجن وصول کر کے انسان کی زندگی کے لئے اُسے آکسیجن مہیا کرے۔ یہ سب کرشمے صرف اسی ذاتِ اعلیٰ کے ہیں جو کہ قادرِ مطلق ہے، سب سے دانا ہے اور سب سے زیادہ علم رکھنے والی ہے۔ SURVIVAL OF THE FITTEST کا اگر تجزیہ کیا جائے تو (FITTEST) کے معنی ہوں گے سب سے موزوں ترین یا سب سے طاقتور اور SURVIVAL OF THE FITTEST کے پورے جملہ کے معنی ہوں گے کہ سب سے موزوں ترین کی بقاء یا سب سے طاقتور کی بقاء۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سب سے طاقتور وہ کون ہے۔ جسے بقاء حاصل ہے۔ وہ تو صرف اللہ پاک ہی کی ذات ہے اور جس وقت زندگی کے ارتقاء کا عمل اپنی انتہا کو پہنچے گا تو اس کے بعد زندگی کے ارتقاء کے عمل کے مزید جاری رہنے کی کوئی مزید گنجائش نہیں رہے گی۔ یعنی سب سے طاقتور باقی سب چھوٹی طاقتوں کو ختم کر دے گا اور یہ سب سے طاقتور ذات حق تعالیٰ کی ہو گی اور

جس دن ارتقاء کا عمل مکمل ہوگا۔ وہ روزِ قیامت ہوگا۔ مناسب ہے کہ اس مقام پہ پہنچ کر اب دین اور ڈارون کے مسئلے کو ختم کر دیا جائے۔

کارل مارکس کا نظریہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے تھوڑا سا ذکر کارل مارکس کے نظریہ کا بھی کر دیا جائے۔ کارل مارکس مغربی جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس کے زمانہ میں جرمنی صنعتی ترقی کے عروج پر تھا۔ اس نے دیکھا کہ لاکھوں مزدور دن رات فیکٹریوں میں جا کر کام کرتے ہیں۔ لیکن ان بیچاروں کو مناسب اجرت نہیں ملتی اور کارخانہ دار تمام دولت سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور صرف اپنی تجوریاں بھرتے ہیں۔ لیکن غریب مزدور کی فلاح و بہبود پر کم ہی خرچ کرتے ہیں۔ اس صورتحال سے وہ بے حد متاثر ہوا اور غریب مزدوروں کا انکے ہاتھوں اس بری طرح سے ہونے والے استحصال کو وہ برداشت نہ کر سکا اور اس نے مزدوروں کو اس استحصال سے بچانے کے لئے ان میں شعور پیدا کرنے کے لئے انہیں یہ نظریہ دیا کہ کسی ملک میں اصل طاقت کا سرچشمہ صرف مزدور ہیں کیونکہ اگر وہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے مزدوری نہ کریں تو تمام فیکٹریوں کی مشینیں چلنا بند ہو جائیں گی اور سرمایہ دار کی دولت پیدا ہونا بند ہو جائے گی چنانچہ اس نظریہ کے تحت مزدور منظم ہونا شروع ہو گئے اور انہوں نے اپنے جائز حقوق کے حصول کے لئے کامیابی کے ساتھ جدوجہد شروع کر دی۔ اس نظریہ کو پہلے لینن نے روس میں اپنایا اور بعد میں ماؤزے تنگ نے چین میں۔

سوشلزم میں استحصال کی حقیقت

کارل مارکس کا یہ مادی نظریہ بظاہر بہت مناسب اور بھلا لگتا ہے۔

اصل میں ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس نظریہ کے حامل لوگ اصولی طور پہ استحصال کے خلاف عمل پیرا ہوتے اور کسی قسم کا استحصال ہرگز برداشت نہ کرتے لیکن مشاہدہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ایسا ہوا نہیں۔ اس نظریہ نے مزدور میں سرمایہ دار کے خلاف تعصب پیدا کیا اور اس کو

اکسایا کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کیلئے اب سرمایہ دار کا استحصال کرے بلکہ مشاہدہ تو یہاں تک بھی ہوا ہے کہ اس نظریہ کا حامی غریب اب بھی غریب کا استحصال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ دودھ بیچنے والا دودھ میں پانی ملا کر اپنے غریب ساتھی کا جو دودھ کا خریدار ہے، بری طرح سے استحصال کرتا ہے۔ پرچون فروش خوردنی اشیاء میں ملاوٹ کر کے غریبوں کا استحصال کرتا ہے۔ رکشہ ڈرائیور اپنے میٹر کو تیز چلا کر استحصال کر رہا ہے دکاندار کم تول کر استحصال کر رہا ہے۔ بلکہ ہر جھوٹ بولنے والا شخص دوسرے کو دھوکہ دے کر اسکا استحصال کر رہا ہے اور یہ استحصال تو اتنا ہمہ گیر ہے کہ شاید کوئی خوش نصیب ایسا ہو جو اس کی زد میں نہ آیا ہو اور اس بڑھتے ہوئے استحصال کی وجہ یہ ہے کہ کارل مارکس کا نظریہ صرف مادی نوعیت کا ہے۔ وہ اخلاقی پہلو سے استحصال کی نہ مذمت کرتا ہے اور نہ ہی روک تھام۔ اس لئے استحصال کے مؤثر خاتمہ کے لئے صرف وہ نظریہ ہی کامیاب ہو سکتا تھا جو مادی ہونے کے ساتھ ساتھ اسی شدت سے اخلاقی بھی ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں کسی فلاسفر نے زندگی کا ایسا کوئی نظریہ نہیں دیا جو مادی بھی ہو اور اخلاقی بھی البتہ یہ ضرورت صرف اسلام ہی بڑے احسن طریقے سے پوری کرتا ہے۔ کیونکہ جہاں ہمارا دین ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو۔ وہاں وہ یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنا مال و دولت فراخدلی سے خرچ کرو۔ بیواؤں، یتیموں، مسکینوں غریبوں، ناداروں اور مسافروں سب کی مناسب مالی مدد کرو۔ ان کو اگر ضرورت ہو تو کھانا کھلاؤ پہننے کے لئے کپڑے مہیا کرو وغیرہ وغیرہ اور پھر ہمارا دین ہمیں جھوٹ بولنے اور لوگوں کو دھوکہ دینے سے سختی سے منع کرتا ہے اور اس طرح اس سلسلہ میں بھی نوع انسانی کی نجات صرف اللہ ہی کے دین میں نظر آ رہی ہے۔ البتہ اگر موجودہ دور کے مسلمان ابھی تک جھوٹ بولتے ہیں، ایک دوسرے کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور غریبوں، مسکینوں کی مناسب امداد پر آمادہ ہوتے نظر نہیں آتے تو یہ قصور دین کا نہیں بلکہ ہمارا ہے کیونکہ ہم اسلام پر سختی

سے کاربند نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ سے ہم مادی اور اخلاقی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہیں ہم اسلام سے اپنی وابستگی کا کھلے بندوں اظہار کرتے ہوئے قطعاً نہیں جھکتے اور جب اپنے ذاتی مفادات اسلام کی زد میں آتے دیکھتے ہیں تو اپنے دین سے روگردانی کرتے ہوئے ہچکچاتے بھی نہیں ہمارے بعض علمائے دین جو مسلمانوں کی دینی رہنمائی کے منصب پر خود کو فائز کئے ہوئے ہیں۔ وہ چند ہزار روپوں کے لالچ میں اپنے ضمیر اور اپنے اسلام دونوں کا اغیار کے ساتھ سودا کر لیتے ہیں اور یہ صورتِ حال ایسی ہے جس کے متعلق اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اس طرح مومنوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کسی اور کو دھوکہ نہیں دیتے بلکہ اپنے آپ کو ہی دھوکہ دیتے ہیں اور اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں کیونکہ خدا کو تو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے ہمارے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے دین سے وابستگی صرف زبانی جمع خرچ کی حد تک ہی نہ رکھیں بلکہ اپنے اسلامی نظریات کی تطہیر کرتے ہوئے اپنے اعمال کو عین دین کے مطابق بنانے کی کوشش صدق دلی سے کریں۔

ڈاکٹر فرائی کی اسلام دشمنی

مغربی مفکر اپنے ہاتھ سے ایک منظم مہم کے تحت کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جس کے ذریعے وہ ہمارے دین پر رکیک حملے نہ کریں ویسے تو اسلام پر یہ حملے ہر مملکت میں گاہے گاہے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اس بار شیراز یونیورسٹی کے مشہور امریکی مستشرق پروفیسر ڈاکٹر رچرڈ نیلسن فرائی جو لاہور میں حال ہی میں شامِ ہمدرد کی ایک تقریب میں مہمانِ خصوصی تھے کا موضوع تھا۔ "پاکستان میں اسلام کا ورود" پروفیسر فرائی اپنی تقریر میں یہ کہتے ہوئے کہ میں نہ تو ڈپلومیٹ ہوں اور نہ کوئی سیاسی شخصیت اسلام پر برس پڑے اور بہانہ یہ بنایا کہ میں تو صرف سچ بولنے آیا ہوں۔ اس پر مخالفینِ اسلام نے تالیاں بجائیں، قہقہے لگائے اور اس پس منظر میں پروفیسر فرائی نے الزام لگایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے عہدِ حکومت میں لوگوں کو مسلمان کرنے سے روکا کیونکہ لوگ مسلمان ہونے کے بعد جزیہ نہیں دیتے

تھے اور اس طرح خزانہ پر اثر پڑتا تھا۔ پروفیسر فرائی نے یہاں تک کہہ دیا کہ عمر بن عبدالعزیز اسلام کی کالی بھیڑ تھے اور یہ سب کچھ اسلامی مملکتِ پاکستان کے عظیم شہر لاہور میں دن دہاڑے ہوا جس کا علم ہمارے علمائے دین کو قطعاً نہ ہوا۔ البتہ جناب مسرت حسین زبیری سیکرٹری جنرل آر سی ڈی جو جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ وہ ان الزام تراشیوں پر خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے پروفیسر فرائی کے تمام الزامات کو جھٹلایا اور جب پروفیسر فرائی سے اس ضمن میں متعدد سوالات کئے گئے تو وہ اپنا سچ بولنا بالکل بھول گئے اور انہوں نے سوالات کا گول مول جواب دے کر راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی اپنی بہتری جانی۔ اس طرح اسلام کو ماڈرن تہذیب کے دلدادہ مسلمانوں کی محفل میں رسوا کرنے کی جو پروفیسر فرائی نے کوشش کی تھی۔ وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن سوچنے کا مقام یہ ہے کہ اگر مسرت حسین زبیری صاحب کو اپنے دین کی معلومات نہ ہوتیں اور وہ پروفیسر فرائی کو جھٹلا نہ سکتے تو ہمارے نوجوان ذہن تو پروفیسر فرائی سے متاثر ہو کر اسلام سے بیزار ہو کر اس محفل سے رخصت ہوتے کیونکہ اس محفل میں ہمارے علمائے دین میں سے غالباً کوئی موجود نہ تھا۔ شاید اس لئے کہ ہمارے بیشتر علمائے دین کو آپس کے دینی اختلافات سے یا تو فرصت نہیں یا پھر وہ جان بوجھ کر غیر مسلموں کی یلغار کو صبر و تحمل سے برداشت کر جاتے ہیں۔ وہ نہ تو ان کی مذموم یلغار کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے مسلمانوں کی مناسب دینی رہنمائی کے فرائض ادا کرتے ہیں۔ مجھے نہایت معذرت کے ساتھ ان تلخ حقیقتوں کی طرف اشارہ کرنا پڑ رہا ہے تا کہ ہمارے علمائے دین کو یہ احساس ہو جائے کہ موجودہ حالات کے تحت مسلمانوں کا اپنے معزز علمائے دین سے کیا تقاضا ہے اور ان سے کیا توقعات وابستہ ہیں اور وہ دین کی خدمت کی کسوٹی کیسی خدمت کو سمجھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میں اپنے علمائے دین کی خصوصی توجہ قرآن پاک کی اس آیت مبارکہ کی طرف دلاتا ہوں۔ جس میں اللہ تعالیٰ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ذمہ یہ فرض عائد کرتا ہے کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت

کے بارے میں شہادت دیں گے کہ انہوں نے اللہ کا پیغام حق اپنی امت کو پہنچا دیا۔ وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی لوگوں پر شہادت دیں گے۔ قرآن پاک میں جس شہادت یا گواہی کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ وہ گواہی اس بارے میں ہے کہ اللہ پاک کے دینِ حق کا پیغام اس کے لوگوں کو پہنچانا ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے اگر ہمارے علمائے دین اس طرف مناسب توجہ دیں اور لوگوں یعنی غیر مسلموں میں اسلام کے خلاف جو دروغ گوئی اور الزام تراشی سے زہر اگلا جا رہا ہے۔ وہ نہ صرف اس کے اثرات کو زائل کریں بلکہ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا فرض بھی ادا کریں۔ اللہ پاک سورہ البقرہ میں یوں ارشاد فرماتا ہے "ہم نے اسی طرح تمہیں بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہو جائیں"

دینی بھائیوں کا دل دکھانا مقصود نہیں

راقم اس مقام پر ایک بار پھر نہایت معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہے کہ اس کا ہرگز ایک لمحہ کے لئے بھی یہ مقصد نہیں کہ وہ اپنے معزز علمائے دین کی اور اپنے مسلمان بھائیوں کی کسی انداز میں رتی بھر بھی دل آزاری کرے اس کا واحد مقصد تو صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی نیک نیتی کے ساتھ اپنی محدود دانست و بصیرت کے مطابق وہ سب کچھ اپنے مسلمان بھائیوں کے گوش گزار کرے جو بحیثیت مسلمان ان کے زوال کا باعث اسے محسوس ہوتا ہے تاکہ صورتِ حال کی مناسب اصلاح سے اسلام کی کچھ حقیر سی خدمت کا سبب بن سکے۔ اس لئے جو علمائے دین اور مسلمان بھائی اس تجزیہ کی زد سے باہر ہیں اور انکی زندگی انکے پیارے دین کے تقاضوں کے مطابق ہے اور وہ اس سے پوری طرح مطمئن ہیں، وہ نہ صرف راقم کے پورے ادب و احترام کے مستحق ہیں، بلکہ اس کی مبارکباد کے بھی اور یہ فیصلہ کرنا کہ وہ واقعی اپنے دین پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہیں یا تو خود ان کے اپنے ہی ذمہ ہے یا پھر اللہ عزوجل کے دائرہ اختیار میں۔ راقم نے یہ جائزہ

کسی خاص مسلمان فرد یا جماعت کو مدِ نظر رکھ کر نہیں لکھا، بلکہ اس کی حیثیت ہر لحاظ سے عمومی یا مجموعی ہے تاکہ مسلمانوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کر کے ایک سلجھے ہوئے مدلل انداز میں ان کی علمی سطح کے مطابق ان میں اپنے دین سے رغبت اور وابستگی پیدا کی جائے اور یہ مقصد صرف اسی حالت میں کسی حد تک پورا ہو سکتا ہے اگر قارئین حضرات کے جذبات و احساسات کا پورا پورا خیال رکھا جائے اور ان کا واجب احترام بھی کیا جائے اس لئے راقم عرض گو ہے کہ اگر اس تجزیہ کے کسی لفظ یا کسی حصہ سے کسی بھائی کو اعتراض ہو یا تکلیف ہو یا ناگوار گذرا ہو تو راقم کو فراخدلی سے معاف کر دیا جائے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی سے اختلاف کر سکتا ہے۔ لیکن تفرقہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کے جذبات کو کسی طرح ٹھیس پہنچانے کے متعلق سوچ سکتا ہے۔

انسان کے نفسیاتی تقاضے

ظاہری سی بات ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی یا قید کو برداشت کرنا نہیں چاہتا۔ چاہے یہ پابندی قانونِ قدرت کے تحت لگائی جائے یا انسان کے اخلاقی یا مذہبی تقاضوں کے تحت ہو۔ چونکہ قانونِ قدرت کی لگائی ہوئی پابندیوں کو توڑنا اور ان سے رہائی پانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے اس کی فکر اس حد تک تو ناکام رہی البتہ اس نے سماج کی اخلاقی و مذہبی پابندیوں کو اپنی عقل کی بساط پر توڑنے کی راہ نکالی چنانچہ مغربی فکر اخلاقی و مذہبی پابندیوں کی تضحیک کرتی ہوئی اسے دور لے گئی اور اس نئی فکر نے انسان کو اس بری طرح مادہ پرستی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ مغربی فکر نے اسے حرص و ہوس کا غلام بنا دیا ہے۔ وہ اپنی جنسی خواہشات کا غلام بن گیا ہے۔ اس کے جذبات کی شدت اس پر غالب آجاتی ہے۔ دوسرے شخص کو زندہ رہنے کا حق دینے کے لئے وہ آمادہ نظر نہیں آتا۔ اپنی خود غرضی کے عالم میں وہ دوسرے کو قطعاً برداشت کرنے کو تیار نہیں، صرف ایک دو روپوں کی خاطر وہ اپنے بظاہر دوست

کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ معمولی معمولی باتوں پر بیٹا ماں کو بھائی بہن کو اور دوست دوست کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور اس طرح اپنے نفس کی آزادی کے حصول کی خاطر بھاری قیمت ادا کر رہا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ دور کا انسان اب پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے اپنے نفس میں قید ہو گیا ہے ایسی کیفیت کو کسی قسم کی آزادی سے تعبیر کرنا میرے نزدیک صحیح آزادی کے مفہوم کی توہین ہے۔ اس لئے کہ صحیح آزادی وہ ہے جس میں واقعی انفرادی، جسمانی، فکری اور نفسیاتی آزادی کا حصول ہو اور اس کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اصلاح کا پہلو بھی پیدا ہوتا ہو۔ لیکن یہاں تو اب دونوں انداز میں معاملہ بالکل الٹا ہی نظر آتا ہے۔ آپ خود ہی ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا صحیح آزادی کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ انسان کو اس کے ذریعہ سے ضروری جسمانی اور ذہنی سکون نصیب ہو اور وہ نسبتاً خوشی کے ماحول میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گزار سکے۔ کیا موجودہ مغربی فکر نے انسان کو یہ سب کچھ عطا کیا ہے یا اس سے یہ سب کچھ اس کی بدولت چھین لیا گیا ہے۔ اگر آپ حقیقت کی تہ کو پہنچنا چاہتے ہوں تو ماہرین اعداد و شمار کی خدمات حاصل کیجئے۔ وہ آپ کو بتائیں گے کہ دنیا میں آج پہلے کی نسبت کتنی زیادہ بڑھتی ہوئی مقدار میں مغرب کے لوگ خصوصاً اور دوسرے عموماً نشہ آور گولیاں ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے استعمال کر کے خود کو نیم بے ہوشی کے عالم میں رکھنے پر مجبور ہیں تاکہ مادی تفکرات ان کی زندگی کو مزید اجیرن نہ بنا سکیں۔ ان گولیوں کو انگریزی زبان میں (SLEEPING PILLS) کہا جاتا ہے اور پہلے کی نسبت اب دماغی امراض کے ہسپتالوں میں ذہنی مریضوں کی تعداد ان ملکوں میں کس قدر بڑھ گئی ہے جو اپنے اخلاقی اور مذہبی تقاضوں کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ شاید آپ پر میری بات کا خاطر خواہ اثر نہ ہو۔ اسلئے آپ خود ہی ان ماہرین اعداد و شمار سے اس ضمن میں دریافت کر لیں کہ ان بھیانک حد تک بڑھتے ہوئے اعداد شمار کی گوناگوں اہمیت کیا ہے اور یہ کس بات

کی نشاندہی کر رہی ہے اور اس طرح آپ خود کو مطمئن کر لیجیے۔

انسان کی تہذیب کے نام پر خود فریبی

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مغربی فکر نے ہماری دینی اساس پر گہری ضرب لگائی ہے ہم تہذیب اور جدید دور کے نام پر اس کے فریب میں پھنس گئے کیونکہ ہمیں اپنے دینی حقائق پر خاطر خواہ عبور حاصل نہ تھا۔ جہاں تک مغربی تہذیب کا تعلق ہے۔ اس کا ذکر و تجزیہ کافی حد تک اس کتاب میں پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک جدید دور کا تعلق ہے تو میرے نزدیک اس نام کی کوئی چیز معرضِ وجود میں نہیں آئی۔ اپنے لئے جدید دور کے الفاظ مخصوص کر لینا خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں یہ کوئی ایسا خوبصورت پر نہیں جو صرف ہم ہی اپنی ٹوپی میں سجا سکتے ہیں۔ ہمیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہر دور کا انسان اپنے دور میں جدید ہی ہوتا ہے۔ اگر ہم جدید ہونے پر فخر محسوس کر سکتے ہیں تو ایسا ہر دور کا انسان جب سے کہ دنیا معرضِ وجود میں آئی ہے کر سکتا ہے تو پھر یہ شیخی اور گھمنڈ کیسا۔ ہمارے بہت سے مسلمان جہاں جدید یا ماڈرن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، وہاں وہ اسلام سے وابستگی کا دم بھی بھرتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنے تقاضوں کے تحت اسلام کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے تاکہ اسلام ان کے لئے قابلِ قبول اور پسندیدہ ہو چنانچہ انہوں نے دیکھا کہ اسلام میں "سود" گناہ ہے تو انہوں نے سود کے لفظ کو بدل کر اس کی جگہ "منافع" کا لفظ لگا دیا اور اپنی کوتاہ نظری سے سمجھا کہ معاملہ اب درست ہو گیا۔ اس قسم کے حربوں سے انسان انسان کو تو شاید مطمئن کر سکتا ہو لیکن انسان اللہ پاک کو تو کسی بہانے یا انداز میں دھوکہ نہیں دے سکتا کیونکہ اس کے نزدیک نہ جدید ہونا قابلِ فخر ہے نہ قدیم ہونا قابلِ شرم یا مذمت۔ خود باری تعالیٰ کی ذات عالی شان سب سے قدیم ہے اتنی قدیم کہ اس کی انتہا نہیں اور قانونِ قدرت بھی بے انتہا قدیم۔ کیا آج کے انسان کو شروع کے دور کے انسان کی طرح بھوک نہیں لگتی، پیاس نہیں لگتی۔ کیا پہلے کے انسان کو سانس لینے کے لئے آکسیجن کی ضرورت

تھی۔ لیکن جدید انسان کو اب سانس کے لئے آکسیجن کی ضرورت باقی نہیں رہی بلکہ کاربن ڈائی آکسائڈ نے آکسیجن کی جگہ لے لی ہے۔ یاد رکھیں کہ آج بھی انسان کے جسم کی نشوونما کے لئے ان ہی چیزوں کی پابندی لازمی ہے۔ جو آج سے ہزاروں لاکھوں برس پہلے کے انسان کو تھی۔ اور اس کے جذبات و احساسات اور فکر بھی آج کے انسان ہی کی طرح اس کا احاطہ کئے ہوئے تھی لہٰذا ہم اگر جدید ہیں تو اتنے ہی قدیم بھی ہیں۔ ہم اپنے قدیم ہونے سے انحراف نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنے کی سعی کرنا ایک بہت بڑی خود فریبی کے مترادف ہے۔ جس سے سوائے نقصان کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ہم دین کو کس انداز میں لچکدار اور جدید بنانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ اللہ پاک اب بھی وہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہی ہیں۔ قرآن مجید بھی وہی ہے اور اللہ تعالٰے کے احکامات بھی وہی ہیں۔ ان سب میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہیں آئی۔ اس لئے یہاں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا ہم اپنے دین کو اپنی خواہشات اور تقاضوں کے تابع کر کے ان کی خدمت و حصول کے لئے ڈھالنا چاہتے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ہم اپنی فکر کی گمراہی کے اندھیرے میں بری طرح بھٹک رہے ہیں لیکن اگر ہم خود کو اللہ پاک کے تابع رکھنا چاہتے ہیں اور اس کو سجدہ کرنا اپنا فرضِ اولیں سمجھتے ہیں تو ہمیں اپنی فکر کے اس واضح تضاد کو ختم کر کے سجدہ اس طرح کرنا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ اے اللہ میں تمام تر اپنی جسمانی اور ذہنی کیفیت کے ساتھ تیرے حضور جھک گیا۔ سرِ تسلیم مکمل طور پر خم کر دیا اور تیرے صادر کئے ہوئے احکامات کی پابندی اپنے اوپر لازم کی اور اپنے قول و فعل کے تضاد کو ختم کیا۔ دین کے ساتھ اس سے زیادہ مذاق اور زیادتی کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی اللہ پر ایمان رکھنے اور مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرے۔ کبھی کبھی اللہ کو سجدہ بھی کرے لیکن اپنی روزمرہ کی زندگی میں اگر شراب پی لے یا جوا کھیل لے یا رشوت لے لے یا کسی کو دھوکہ دے کر اس کے مال و دولت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہ سمجھے۔ ایسا شخص نہ

صرف ان گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ وہ اس طرح غلط اثر پھیلا کر اسلامی معاشرہ کے تصور کو بگاڑنے کا سبب بھی بنتا ہے اور جو شخص اللہ کے دین کو بگاڑنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش کرے یا اس کی مخالفت کرے تو وہ اللہ اور اس کے دین کے دشمن کے سوا اور کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی مصلحتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہماری طرح اصولوں سے سمجھوتہ کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ ہماری طرح بے بسی و لاچاری کی حالت میں دوسروں سے بعض مفادات حاصل کرنے کے لئے خوشامد و چاپلوسی کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ تو قادرِ مطلق ہے۔ دو ٹوک حکم دینا جانتا ہے اور اسی شدت سے حکم کی تعمیل کا تقاضا بھی کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ پاک کا حکم منوانے کا اس شدت سے تقاضے کا انداز بعضوں کو ناگوار ہو۔ ہو سکتا ہے بعض تہذیب کا سہارا لے کر احتجاج کرنا چاہیں۔ یہ تو اللہ جل شانہ، کی طاقت کا معاملہ ہے۔ انسانی طاقت جو اس کی طاقت کے مقابلہ میں بالکل ہیچ ہے۔ وہ ہی آپے میں نہیں رہتی۔ اس نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم کے ذریعے اپنا مظاہرہ کر کے تہذیب کا جنازہ نکال دیا تھا اور آج تک جتنے ایٹم اور ہائیڈروجن بم بنے ہیں۔ وہ سب اس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ آئندہ کے میدانِ جنگ انسانی درندگی اور وحشی پن کی علامت ہوں گے اور انسان کی خود ساختہ تہذیب کی دھجیاں اڑتی نظر آئیں گی۔ ہم نے صرف دنیاوی وسائل کی دستیابی اور فراوانی کو ہی اللہ کے فضل سے منسوب کیا ہے۔ ہم یہ بالکل ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ہم یہ دنیاوی وسائل کن طریقوں سے حاصل کرتے ہیں وہ حلال ہیں یا حرام۔ ہم یہ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کرنا چاہتے کہ اللہ پاک واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ جو دنیا کی زندگی اور اس کے مال و دولت کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے وہ سراسر خسارے میں ہے۔ اسی طرح ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جو مسلمان اس دنیا میں بظاہر کسی دکھ یا تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو وہ صرف اپنے گناہوں ہی کی پاداش میں گرفت میں آتا ہے اور

ہمارے ذہن میں نہیں آتا کہ اللہ اپنے مومن بندے کو ضرور آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اس کا امتحان لیتا ہے اور جو امتحانات میں پاس ہوتا جاتا ہے۔ اس کے درجے بلند کرتا جاتا ہے کیونکہ خود ارشاد ربانی ہے کہ یہ تم نے کیسے گمان کر لیا کہ تم جنت میں داخل کر دیئے جاؤ گے ابھی تو اللہ نے تمہیں آزمایا ہی نہیں۔ اس نے تو اس طرح تم سے پہلے لوگوں کو بھی آزمایا تھا اور اگر ہم انبیاء علیہم السلام کی زندگی کا اس پہلو سے جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ پاک نے جس اعلیٰ ترین درجے پر انہیں فائز کیا اسی کے مطابق انہوں نے اس دنیا میں بظاہر جسمانی تکالیف اور صعوبتیں جھیلیں اور برداشت کیں۔ اس لئے اللہ سے لگاؤ رکھنے والا اس کا بندہ دنیا کے دکھ درد سے نہیں گھبراتا خندہ پیشانی سے اسے برداشت کرتا اور صبر کرتا ہے اور جو مسلمان اللہ کے فضل و کرم کو ماپنے کا پیمانہ صرف اسی دنیا کے مال و دولت اور عیش و آرام کو ہی سمجھتے ہیں اور صرف اسی کے لئے زیادہ تر سعی کرتے ہیں۔ وہ سراسر غلط فہمی کا شکار ہیں۔

دین میں صحیح مسلمان کا تصور

مسلمانوں کے لئے صحیح اسلامی کیفیت تو یہی ہے کہ ان کا اللہ پر ایمان مکمل اس طرح ہو کہ وہ قرآن مجید کی تمام آیات کی اہمیت کا برابر کا احساس رکھیں یہ نہ ہو کہ ایک خاص آیت مبارکہ پر تمام زور صرف کریں۔ لیکن دوسری کو سرے سے نظر انداز ہی کرتے رہیں۔ وہ آپس میں دینی بھائی بن جائیں اور آپس میں تفرقہ ہرگز نہ کریں بلکہ سورۃ البقرہ کی آیت مبارکہ نمبر ۱۷۷ کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال کر اپنے سچے اور حقیقی مسلمان ہونے کا عملی نمونہ پیش کریں۔ آیت مبارکہ کا ترجمہ یہ ہے۔ " بھلائی یہ نہیں کہ نماز پڑھتے وقت تم منہ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ بھلائی اس شخص کو ہے جو ایمان لایا اللہ پر۔ یوم آخرت پر فرشتوں پر، کتاب (قرآن) پر اور پیغمبروں پر اور اس نے اپنا مال اس (اللہ) کی محبت میں دیا۔ اپنے قرابت والوں کو، یتیموں کو، فقیروں کو، مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور

خرچ کرد نیں چھڑانے میں یعنی غلام آزاد کرانے میں مال دیا اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی اور یہ پورا کرنے والے ہیں۔ وعدہ کو جبکہ وعدہ کریں اور سختیوں میں تکلیفوں میں اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جو سچ بولتے ہیں اور یہی لوگ ہیں پرہیز گار" اس آیت مبارکہ میں اللہ جل شانہ نے تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ مسلمان کے خواص کیا ہونے چاہئیں بتایا جارہا ہے کہ مسلمان کے لئے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ وہ نماز کے عمل میں صرف یہی دیکھے کہ اس کا منہ کس طرف ہے۔ مغرب کی طرف ہے کہیں مشرق کی طرف تو نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہمیت کی حامل یہ بات ہے کہ اس کا ایمان اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، قرآن پر اور رسولوں پر کس قسم کا ہے۔ خلوص اور دل کی گہرائیوں سے ہے یا نہیں اور کیا وہ اللہ کی محبت کی وجہ سے اپنا مال و دولت اللہ کی راہ میں اپنے مستحق قرابت والوں پر، یتیموں پر، اسیروں پر، مسافروں پر، سوال کرنے والوں پر اور غلاموں کو آزاد کرانے پر خرچ کرتا ہے اور نماز روزہ۔ زکوٰۃ اور حج کو کس انداز سے ادا کرتا ہے۔ خدا کی محبت کی وجہ سے یا پھر خدا کے ڈر سے اللہ پاک اس کسوٹی پر مسلمان کی عملی زندگی کے ذریعے اس کے ایمان کو پرکھتا ہے۔ پھر یہ بھی ارشاد فرماتا ہے کہ جس مسلمان کی عملی زندگی ایسی ہوگی وہ اپنے وعدے کا پکا ہوگا۔ جھوٹا وعدہ کبھی نہیں کریگا۔ وہ مصیبت و آلام میں کبھی نہیں گھبرائے گا اور صبر کرنے والا ہوگا اور پرہیز گار ہوگا یہ سب نشانیاں ہیں۔ اس عملی زندگی کی جس سے مسلمان پہچانا جائے گا کہ اس کی ایمانی کیفیت کیسی ہے۔ اس کی نیت کیسی ہے اور وہ اللہ کی عبادت کس انداز میں کرتا ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو چاہیئے کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فرمان کی طرف پوری توجہ کے ساتھ رجوع کریں۔ اس کے تقاضے کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو عملی طور پر ڈھالیں۔

اگر اس لحاظ سے ہم اپنی عملی زندگی کا جائزہ لیں تو افسوس کے ساتھ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکثر مسلمانوں کی کیفیت کچھ اس قسم کی ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی میں ایک دوسرے کو اپنا دینی

مائی تصور نہیں کرتے، ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں دینی بھائی کی حیثیت سے شریک
ہیں ہوتے اور اللہ کی راہ پر اپنا مال اس انداز میں خرچ نہیں کرتے جس کا کہ تقاضا اللہ تعالیٰ
یا ہے۔ ان میں سے بعضوں کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ ان کے قرب و جوار میں کون کون رہتا
ہے۔ ان میں سے یتیم کون ہیں، بیوہ کون ہیں، نادار اور مستحق کون ہے۔ وہ تو اپنے عزیز و اقارب
ے مالی حالات سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں، چاہے وہ بے چارے عزیز و اقارب اپنی مالی
یشانیوں کے بوجھ تلے پسے جا رہے ہوں وہ تو اپنا سکون اسی بات سے حاصل کرنے کی
شش کرتے ہیں کہ وہ اچھے سے اچھا کھائیں، اچھے سے اچھا پہنیں، ان کے پاس کوٹھی ہو،
رہو، ٹیلی ویژن ہو اور ریفریجریٹر ہو۔ ان کی دوستی اور تعلقات اپنے سے مالی طور پر بہتر لوگوں
ے ہوں وہ اپنے غریب اور پسماندہ عزیز و اقارب سے ملنے سے گھبراتے ہیں، شرماتے ہیں،
یک محسوس کرتے ہیں، کیونکہ وہ نفسیاتی طور پر اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں، جسے کہ احساس
تری کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی سوسائٹی میں یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ ان کا سوسائٹی
ں نہایت اونچا مقام ہے۔ ان کا کسی غریب، مسکین، یتیم اور بیوہ سے کوئی تعلق نہیں ہونا
اہیے۔ وہ ان کا بد قسمتی سے کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو، پھر یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے
جو مسلمان بھائی مسجدوں میں باقاعدہ نماز پڑھنے آتے ہیں اگرچہ وہ بظاہر بہتر درجہ کے
مسلمان ہوتے ہیں، لیکن وہ مسجد میں خاموشی کے ساتھ نماز پڑھ کر چلے جاتے ہیں، ایک دوسر
ر دینی بھائی کے جذبے و احساس سے نہیں ملتے۔ ایک دوسرے کے ' سکھ میں شریک ہونے
ا قطعاً کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ ایک دوسرے کی بوقتِ ضرورت جائز مدد کے
لئے آگے نہیں بڑھتے اور اس سب کچھ ہونے کے باوجود وہ قرآنِ پاک کی آیاتِ مبارکہ پر کامل
یمان رکھنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، چاہے ان کا عمل ان آیات کی اعلانیہ خلاف ورزی کر رہا
ہو۔ وہ ٹس سے مس ہوتے نظر نہیں آتے۔ وہ اسلام کا وہ عملی نمونہ اپنی زندگی سے پیش نہیں
کرتے جس کو دیکھ کر عام مسلمان جو دوسرے اور تیسرے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، خاطر خواہ

طور پر متاثر ہوں اور اپنے دین کی طرف رجوع کرنے کی مناسب رغبت محسوس کریں اور کم از کم
یہی حال ہماری اسلامی تبلیغی جماعتوں کا ہے جو مسلمانوں سے صرف اس حد تک تقاضا کرنے
پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ نماز ضرور پڑھیں۔ لیکن وہ ان کے ذہنوں تک رسائی حاصل کر کے
ان کے سوالوں کا کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھتیں جو ان مسلمانوں کے ذہنوں پر اثر
پذیر ہوتے ہیں اور ان کو نماز پڑھنے سے روک رہے ہوتے ہیں تاکہ وہ مسلمان ذہنی طور
مطمئن ہو کر نماز کی طرف اور اپنے دین کی طرف پورے خلوص و اعتماد کے ساتھ راغب
ہوں۔

ہمارے دینی اختلافات

اب آپ کی خدمت میں کچھ دینی اختلافات
کے سلسلہ میں عرض کرتا ہوں۔ جہاں اس
کتاب کے لکھنے کا مقصد مسلمان بھائیوں کے لیے ہماری اسلامی کیفیت کا اپنی دانست
مطابق تجزیہ کرنا ہے تاکہ میرے مسلمان بھائی اپنے دین کے تقاضے سے بہتر طور پر روشناس
ہو سکیں۔ وہاں یہ مقصد بھی ہے کہ ان کے دینی اختلافات کی شدت کو کم کرنے کی سعی
جائے تاکہ وہ آپس میں تفرقہ کے رجحان سے بچ سکیں۔ ان میں صحیح اسلامی اخوت کا جذبہ
ہو، مکمل اتحاد ہو اور اپنے دین کی خدمت کے جذبہ پر پورا اعتماد بھی ہو کیونکہ جب تک مسلمان
اپنے اندر دینی اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے اور ایک ہو کر اسلام پر
کے حملوں کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ اس وقت تک وہ نوجوان ذہن کو غیر اسلامی پراپیگنڈہ
کے اثر سے نہ بچا سکیں گے۔ ایسی صورتحال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے علمائے دین اور
بھائی تو اپنے اختلافات کی وجہ سے الجھے رہیں گے۔ ان کے پاس اتنا وقت ہی نہ ہوگا
اغیار کے ناپاک عزائم اور منصوبوں کی طرف مناسب توجہ دے سکیں اور مسلمان نوجوانوں
ان کے زہریلے اثرات سے بچا سکیں اور اس طرح اسلام کا بول بالا حاصل کرنے کی طرف
قدم اٹھا سکیں۔ میں یہاں نہایت ادب و احترام کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں سے

طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو اپنے دینی اختلافات میں شدت پیدا کرتے ہوئے ان کو اس انتہا تک لے جائیں کہ آپس میں آپ تفرقہ کریں اور اس طرح قرآن پاک کی متعلقہ آیتِ مبارکہ کی خلاف ورزی کرنے کے ظاہرہ موجب بنیں۔ اس سے اگر کچھ نمودار ہوگا تو صرف یہ ہوگا کہ دشمنانِ اسلام کامیاب ہوں گے اور آپ دین کے زوال کا باعث بنیں گے۔ لہٰذا اگر آپ اپنے دین کی تھوڑی سی خدمت کرنے کی بھی کوئی تمنا رکھتے ہیں تو وہ صرف اسی حالت میں ہو سکے گی کہ آپ سب اپنی صفوں میں مکمل فکر و عمل کا اتحاد و یگانگت پیدا کریں اور اغیار کے لئے حقیقت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند بن جائیں۔

میں اس مقام پر ایک بار پھر اپنے اللہ تبارک و تعالیٰ سے نہایت عجز و انکساری سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے اپنے تمام تر فضل و کرم کی بدولت صحیح ہدایت و رہنمائی فرمائے۔ تاکہ میں اپنے دینی بھائیوں کے اختلافات کو کم کر سکوں اور اس طرح ان میں تفرقہ کی بجائے مکمل اتحاد و یگانگت کی کیفیت پیدا ہو سکے۔

اللہ کے معاملات انسانی شعور سے باہر ہیں

سب سے پہلے میں اپنے دینی بھائیوں کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے شک و شبہات کی بجائے خلوص کا جذبہ پیدا کریں۔ وہ یہ نہ بھولیں کہ ہر مسلمان اپنے فہم اور دینی و روحانی بصیرت کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے اور دینی و روحانی معاملات کا ادراک و مشاہدہ کر سکتا ہے اور اس سے زیادہ سمجھنا اس کے شعور، بساط اور توفیق سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے ہر مسلمان اپنے جس رنگ میں رنگا ہوتا ہے۔ وہ اسی کو دیکھتا ہے اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے۔ صرف اسی کو اہمیت دیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرے کی بات اور معاملات اس کو سمجھ آسکیں۔ اس لئے یہ لازم نہیں کہ ہر ایک کا مقام و معاملہ ہر دوسرے کی سمجھ میں آسکے اور اس بات کی وضاحت یہ مثال دے کر کی جا سکتی ہے کہ اللہ پاک کا جو خصوصی حساب و معاملہ حضرت خضر علیہ السلام سے

تھا۔ وہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کی سمجھ و علم سے بظاہر باہر تھا۔ اس لئے انہوں نے تین مختلف مقامات پر حضرت خضر علیہ السلام پر اعتراض کیا اور انہیں ٹوکا حالانکہ حضرت خضر علیہ السلام بظاہر صحیح تھے اور اس واقعہ کا ذکر قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ ہمیں اس سے مناسب سبق لینا چاہیئے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیئے کہ جو شخص محض اپنی عقل و فہم کی بساط پر اپنے دین کو سمجھنے اور دین کی منزل کو طے کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس منزل پر زیادہ دور تک نہ جا سکے اور بھٹک جائے کیونکہ احتمال ہے کہ یہ سب کوشش اللہ پاک سے بے نیاز ہو کر ہی کر رہا ہو اور اسے اللہ کی ضروری ہدایت، نصرت و توفیق حاصل نہ ہو یا اگر حاصل ہو تو بہت کم۔ ایسے شخص کا تمام علم اور تمام عبادات اس شخص کی دینی و روحانی کیفیت کے مقابلہ میں ذرہ بھر بھی حقیقت و وقعت نہیں رکھتی۔ جس پر کہ اللہ تبارک و تعالےٰ کا فضل ہو۔ اس پر انعامات کی بارش ہو رہی ہو۔ اس پر سے غیب کے پردے اٹھ رہے ہوں اور اسرارِ الہٰی کھل رہے ہوں اور یہ ایسی باتیں ہیں۔ جنکا ادراک انسانی عقل نہیں کر سکتی اور اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام بظاہر آگ کی طرف اسے حاصل کرنے کے لئے رات کے وقت جنگل میں بڑھ رہے ہیں اور آگ کے بہانے ان کو نبوت کے اعلیٰ ترین مقام سے نوازا جاتا ہے اور کسی کی لکنت کا بہانہ بنا کر ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت عطا کر دی جاتی ہے۔ یہ ہے اللہ کی دین اور اللہ کا فضل جسے چاہتا ہے انتخاب کرتا ہے اور جس پر جتنا چاہتا ہے اپنا فضل کرتا ہے۔ انسان کا تمام علم اور تمام عمر کی عبادت اللہ پاک کے ادنےٰ سے فضل کے آگے بالکل ہیچ ہے اور بے وقعت ہے کیونکہ متذکرہ انسانی علم و عبادت کی اساس صرف اس کی عقل پر ہے۔ جو محدود ہے، ناقص ہے، اسرارِ الہٰی کا شعور حاصل کرنے سے عاجز ہے۔ بظاہر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو نبوت اس لئے عطا کی گئی تاکہ فرعون اللہ پر ایمان لائے جو کہ نہ ہوا اور وہ کافر ہی کی موت مرا۔ آخر پھر ایسا کیوں ہوا۔

یہ وہ اسرار الہیہ ہیں، جنکا جواب عقل نہیں دے سکتی. چاہے کوئی اس کے بال ہی کیوں نہ نوچ ڈالے اور اللہ کے فضل کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب وہ چاہتا ہے. خود ہی معلم بھی بن جاتا ہے، مشاہدات کراتا ہے. اپنی آیات کے معنی بھی سمجھاتا ہے اور جسے چاہے اپنا رسول بنا لیتا ہے. جسے چاہے اپنا محبوب بنا لیتا ہے اور جسے چاہے اپنا دوست بنا لیتا ہے اور اللہ کے یہ بندے اپنے اپنے مقام کے مطابق اللہ کی آیات (نشانیوں) کو سمجھتے ہیں اور ان کو بیان کرتے ہیں اور جن کو توفیق حاصل نہیں ہوتی. ان کی عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں اور یہ پردے بڑھ کر جب اپنی انتہا کو پہنچتے ہیں تو ابوجہل یا ابولہب کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں.

اللہ کا برگزیدہ بندہ جھوٹ نہیں بول سکتا

اس لئے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں کی کوئی بات یا کوئی وضاحت کسی کی اپنی سمجھ یا اپنے حال کے مطابق اسے نظر نہیں آتی ہو تو اس کو فوراً قطعی انداز میں رد نہ کرنا چاہیئے. بلکہ یہ بات ہر وقت ذہن میں رہنی چاہیئے کہ اللہ کا بندہ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا. کیونکہ دین کے راستہ کا سب سے پہلا تقاضا یہی ہے. اس لئے جب اللہ کا پیغمبر یا ولی کوئی بات کہے تو اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے. اپنے جذبات کی شدت کے تحت عجلت میں کفر و شرک کے فوری فتوے جاری نہ کر دینے چاہئیں. کیونکہ اگر ایک مسلمان جو چاہے کسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو اگر اس کا اللہ پر، رسولوں پر، فرشتوں پر، قرآن پر، یوم آخرت پر ایمان مکمل ہے اور وہ اللہ کے دین پر نیک نیتی سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کرتا ہے اور شرک سے جو کہ گناہ کبیرہ میں سر فہرست ہے. بچنے کی اپنی حتی المقدور کوشش بھی جاری رکھتا ہے تو اس پر مشرک ہونے کا فتویٰ کیسے جاری کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ ہر عمل سے زیادہ اہمیت اس عمل کی نیت کو ہے. جس نیت کے تحت وہ عمل کیا جاتا ہے اور کسی شخص کی نیت کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے. بظاہر ہر مسلمان جو دین کی خدمت اور معاشرہ کو اسلامی رنگ دینے کے لئے کوشاں ہے. وہ

نیک نیت ہے اور اس کے اعمال بھی صالح ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چوں کہ ہر مسلمان کی اپنی اپنی دانست و بصیرت ہوتی ہے۔ اپنا اپنا مشاہدہ ہوتا ہے۔ آیات اللہ کے نئے نئے معنی کھلتے ہیں، اس لئے اگر کسی کی کیفیت اور بیان سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی بات کو اسی وقت تک ماننے سے انکار کیا جائے۔ جب تک کہ وہ سمجھ میں نہ آئے اور مکمل طور پر اطمینان نہ ہو جائے۔ لیکن شرک قسم کے فتوے صادر کر دینے کا کسی طرح جواز نہیں بننا چاہیئے اور ایسا کرنے سے اس وجہ سے بھی ڈرنا چاہیئے کہ انہی باتوں کا فیصلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یومِ آخرت مقرر کیا ہے۔ جس دن وہ خود ہی یہ فیصلہ صادر کرے گا۔ کہ لوگوں نے اپنی زندگی میں جو جو اعمال کئے وہ کس نوعیت کے تھے اور ان کے مطابق اللہ خود ہر ایک کے اعمال کا فیصلہ سنا دے گا اور جو شخص اللہ کے ذاتی اختیارات کو اپنی طرف منسوب کر کے روزِ آخرت کا انتظار کئے بغیر خود ہی بلا تامل جذبات کی شدت کے تحت عجلت میں کسی کے اعمال کو شرک قرار دے دے تو ڈر محسوس ہوتا ہے کہ ایسا شخص خود اپنے فعل کی وجہ سے اللہ کا شریک ہونے کا دانستہ یا نادانستہ طور پر مرتکب نہ ہو رہا ہو اور یہ وہ کیفیت ہے۔ جس سے ہر مسلمان ہر حالت میں بچنے کے لئے ہر ممکن سعی کرنا چاہیئے اور اس سے ڈرتے ہوئے ہر طرح کی سرکشی سے بچنا چاہیئے۔ کسی کو اپنی تند و تیز زبان سے کافر یا مشرک کہہ دینا تو آسان ہے۔ لیکن بعد میں ایسے معاملہ میں اللہ سے نمٹنا نہایت مشکل ہے۔ اگر مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کفر و شرک کے فتوے دے کر روزِ قیامت کا تمام کام خود ہی ابھی ختم کر دیا تو (نعوذ باللہ) کیا اللہ جلِ شانہ، روزِ محشر محض تکلف کے طور پر ہی قائم کریں گے۔ کلی اختیارات تو قادرِ مطلق ہی کی ذات کو ہیں اور اسی ہی کو زیب دیتا ہے کہ جانے کہ کس کے اعمال کیسے ہیں اور کیسے نہیں ہیں اور کون شرک کرتا ہے یا کون نہیں۔

میں نہایت عاجزی کے ساتھ صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ ایسے فتووں

کے صادر کرنے سے یہ ڈر محسوس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان میں شرک کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو ـــــــــ البتہ شرک کی ایک کیفیت ایسی ہے جس سے سب مسلمانوں کو ڈرنا اور بچنا چاہیئے۔ سورہ بقرہ میں ارشاد ربانی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

ترجمہ: اور لوگوں میں بعض وہ ہے جو سوا اللہ کے شریک پکڑتا ہے اور ان سے محبت اس طرح کرتا ہے۔ جیسی کہ خدا سے محبت (کرنی چاہیئے) اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ سے محبت کرنے میں زیادہ ہیں (یعنی اسے ہر شے سے زیادہ محبت کرتے ہیں) اور کاش اس بات کو جان لیں۔ وہ لوگ کہ وہ ظالم ہیں (یعنی وہ لوگ جو محبت میں اللہ کے سوا شریک پکڑتے ہیں) جب یہ دیکھیں گے عذاب کہ یہ ساری قوت واسطے اللہ کے ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔" شرک کے فتوے لگانے والوں کو شرک کے مندرجہ بالا خطرہ کو محسوس کرنا چاہیئے اور مسلمانوں کو اس سے بچانے کی سعی کرنی چاہیئے کیونکہ آجکل تقریباً ہر مسلمان اپنے مال اور اولاد سے محبت اس محبت سے کہیں زیادہ کرتا ہے جو وہ اپنے اللہ پاک سے کرتا ہے اور زیادہ تعداد تو ایسے مسلمانوں کی معلوم ہوتی ہے جو یہ جانتے نہیں کہ اللہ پاک اپنے بندوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس سے محبت کریں اور یہ کہ بندے اللہ پاک سے محبت بھی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا تو یہ حال ہے کہ جس وقت انہیں اپنے مال اور اولاد کی فکر یا محبت لاحق ہوتی ہے تو ان میں اکثر اللہ کو اس وقت بالکل بھولے ہوئے ہوتے ہیں۔

اللہ کی نشانیوں پر ایمان لانا لازم ہے

قرآن مجید کو قرآن حکیم اس لئے کہتے ہیں کہ جہاں اس کی آیات مسلمان سیکھتا ہے۔ وہاں اس سے حکمت بھی سیکھتا ہے اور اللہ تعالےٰ فرماتا ہے

کہ "وہ (رسول) پڑھتا ہے آیات ہماری تمہارے اوپر اور تم کو پاک کرتا ہے اور سکھاتا ہے تم کو کتاب اور حکمت"، قرآن پاک اللہ پاک کا کلام ہے لہٰذا یہ کتاب سب کتابوں سے اعلیٰ ہے۔ سب کتابوں سے آسان ہے اور سب کتابوں سے مشکل بھی۔ آسان ترین اس لئے کہ عام معمولی پڑھا لکھا مسلمان اگر اس کو پڑھے تو اس سے فیضیاب ہو اور ثواب حاصل کرے اپنی زندگی کو مزین کرے اور مشکل ترین اس لئے کہ اگر عالم اسکو پڑھ کر اس میں تحقیق کرنی چاہے تو اس کی گہرائیوں اور بلندیوں کو نہ پا سکے۔ اس پر اس کی آیات کے نئے نئے معانی کھلتے جائیں اور وہ اس میں اللہ کی حکمتوں کا احاطہ نہ کر سکے اور صرف اتنا ہی سمجھ سکے، جتنی کہ اسے اللہ کی طرف سے توفیق عطا ہو، اللہ تعالیٰ اپنے اوپر ایمان لانے کا تقاضا بندے کو اپنی آیات (نشانیاں) دکھا کر کرتا ہے۔ فرماتا ہے کہ میری نشانیوں کو دیکھو ان کو سمجھنے کی کوشش کرو اور اس طرح اسے پہچان کر اللہ پر ایمان لاؤ، سورہ مومن میں ارشاد ہے۔" اور دکھاتا ہے تم کو نشانیاں اپنی۔ پس اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے"، جو اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر سمجھ جائے وہ کیونکر ان کا انکار کرے گا۔ لیکن اللہ کی آیات کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے اللہ کی طرف سے مناسب بصیرت اور عقل سلیم عطا ہونی ضروری ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو سورہ انفال میں کیوں ارشاد باری تعالیٰ ہوتا کہ "اے ایمان والو۔ اللہ کا کہا مانو اور اس کے رسول کا اور اس کا کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم سن لیتے ہی ہو اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو دعوے تو کرتے ہیں کہ ہم نے (آیات) کو سن لیا۔ حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں۔ بے شک اللہ کے نزدیک بد ترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں، گونگے ہیں جو کہ ذرا نہیں سمجھتے"۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ یہ لوگ اپنے تیئں مطمئن ہوتے ہیں کہ انہوں نے آیات اللہ کو سن لیا ہے اور پوری طرح سمجھ بھی لیا ہے۔ لیکن دراصل وہ سنتے سناتے کچھ نہیں اور ایسے لوگوں کو اللہ نے بہرے اور گونگے کہا ہے۔ ایک اور جگہ تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ یہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس لوٹ کر واپس نہیں آئینگے اور سورہ الانعام میں ہے کہ "جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں،

پیچ اندھیروں کے ہیں۔''

اسی ضمن میں اللہ تعالیٰ سورہ محمد میں آیت ۲۴ ارشاد فرماتا ہے کہ ''کہ یہ لوگ قرآن میں فکر کیوں نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہیں۔'' مادہ پرستی کے موجودہ دور میں جو مسلمان غور و فکر کے لئے صرف اپنی عقل و فہم ہی کو شرط قرار دیتا ہے اور صرف اسی کا سہارا لیتے نظر آتا ہے۔ اس کو اس آیتِ مبارکہ کی طرف راہنمائی حاصل کرنے کے لئے خاص طور پر متوجہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں اللہ جل شانہٗ واشگاف اعلان فرما رہا ہے کہ جب تک کسی شخص کے دل پر قفل لگے رہیں گے۔ وہ قرآنِ حکیم میں صحیح غور و فکر نہیں کر سکے گا۔ اس کی حکمتوں کو نہیں پا سکے گا اور اس طرح یہ دل کا قفل اس کی عقل پر پردہ ڈالے رہے گا لہٰذا یہ سمجھ آ رہا ہے کہ قرآنِ حکیم کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے انسان کی صحیح دلی کیفیت اوّلین شرط ہے۔ اس کے بغیر عقل و فہم کی راہنمائی نہیں ہو سکتی اور اس کے گمراہ ہونے کا ہر چند خطرہ لاحق ہے اور اسی بات کو ربّ العزت دوسرے انداز میں سورہ انفال کی آیات ۲۰ تا ۲۳ میں یوں بیان فرماتا ہے کہ ''اے ایمان والو۔ اللہ کا کہا مانو اور اس کے رسول کا۔ اور اس کا کہا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم سن لیتے ہی ہو اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو دعوےٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سن لیا۔ حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں۔ بے شک اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے ہیں۔ گونگے ہیں۔ جو کہ ذرا نہیں سمجھتے اور اللہ ان میں کوئی خوبی دیکھتا۔ تو ان کو سننے کی توفیق دیتا۔'' سو محمد کی مندرجہ بالا آیتِ مبارکہ کی روشنی میں سورہ انفال کی اس آیت میں لفظ 'خوبی' کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر ان میں یہ خوبی ہوتی۔ کہ ان کے دلوں پر قفل نہ لگے ہوتے تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ قرآن حکیم سننے اور اسکو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق دیتا۔ لہٰذا قرآن پاک میں جو لوگ فکر کرنا چاہتے ہوں تاکہ وہ اسے صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں تو ان کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ پہلے دل کی حقیقت اور دل کے قفل کی حقیقت کو مناسب طور پر سمجھیں۔ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ

پر ایمان کے بارے میں کسی قسم کا تعصب و کجی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نشانی سے انکار نہ ہو۔ کیونکہ اللہ کی نشانیوں سے انکار کرنے کے خدشہ کی نشاندہی سورۂ مومن میں یوں کی گئی ہے کہ "اور دکھاتا ہے تم کو نشانیاں اپنی۔ پس اللہ کی کون کون سی نشانیوں کا انکار کرو گے"، اور جو اللہ کی نشانیوں کا انکار کرنے کا مرتکب ہو۔ اس کے بارے میں سورہ انعام میں ارشادِ ربانی ہے کہ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ترجمہ: "اس (شخص) سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جس نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔"

واقعہ معراج بطور اللہ کی نشانی کے

ان نشانیوں کے ضمن میں ایک مثال واقعۂ معراج النبی کی دی جا سکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک طبقہ اس نظریہ کا حامی و داعی ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج خواب کی حالت میں ظہور پذیر ہوئی تھی غالباً اس کی وجہ اُن کی عقل و فہم میں یہ ہے کہ چونکہ حضورؐ جسم پاک کے ساتھ معراج پر جانے کی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اس لئے یہ معراج ضرور خواب کی حالت میں صرف روحِ مبارک ہی کو ہوا ہو گا۔ لیکن برعکس اس کے اللہ تعالیٰ تو ہمیں معراج کے بارے میں یہ نشانی دے رہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ بتا رہا ہے کہ معراج پر حضورؐ اپنے طور پر اپنی صلاحیتوں کے ساتھ تشریف نہیں لے گئے تھے۔ بلکہ انہیں تو اللہ تعالیٰ خود لے کے گیا تھا۔ جو ہر چیز (کرنے) پر قادر ہے۔ اس لئے واقعہ معراج کو کسی حد تک سمجھنے کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ کی لامحدود قدرت کے پیمانے کے پس منظر میں دیکھنا اور سمجھنا ہو گا جو کہ اس تمام واقعہ کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل کے آغاز میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ کہ "پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجدِ حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے اِرد گرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنے بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔"

مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالےٰ پھر اپنی نشانیوں کی اہمیت بیان کر رہا ہے
لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ہم ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہوں اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ
یہ نشانیاں کیا ہیں۔ پہلی بات تو واضح ہو رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ معراج پر رسول پاک
صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف نہیں لے گئے۔ بلکہ اللہ جل شانہٗ انہیں خود لے کر گیا
ہے اور ہمیں پورے اہتمام سے چوکنا کیا جا رہا ہے کہ جو خدا انہیں لے کر جا رہا ہے وہ
ہر طرح سے پاک ہے۔ بے عیب ہے۔ لا محدود ہے۔ وہ تمام تر قدرت کا مالک ہے۔
اس میں نہ کوئی کمی ہے۔ نہ کمزوری۔ وہ تو عالیشان عزت و عظمت والا ہے اور جنہیں وہ
معراج پر لے جا رہا ہے۔ وہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اس کے خاص اپنے ہی
بندے ہیں۔ جن پر رب العزت اپنے انعامات کی انتہا کر رہا ہے۔ معراج کے بیان کے
بارے میں اللہ تعالےٰ ان تمام حقیقتوں کی طرف ہماری توجہ اس لئے مبذول کروا رہا
ہے تاکہ ہم اس واقعہ کی عظمتوں کو سمجھنے میں کسی کجی کا ناحق شکار نہ ہو جائیں۔ کیونکہ ہم
سب بہت محدود ہیں۔ ہماری سوچ محدود ہے اور اس محدود سوچ کی اساس پر ہم جو
نتیجہ بھی اخذ کریں گے۔ وہ بھی محدود ہی ہوگا یعنی کہ اس میں غلطی کی گنجائش باقی رہ جائے گی۔

مثلاً اگر ہم اس واقعہ کو سمجھنے میں یہ بنیادی غلطی کریں کہ معراج پر حضورؐ خود اپنے
طور پر ہی تشریف لے گئے تھے۔ تو پھر ذہن میں یہ سوال پیدا بھی ہوگا کہ حضورؐ معراج پر خود
کیسے گئے اور اگر چلے ہی گئے تو جسم کے ساتھ جانا کیسے ممکن تھا۔ آپ کو ایسا کرنے کی
کیا قدرت حاصل تھی۔ لہٰذا ہمیں ابتدا میں ہی یہ بتایا جا رہا ہے کہ معراج پر حضورؐ کو
لے جانے والی وہ ذات اقدس تھی۔ جس کے حکم سے ہر وہ چیز بغیر کسی سبب اور دلیل کے
معرضِ وجود میں "آناً فاناً" آجاتی ہے۔ جس کا وہ حکم کرے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج پر اپنی عظیم نشانیاں دکھانا مقصود ہے۔ حضورؐ
کو آسمانوں پر لے جانے کے لئے جبرائیل علیہ السلام بحکم خدا تعالیٰ آ رہے ہیں۔ مع براق

ان نشانیوں میں پہلی نشانی یہ بھی ہے کہ آپ جسمِ پاک کے ساتھ معراج پر جا رہے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ صرف آپؐ کی روحِ مبارک ہی معراج پر اللہ کے پاس گئی تھی۔ جیسے کہ مولٰنا سید سلیمان ندوی صاحب نے اپنی کتاب سیرت النبیؐ کی جلد سوم کے صفحہ ۳۶۸ پر رقم کیا ہے کہ آپؐ نے معراج نیند کی حالت (خواب) میں کیا ہے تو پھر ایسے معراج میں کونسی عظیم نشانی پنہاں تھی۔ کیونکہ سورہ الزمر کی آیت ۴۲ کے مطابق تو حضورؐ کی روح نیند کی حالت میں اللہ تعالےٰ کے پاس پہنچی ہوتی تھی اور یہ آپؐ کی ۶۳ سالہ زندگی کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اور پھر ہمیں اس لحاظ سے بھی اپنے آپ کو مزید مطمئن کرنا ہوگا کہ جس وقت آپ اس مادی دنیا میں جسم اور روح دونوں کے ساتھ معرضِ وجود میں تھے تو پھر کیا وجہ تھی کہ اللہ تعالےٰ نے "اپنے بندے" کو جسمِ مبارک کے ساتھ معراج نہ کروائی۔ کیا نعوذ باللہ آپؐ کا جسم مادیت کی کثافت کے سبب اس قابل نہ تھا کہ اللہ تعالےٰ اس کی کثافت کو اپنی قدرت سے دُور کر کے جسم کو روح کے ساتھ معراج پر لے جاتا۔ حالانکہ اللہ کی عنایات و قدرت کی یہ نشانیاں بھی ہمارے سامنے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لکنت کے واسطہ سے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لئے نبوت مانگی۔ تو اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت سے نبوت تک فوراً عطا کر دی۔ کیا حضرت ادریس علیہ سلام اور حضرت عیسیٰ علیہ سلام کو اس واقعہ سے پہلے انکو جسموں کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے آسمانوں پر نہیں اٹھایا تھا اور کیا حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوّا اپنے جسموں کے ساتھ جنت سے زمین پر نہیں اتارے گئے تھے۔ اگر معراج پر حضورؐ کا جسمِ مبارک لے جانا مقصود نہیں تھا۔ تو پھر جبرائیل علیہ سلام کون سا سینہ چاک کرنے اور کونسا پیٹ آبِ زمزم سے دھونے کے لئے آسمانوں سے تشریف لائے تھے۔ کیا یہ پیٹ اور سینہ جسے معراج سے پہلے بدرجۂ اتم پاک و صاف کرنا اور اس میں ایمان بھرنا تھا۔ وہ جسم کا تھا یا روح کا تھا اور اگر یہ سینہ روح کا بھی ہوتا ہے تو کیا

آبِ زم زم جو استعمال کیا گیا۔ وہ بھی مادیت کی بجائے روحانی تھا اور کیا جبرائیل علیہ السلام جو چھت پھاڑ کر حضورؐ کو معراج پر لے جانے کیلئے ان کے پاس حاضر ہوئے تو وہ بھی روحانی حالت میں تھے اور چھت بھی اور جس براق کا حضورؐ کی سواری کے لئے اہتمام کیا گیا تھا۔ وہ بھی براق کی روح ہی تھی نہ کہ جسم اور پھر یہ بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آبِ زمزم سے کس سینہ کو دھونے۔ بدرجۂ اتم پاک کرنے اور منور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جسم یا روح جہاں تک محض روحانی معراج کا تعلق ہے وہ تو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ادنٰی و حقیر غلاموں میں سے کئی ایک نے بحالت خواب کئے ہیں جس میں انہوں نے فرشتوں کو دیکھا۔ بلند آسمان کے کنارے کو دیکھا۔ جنت کی سیر کی اور دوزخ کے مناظر کا مشاہدہ بھی کیا۔ اس لئے صاف ظاہر ہے کہ حضورؐ کا موجودہ معراج خصوصی اور اعلٰے ترین اہمیتوں کا حامل ہے۔ اور باقی تمام معراجوں سے اسی طرح افضل و بالا ہے۔ جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء علیہ السلام سے افضل ہیں۔ کسی کہنے والے نے خوب کہا ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر اور اگر یہ بات ہم صدقِ دل سے مانتے ہیں تو جو خدا کے بعد بزرگ ترین ہوگا۔ تو کیا وہ باقی سب کے مقابلہ میں خدا کے قریب ترین نہ ہوگا۔ یعنی کہ قریب ترین فرشتہ سے بھی زیادہ قریب۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ معراج کے واقعہ کی حقیقتیں ہم پر منکشف ہوں تو چاہئے کہ سورہ بنی اسرائیل کی متعلقہ آیتِ مبارکہ کے اثرات قلب پر وارد ہوں۔ اس سلسلہ میں جو دوسری نشانی غور طلب ہے۔ وہ واقعۂ معراج میں حضور کیلئے اللہ کے "اپنے بندے" کے الفاظ کا خصوصی استعمال ہے اور لغوی یا قرآنی معنوں کے لحاظ سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ کہ لفظ "بندہ" کا اطلاق صرف انسان کی روح پر ہو اور جسم پر نہ ہو۔ خاص طور پر اسوقت جبکہ مذکورہ بندہ الفاظ کے استعمال کے وقت جسم اور روح دونوں کا مجموعہ ہو اور اگر کسی انداز میں یہ موقف تسلیم کر بھی لیا جائے کہ "بندہ" کے لفظ کا

اطلاق صرف روح پر ہی ہوتا ہے۔ جسم پر نہیں تو پھر معراج کے دوران اللہ نے جو پانچ نمازیں روزانہ اپنے بندوں (عبادت کرنے والوں) پر فرض کی ہیں۔ تو یہ نمازیں پھر بندے کی روح ہی کیلئے فرض ہونی چاہیئیں۔ نہ کہ جسم کے لئے۔ لیکن یہ معاملہ ہر گز ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ نماز کے آغاز سے ہمارا یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ نماز میں ہمارا جسم بھی پوری طرح شامل ہوتا ہے۔ ہم نماز کے لئے پاک وصاف کپڑے پہنتے ہیں۔ مسجد میں جاتے ہیں۔ وضو کر کے جسم کو پاک کرتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور یہ سب باتیں جسم ہی کے خواص ہیں۔ جو بندے اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ وہ بھی عبادت کی حالت میں ہوتے ہیں اور اپنے جسم کی قربانی دے کر درجۂ شہادت حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح واضح ہو رہا ہے کہ اس مادی دنیا میں "بندہ" کے لفظ کا اطلاق جسم اور روح دونوں پر یکساں ہوتا ہے اور معراج پر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جسم مبارک کے ساتھ بیداری کی حالت میں تشریف لے گئے تھے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے لوگوں کو قرآن میں غور کرنا چاہیئے اور قرآنِ پاک میں یہ غور اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ دل کے قفل، اللہ کی توفیق سے نہ کھلیں اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن پاک بھی جناب احمد مجتبےٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر ہی اترا تھا۔ جیسے کہ سورہ بقر میں ارشاد ربانی ہے۔ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ ترجمہ: اسی (جبرائیلؑ) نے اس (قرآن) کو خدا کے حکم سے تمہارے قلب پر اتارا ہے۔" شاید اسی وجہ سے یہ خوبی صرف قلب ہی میں ہے کہ وہ قرآن میں غور کرنے اور اسے صحیح طور پر سمجھنے کا متحمل ہو سکتا ہے سورہ حشر میں ارشادِ ربانی ہے کہ اگر قرآن پہاڑ پر اتارا جاتا تو وہ خوف سے دب جاتا۔ اور پھٹ جاتا۔

قرآنِ حکیم کی عظمتوں اور معنی کی وسعتوں کو بغیر پاک و لطیف قلب کے سمجھنا

ناممکن ہے۔ اس مادی دور میں جب بجائے کائنات کو تسخیر کرنے کے انسان خود ہی اپنی حرص و ہوس کا غلام اور شکار ہو جائے اور وہ مال و دولت کو اکٹھا کرنے کی غرض سے مکر و فریب کا سہارا بھی لینے لگے اور اصولوں کو خیر باد کہتے ہوئے وہ اپنے ضمیر کو بیچنا شروع کر دے تو اس کے دل پر تالے نہیں پڑیں گے تو اور کیا ہو گا۔ اللہ تعالےٰ ہماری راہنمائی کے لئے فرماتا ہے کہ دنیا کی زندگی تو کافروں کے لئے زینت دی گئی ہے اور پرہیزگاروں کے لئے آخرت بہتر ہے۔ سورہ بقر میں ہے۔ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؁ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ؁ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ترجمہ: پس بعض لوگوں میں سے وہ شخص ہے کہ کہتا ہے کہ ہمارے رب دے ہم کو بیچ اس دنیا کے (آرام و آسائش) ایسے شخص کے واسطے آخرت کے بیچ کچھ حصہ نہیں اور بعض ان میں سے وہ شخص ہے کہ کہتا ہے کہ اے ہمارے رب دے ہم کو اس دنیا میں اچھائی اور بیچ آخرت کے اچھائی اور بچا ہم کو آگ کے عذاب سے۔ ایسے شخص کے واسطے حصہ (صرف) اس چیز سے ہے۔ جو کہ اس نے (اپنے اعمال کے ذریعہ) کمایا ہے۔ اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔" میری دانست میں مقام فکر ہے کہ ہم لوگوں نے اپنے اعمال سے اتنا کیا کما لیا ہے اور ہم اللہ جل شانہٗ کو جلد حساب دینے کے کیا اہل ہو گئے ہیں جو ہم دن رات اللہ تعالےٰ سے مندرجہ بالا دعا مانگتے ہیں، اور جلد حساب لینے کی ڈانٹ اللہ تعالےٰ نے سورہ آل عمران کی آیت ۱۹ میں پلائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔" وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ؁ ترجمہ: اور جو کوئی اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر کرے۔ یعنی اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے پس یقیناً اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔" البتہ جو لوگ اس دعا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جان کر مانگتے ہیں اور اس دنیا میں اچھائی سے ان کا مطلب آخرت میں کام آنے والی نیکی ہے نہ کہ متاع دنیا۔ تو ان

کی بات اور ہے اور سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن جو شخص اس غرض سے دنیا میں اچھائی مانگتا ہو۔ کہ مطلب اس کا محض مال و دولتِ دنیا ہو تو ایسے شخص کو ہدایت کے لئے سورہ بنی اسرائیل کی آیاتِ مبارکہ ۱۸ تا ۲۱ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ان میں ارشادِ حق تعالےٰ ہے کہ "جو کوئی ارادہ کرتا ہے دنیا (حاصل کرنے) کا۔ ہم اسکو اس کے بیچ دے دیتے ہیں۔ جو کہ ہم اسکو دینا چاہتے ہوں (مگر) پھر ہم اس کے واسطے دوزخ کرتے ہیں۔ جس میں کہ وہ راندہ ہوا برے حال میں داخل ہوگا اور جو کوئی آخرت کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لئے محنت کرتا ہے جو محنت اس کی (موزوں) ہے اور وہ ایمان والا ہے۔ پس یہ لوگ ہیں (کہ) محنت ان کی قدر دانی کی ہے۔ ہم ان ہر ایک کی مدد کرتے ہیں۔ تیرے پروردگار کی بخشش سے اور تیرے پروردگار کی بخشش بند نہیں کی گئی۔ دیکھ ہم کیونکر بعض کو بعض پر بزرگی دیتے ہیں اور البتہ آخرت درجوں میں اور بزرگی دینے میں بڑی ہے۔" سورہ الاعلیٰ میں ہے کہ "بلکہ تم زندگانی دنیا کی اختیار کرتے ہو اور آخرت بہت بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے" اور سورہ نازعات کی آیات ۳۶ تا ۴۱ میں ہے کہ" اور ظاہر کی جاوے گی۔ دوزخ واسطے اس شخص کے کہ دیکھتا ہے۔ پس جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگانی کو اختیار کیا۔ پس اسکا یقیناً ٹھکانا دوزخ ہی ہے اور ہاں جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا رہا۔ اپنے نفس کو خواہش سے منع کیا۔ پس یقیناً بہشت وہی جگہ ہے اس کے رہنے کی۔" اور سورہ قصص آیت نمبر ۵۰ میں ارشادِ پروردگار ہے۔ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ ترجمہ: پس تو جان لے کہ اس کے سوائے کچھ نہیں کہ وہ پیروی کرتے ہیں اپنی خواہشوں کی اور جو شخص ہدایتِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے۔ بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔" اس سے ظاہر ہوا کہ جو لوگ مادی دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور صرف

اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں تاکہ انہیں دنیا کا آرام و آسائش ہر ممکن طریقہ سے حاصل ہو جائے۔ وہ اللہ کے نزدیک گمراہ ہیں۔ بھٹکے ہوئے ہیں۔ اُن کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ قرآن میں غور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی اللہ کی متعدد نشانیوں کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے کہ اس نے لوگوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور عبادت کا مقصد تزکیۂ نفس، پرہیزگاری اور تقویٰ کا حصول ہے اور تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔

اللہ کی نشانیوں میں غور کرنے کے سلسلہ میں اب معراج شریف کا وہ حصہ مدِ نظر ہے جو کہ دیدارِ الٰہی سے متعلق ہے۔ جس وقت رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا عظیم واقعہ لوگوں کو سنایا۔ تو وہ اللہ کی طرف سے آزمائش میں پڑ گئے۔ کفار نے تو اس واقعہ کو یکسر جھوٹا سمجھ کر رد کر دیا۔ بعض مسلمان بھی اس کی صحت کے بارے میں شک و شبہات میں پڑ گئے اور اس طرح وہ مرتد ہو گئے (بیہقی) بعض مسلمانوں نے واقعہ معراج کو تو درست تسلیم کیا۔ لیکن معراج میں دیدارِ الٰہی ہونے کا انکار کیا۔ بعض نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ حضورؐ کو دیدار تو ہوا ہے۔ لیکن یہ دیدار بحالتِ خواب ہوا ہے۔ بعض نے کہا کہ دیدار بیداری کی حالت میں جسم کے ساتھ تو ضرور ہوا ہے۔ لیکن یہ دیدار دل کی آنکھوں سے ہوا ہے اور بعض نے کہا کہ یہ دیدار نہ صرف بیداری کی حالت میں جسم کے ساتھ ہوا ہے۔ بلکہ ظاہرہ جسم کی آنکھوں کے ساتھ بے حجاب ہوا ہے۔

جن حضرات نے دیدارِ الٰہی کی مخالفت میں اپنا مؤقف بیان کیا ہے۔ ان میں امام ابوبکر بیہقی۔ حافظ ابنِ کثیر۔ علامہ ابنِ حزم۔ نسائی اور امام مسلم وغیرہ پیش پیش ہیں۔ یہ حضرات اپنا یکساں مؤقف اختیار کرنے میں سب سے زیادہ تقویت حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اس تفسیر سے حاصل کرتے ہیں۔ جو انہوں نے قرآن پاک کی آیت " لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ " کے حوالے سے بیان فرمائی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ

آنکھیں اس (اللہ) کا ادراک نہیں کر سکتیں"۔ لیکن ہمیں نہیں بھولنا چاہیئے کہ اس آیت کا اطلاق اللہ کی مخلوق پر تو ضرور ہے۔ نہ کہ خود اللہ کی اپنی ذات بابرکات پر اور نہ ہی اس کے معجزات پر جو اللہ تعالےٰ اپنی حکمتوں کے تحت اپنے برگزیدہ نبیوں کو عطا کرتا ہے۔ معجزات تو قانونِ فطرت اور قانونِ قدرت دونوں کو عارضی طور پر معطل کر کے ہی بحکم الٰہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چونکہ واقعہ معراج شروع سے آخر تک سراپا معجزہ ہے اس لئے اس پر قرآن پاک کی سورہ بقرہ کی اس آیت مبارکہ کا اطلاق ہوتا ہے "وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ ترجمہ: اور جب (اللہ) مقرر کرتا ہے کچھ کام۔ پس اس کے سوائے کچھ نہیں کہتا واسطے اس (کام) کے۔ کہ ہو جا۔ تو (وہ کام خود بخود) ہو جاتا ہے"۔ پس صرف یہی وجہ تھی کہ حکم خداوندی سے نمرود کی آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور ٹھنڈی ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ سلام کا عصا اژدہا بن گیا۔ اور جب انہوں نے اس اژدہا کو دوبارہ ہاتھ میں پکڑا تو پھر عصا بن گیا اور جس وقت یہ عصا حضرت موسیٰ علیہ سلام نے دریائے نیل کے بہتے ہوئے پانی پر مارا تو پانی بہنے سے رک گیا اور اس نے حضرت موسیٰ علیہ سلام اور ان کی قوم کو دریائے نیل کو عبور کرنے کے لئے راستہ دے دیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مٹی کا پرندہ بناتے تو اس میں جان پڑ جاتی، بیماروں کو شفا دیتے اور مردوں کو زندہ کرتے اور میں تو کہوں گا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ کرنا بھی اس لحاظ سے معجزہ ہی ہے۔ کیونکہ معجزہ کے تقاضوں کے مطابق یہ واقعہ تخلیقِ کائنات کے بعد سے ابد تک صرف ایک ہی دفعہ ایک خاص نبی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ کی شان اور قدرتِ کاملہ کا اظہار بھی ہوتا ہے اور ابلیس کا اس سے انکار کے باعث جنت سے بحکم الٰہی نکالا جانا شامل ہے۔ کونسا ایسا مسلمان ہے۔ جسے یہ نہیں معلوم۔ کہ سجدہ صرف خداوند تعالےٰ کو ہی کرنے کا حکم ہے۔ لیکن کیا اللہ تعالےٰ کا یہ ابدی حکم فرشتوں کیلئے عارضی طور پر معطل نہیں کر دیا

گیا تھا۔ تاکہ وہ آدم علیہ السلام کو بحکم خصوصی سجدہ کر سکیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ معجزات کے احکام الٰہی خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں، عارضی ہوتے ہیں اور ان کا اطلاق صرف خاص حالات میں، خاص وقت تک، خاص انبیاء علیہ السلام تک ہی محدود ہوتا ہے۔

دوسری بات جس کی بناپر یہ حضرات دیدار الٰہی کی نفی کرتے ہیں۔ وہ شریک کی حضرت انس رضؓ سے وہ روایت ہے۔ جو صحیح بخاری میں بھی درج ہے اور جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضورؐ معراج پر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو رب ذوالجلال آپ کے اتنا قریب ہوا کہ فاصلہ صرف بقدر دو کمان رہ گیا یا اس سے بھی کم۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے نزدیک یہ واقعہ سورہ نجم سے متعلق ہے اور اس میں دو کمانوں کے فاصلہ تک جو نزدیک آنے کا ذکر ہے۔ وہ بقول حضرت عائشہ رضؓ جبرائیل علیہ سلام ہیں۔ لیکن جو حضرات شریک کی حضرت انس رضؓ سے اس روایت کی حمایت میں ہیں۔ اُن کے نزدیک یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو دو مرتبہ پیش آیا۔ اس میں آسمان کے بلند کنارے سے نیچے اترنے والے اور دو کمانوں کے فاصلہ تک یا اس سے بھی قریب تر ہونے والے جبرائیل علیہ سلام نہیں تھے بلکہ خود اللہ تعالےٰ ہی تھے[1]۔ امام بیہقی، ابن کثیر اور سید سلیمان ندوی وغیرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کی روایت کے حق میں معلوم ہوتے ہیں اور شریک کی حضرت انس رضؓ سے روایت پر بظاہر معترض ہیں۔ لیکن ابن کثیر سورۃ بنی اسرائیل کی تفسیر کے دوران صفحہ ۱۱ پہ بیہقی کی کتاب دلائل النبوۃ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ۔

"میں پھر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا دیا گیا اور مجھے ڈھانپ لیا۔ بس میرے اور اس کے درمیان صرف بقدر دو کمانوں کے فاصلہ رہ گیا۔ بلکہ اور قریب اور سدرۃ المنتہیٰ کے ہر ایک پتے پر فرشتہ آگیا اور مجھ پر پچاس نمازیں فرض کی گئیں اور فرمایا کہ تیرے لئے ہر نیکی کے عوض دس ہیں۔" اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی جو شریک کی اس روایت کے خلاف

ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب سیرۃ النبی کی جلد تین کے باب معراج میں صفحہ ۳۹۳ پر لکھا ہے کہ "آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے حجابانہ انبیاء علیہ السلام کے سامنے آتے ہیں اور وہ اس کے بعد نور کا حُلۂ بہشتی پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں اور اپنے اپنے رتبے اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیضِ ربانی سے معمور اور غرقِ دریائے نور ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو یہ درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوتگاہِ قدس میں باریابی پا کر قاب قوسین (دو کمانوں کے فاصلہ) سے بھی نزدیک تر ہو جاتے ہیں اور پھر وہاں سے اپنے منصب کا فرمانِ خاص لے کر اسی کاشانۂ آب و خاک میں واپس آ جاتے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ جسے سب نے متفقہ طور پر صحیح تسلیم کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ابنِ عساکر کے حوالے سے تفصیلاً درج ہے کہ ابولہب اور اس کا بیٹا عتبہ شام کے سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ اور بیٹے نے کہا کہ شام کے سفر پر جانے سے پہلے ایک مرتبہ ذرا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا کو ان کے سامنے گالیاں تو دے آؤں۔ چنانچہ یہ (عتبہ) آیا اور اس نے کہا۔ اے محمدؐ جو قریب ہوا اور اترا اور دو کمانوں کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک آ گیا۔ میں تو اس کا منکر ہوں۔ چنانچہ حضورؐ کی زبان سے اس گستاخ و بے ادب عتبہ کے لئے بد دعا نکل گئی کہ باری تعالیٰ اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس پر مقرر کر دے۔ عتبہ جب لوٹ کر ابولہب کے پاس آیا اور ساری باتیں اس نے اپنے باپ سے کہہ سنائیں تو ابولہب کو اپنے بیٹے کی جان کا خدشہ ہو گیا کہ یہ دعا اب رد نہ جائے گی۔ چنانچہ جب ابولہب کا قافلہ شام میں اپنی منزل پر پہنچا تو عتبہ کی جان کی حفاظت کے لئے اسے ایک مچان پر پہنچا دیا اور باقی سب لوگوں کو اس کی حفاظت پر لگا دیا۔ تب وہاں ایک شیر آیا۔ اس نے تمام پہرے داروں کو سونگھا لیکن چونکہ ان میں اس شیر کا مطلوب نہ تھا۔ اس لئے اس نے ان سب کو

تو کوئی گزند نہ پہنچایا اور چھلانگ لگا کر عتبہ کے پاس مچان میں پہنچ گیا اور عتبہ کو چیر پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ یہ تاریخی واقعہ شام میں زرقا یا سراۃ کے مقام پر پیش آیا۔

وہ محدثین جنہوں نے شریک کی حضرت انسؓ کی دو کمانوں کے فاصلہ والی مندرجہ بالا روایت پر اعتراض کیا ہے۔ ان کا شریک کی روایات کے متعلق فیصلہ ہے کہ جب شریک تنہا کسی روایت کو بیان کریں تو ان کی بات کو شاذ اور منکر قرار دیا جائے۔ لیکن جب ابن سعد اور ابو داؤد نے شریک کے وثوق کی شہادت دی ہے اور امام بخاری نے بھی اس روایت کو صحیح بخاری میں جگہ دی ہے۔ تو ان کی عائد کردہ شرط پوری ہو جاتی ہے کہ اس روایت کو بیان کرنے میں شریک تنہا نہیں ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی شریک کی اس روایت کے حق میں لکھا ہے۔ البتہ امام نووی نے جہاں حضرت انسؓ کی مندرجہ بالا روایت کو شریک کے اوہام کی وجہ سے رد کیا ہے۔ وہاں انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت "کہ آنکھیں اللہ کا ادراک نہیں کر سکتیں"، کو بھی عقلی استدلال کی بنا پر رد کر دیا ہے جس سے کہ اس معاملہ کو سمجھنے اور اس پر کوئی حتمی رائے قائم کرنے میں زیادہ مدد نہیں ملتی۔ البتہ جن حضرات کا مذہب یہ ہے کہ جناب رسول کریمؐ نے اللہ کا دیدار اپنی جسمانی آنکھوں سے کیا ہے۔ ان کے موقف سے شریک کی روایت کو تقویت ملتی ہے۔ ان حضرات میں ابن سعد اور ابو داؤد کے علاوہ ابن عباسؓ، کعبؓ، حسنؓ اور عکرمہ بھی شامل ہیں۔ تفسیر ابن کثیر کے صفحہ ۶ پر جہاں سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر درج ہے۔ بزار کی بھی ایک روایت ہے کہ حضورؐ نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا۔ امام احمد سے لوگوں نے پوچھا کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے قول کو ہم کس چیز سے اٹھائیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ قولِ مصطفیٰ سے کیونکہ قولِ نبی حضرت عائشہؓ کے قول سے اکبر ہے اور قولِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہے۔ رَأَيْتُ رَبِّيْ یعنی میں نے اپنے رب کو دیکھا۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ کے متعلق نقاش لکھتے

ہیں کہ انہوں نے فرمایا "رآہ۔ رآہ" اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوت حصہ اول کے صفحہ ۳۱۳ پر لکھتے ہیں کہ جب لوگوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں (دیکھا) اسی طرح قرآن حکیم از مولانا شاہ محمد احمد رضا خاں مع تفسیر از مولانا سید محمد نعیم الدین میں درج ہے کہ بخاری و مسلم دونوں صحیحین میں درج ہے کہ قریب ہوا جبار رب العزت ترمذی میں ہے کہ محمد مصطفےٰؐ نے اللہ تعالیٰ کو دو مرتبہ دیکھا۔ حضرت جعفر صادقؓ نے سورہ نجم کے حوالہ سے بتایا کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے بندے کو وحی فرمائی۔ جو فرمائی۔ یہ وحی بے واسطہ تھی۔ یعنی کہ اللہ تعالےٰ اور اس کے حبیبؐ کے درمیان کوئی واسطہ نہ تھا۔ اسی طرح حضرت حسنؓ کا ارشاد ہے کہ سورہ نجم میں " استوٰی " کی اسناد اللہ کی طرف ہے نہ کہ جبرائیل کی طرف۔

حضرت انسؓ بن مالک نے واقعہ معراج کی تمام تفصیل کو حضرت ابوذرؓ اور حضرت مالکؓ بن صعصعہ سے سنا اور صرف ان تینوں اکابر صحابہ نے ہی اس واقعہ معراج کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لیکن حضرت انسؓ کا بیان ان دونوں کے بیان سے زیادہ مفصل ہے۔ حضرت ابوذرؓ اور حضرت مالکؓ بن صعصعہ نے یہ تصریح کی ہے کہ ان دونوں نے واقعہ معراج کو لفظ بلفظ اور حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے سنا اور اس طرح بھی حضرت انسؓ کی روایت کو مزید تقویت ملتی ہے۔

مندرجہ بالا جو صورتِ حال بیان ہوئی ہے۔ وہ حضرت انسؓ کی شریک کے حوالے روایت کے حق میں جاتی ہے۔ اب ہم واقعہ معراج کے دوسرے رخ کا جائزہ لیتے ہیں۔ جو کہ اس روایت کے خلاف ہے۔ دَورِ حاضر میں اس روایت کے خلاف تفصیل کے ساتھ روشنی سید سلیمان ندوی نے ڈالی ہے۔ واقعہ معراج پر انہوں نے کم و بیش نوے صفحات سپردِ قلم کئے ہیں۔ انہوں نے صحیحین کی تمام روائتوں کو ملا کر معراج کے سوانح و مشاہدات

کا ایک جامع بیان لکھا ہے۔ جس میں یوں لکھا ہے۔ کہ "جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو یہاں حضرت جبرائیل (علیہ سلام) اپنی اصلی کمالی صورت میں آپؐ کے سامنے نمودار ہوئے۔ پھر شاہدِ مستورِ ازل نے چہرہ سے پردہ اٹھایا اور خلوت گاہِ راز میں ناز و نیاز کے وہ پیغام ادا ہوئے۔ جن کی لطافت و نزاکت الفاظ کے بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتی"۔ اس کے بعد یہاں سلیمان ندوی صاحب نے یہ تو لکھ دیا ہے کہ "فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی"، لیکن اگر وہ اس "شاہدِ مستور ازل" کی نشاندہی کر دیتے اور "مآ اوحٰی" کے آگے سورہ نجم کی مزید آیت "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى" لکھ دیتے۔ تو وضاحت ہو جاتی کہ یہ شاہدِ مستور ازل کون ہے۔ جس نے کہ وحی کی جو وحی کی اور یہ کہ "آنکھ نے جو دیکھا دل نے اسے نہ جھٹلایا" سے کیا مراد ہے۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں کہ ہم ان کی سیرت النبیؐ کے اوراق میں اس وضاحت کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ لہٰذا جلد سوم کے صفحہ ۲۷۳ پر مولانا ندوی صاحب یہ بیان کرتے ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مکالمۂ الٰہی کے تینوں مذکورۂ بالا طریقوں سے خدا کی ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بلکہ واقعہ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے۔ جہاں حبیب و محبوب کے درمیان قاصد و پیامبر سرے سے بیگانہ تھے۔ جہاں زماں و مکاں اور جلوہ و نگاہ کی شرکت بھی مخلِ تنہائی تھی۔ جہاں نہ کوہِ سینا تھا۔ نہ برقِ طور۔ دشتِ یمن تھا نہ نخل وادی۔ صحبت سرمدی سامعہ نواز تھی اور حقیقتِ محمدی گوش سامع۔ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (نجم) پھر اس نے اپنے بندے سے چپ چاپ باتیں کیں۔ جو باتیں کیں"۔ ندوی صاحب کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ان کے مطابق معراج پر حضورؐ کی اللہ تعالےٰ سے ہمکلامی ہوئی۔ نہایت چپکے سے بڑے ناز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ جن کا مقرب ترین فرشتے تک کو کچھ علم نہ ہو سکا۔ حالانکہ فرشتوں کو کمال کا سماع پر تصرف حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہمکلامی تو صرف اسی وقت ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ جبکہ حضورؐ اللہ تعالےٰ کے عین سامنے ہوں اور درمیان میں

کوئی حجاب بھی نہ ہو اور اگر یہ بات ایسے ہی ہے تو پھر یہ ہم کلامی دیدارِ الٰہی کی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن ندوی صاحب واقعہ معراج کے بیان میں دیدار الٰہی کی نفی کرتے ہیں اور پھر اس میں اس مذکورہ ہمکلامی کا نہ تو ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی اس مقام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جہاں معراج کے دوران یہ ہمکلامی ہوئی تھی اور نہ ہی یہ بتاتے ہیں کہ اس ہمکلامی کے دوران جبرائیلؑ کہاں تھے اور اللہ تعالٰے اور حضور سے کتنے دور تھے۔ پھر سلیمان ندوی صاحب آگے چل کر آخر میں صفحہ ۴۸۲ پر یوں رقمطراز ہیں غور سے ملاحظہ فرمائیں کہ "حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معراج کے روحانی مشاہدات و مناظر اور ملکوتی آیات و مظاہر کا قریش سے تذکرہ کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ یہ راہِ حق سے دیدہ و دانستہ (غوایت) یا نادانستہ (ضلالت) بھٹک گیا ہے یا اپنے دل سے بنا کر یہ جھوٹی باتیں بیان کرتا ہے۔ یہ انہوں نے کیوں کہا؟ اس لئے کہ روحانی جلوے کے دیکھنے کی ان کے پاس آنکھیں نہ تھیں۔ صوتِ سرمدی کے سننے کی ان کے کانوں میں طاقت نہ تھی۔ اسرارِ ملکوتی کے سمجھنے کے لئے ان کے سینوں میں دل نہ تھے۔ خدا نے کہا کہ یہ جو کچھ تھا اور جو کچھ معلوم ہوا۔ یہ ایک بڑی طاقت و قدرت اور علم و عقل والی ہستی کی جلوہ انگیزیاں تھیں۔ وہ کبھی اتنا دور تھا کہ آسمان کے کناروں میں نظر آیا اور کبھی اتنا قریب کہ دو کمانوں کے فاصلہ سے بھی قریب تھا۔ کون جھکا۔ کون قریب آیا؟ کون دو کمانوں کے فاصلہ تک آ کر رہ گیا؟ کیا خدا نہیں۔ کیا جلوۂ خدا؟ شاید" مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ندوی صاحب دیدارِ الٰہی کے قائل تو نہیں لیکن جلوۂ الٰہی کے ہیں اور دیدار الٰہی اور جلوۂ الٰہی میں ان کے نزدیک کیا فرق ہے۔ یہ تو وہی جانیں۔ لیکن ہمارے نزدیک تو دیدارِ الٰہی بھی جلوۂ الٰہی ہی ہے۔

لیکن چونکہ سید سلیمان ندوی صاحب کسی مقام پر اپنے تمام حوالہ جات و دلائل کے سامنے [illegible] کہتے ہیں کہ آسمان کے بلند کنارے سے نیچے اتر کر آنے والے جو دو کمانوں

کے فاصلہ سے بھی قریب تر ہو گئے اور جن کا ذکر سورہ نجم میں بیان ہے۔ وہ جبرائیل تھے اور کسی مقام پر انہیں شاہد مستور ازل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اب سورۂ نجم کی اُن آیاتِ (نشانیوں) مبارکہ کی طرف رجوع کریں، جو معراج کے واقعہ سے متعلقہ ہیں۔ اللہ تعالےٰ ہمیں توفیق عطا کرے اور ہماری مناسب راہنمائی فرمائے کہ ہم اللہ کی نشانیوں کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اصل صورت حال کی نشاندہی کرنے میں اللہ کی ان نشانیوں کی بدولت و صدقہ کامیاب ہو سکیں۔ آمین۔

سورہ نجم کی معراج سے متعلقہ آیات یہ ہیں۔ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰىۙ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰىۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰىؕ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰىۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰىۚ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰىؕ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰىۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰىؕ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰىۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى

ترجمہ: اسکو سکھایا سخت قوتوں والے نے۔ صاحبِ قوت ہے۔ پس پورا نظر آیا اور وہ بلند کنارے کے بیچ تھا۔ پھر وہ نزدیک ہوا۔ پس اتر آیا۔ پس تھا قدر دو کمان کے یا (اس سے بھی) زیادہ نزدیک۔ پس وحی کی اس نے (اللہ نے) اپنے بندے کو جو وحی کی۔ نہیں جھوٹ بولا دل نے اس کے جو کچھ دیکھا۔ کیا پس جھگڑتے ہو۔ تم اس سے (رسولؐ سے) اوپر اس چیز کے جو دیکھا ہے۔ (اس نے) اور البتہ یقیناً دیکھا ہے۔ اس نے اسکو ایک بار سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک نزدیک اس کے جنت الماوٰی ہے۔ جسوقت کہ ڈھانکا تھا۔ بیری کو جو کچھ کہ اس کو ڈھانک رہا تھا۔ نہیں کجی کی (اس کی) نظر نے اور نہ زیادہ بڑھ گئی (وہ) یقیناً اس (رسولؐ) نے دیکھا اپنے پروردگار کی عظیم نشانیوں کو۔

سورہ نجم کی ان آیات (نشانیوں) پر ہمیں غور و فکر کرنا ہے اور ان کی مدد سے

ہمیں یہ کھوج لگانا ہے کہ یہ زبردست قوتوں والا کون تھا۔ جو کہ آسمان کے بلند کنارے سے نیچے اترا اور دو کمانوں کے فاصلہ تک قریب ہوا۔ کیا یہ خود باری تعالےٰ ہی تھے یا کہ جبرائیل علیہ السّلام۔ اس سلسلہ میں ہماری راہنمائی کے لئے ہمیں اترنے والے کی جو سب سے پہلی نشانی بتائی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اترنے والا وہ ہے۔ جس نے کہ حضورؐ کو (قرآن و حکمت) سکھایا۔ سورہ اعراف کی آیات ۱۵۷، ۱۵۸ میں حضورؐ کے اُمّیؐ ہونے کا ذکر ہے۔ یعنی کہ آپ نے دنیا میں نہ کسی سے کچھ پڑھا نہ سیکھا۔ لیکن جو علم و حکمت بھی آپ نے سیکھا۔ وہ خدا سے سیکھا۔ جیسے کہ سورہ رحمٰن میں آیا ہے کہ "اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ ترجمہ: رحمٰن (خدا) نے سکھایا۔ (تمہیں) قرآن۔ آگے بیان ہے۔ "پیدا کیا (اس نے) آدمی کو (اور) سکھایا۔ اسے بولنا" اسی طرح سورہ علق میں ہے۔ "اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ ترجمہ: پڑھ اور تیرا (رسولؐ کا) پروردگار بہت کرم کرنیوالا ہے۔ جس نے سکھایا ساتھ قلم کے" ان آیات سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ سکھانے والا خود خدا ہے۔ دوسری نشانی اترنے والے کی یہ ہے کہ وہ سخت قوتوں والا ہے۔ لیکن سورہ تکویر کی آیت ۱۹، ۲۰ میں ہے "یقیناً" یہ پیغام پہنچانے والے بزرگ (جبرائیل) کا کہنا ہے۔ (وہ) قوت والا ہے۔ صاحب عرش کے نزدیک مرتبے والا" لیکن سورہ انفال کی آیت ۵۲ میں ہے۔ یقیناً اللہ قوتوں والا ہے۔ سخت عذاب کرنے والا" اسی طرح سورہ حج آیت ۴۰ میں بیان ہے۔ "یقیناً اللہ قوتوں والا ہے۔ غالب" اور یہی بات اسی سورہ کی آیت ۷۴ میں پھر دہرائی گئی ہے۔ اسی طرح سورہ مومن کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہے کہ "پس کفر کیا انہوں نے۔ پس پکڑا اُن کو اللہ نے۔ یقیناً وہ قوتوں والا ہے۔ سخت عذاب کرنیوالا" اس سے ظاہر ہوا کہ جہاں اللہ نے جبرائیل کو "قوت والا" کہا ہے۔ وہاں اس نے خود اپنے آپ کو بار بار "قوتوں والا" کہا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ہمیں یہی سمجھنا پڑتا ہے

کہ وہ خدا ہے اور دوسرے اس لحاظ سے بھی کہ جب خدا خود کو محض "قوتوں والا" بھی کہتا ہے۔ وہاں جب وہ "سخت قوتوں والا"۔ یعنی کہیں "زیادہ قوتوں والا" کہتا ہے تو اسے ہم پھر جبرائیل کس طرح سمجھ لیں۔ نعوذ باللہ اس طرح تو اسکا مطلب یہ نکلے گا کہ خدا تو محض "قوتوں والا" ہے۔ لیکن جبرائیل علیہ سلام کہیں "زیادہ قوتوں والا" ہے۔ پھر اس میں اترنے والے کی تیسری نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ "اس نے وحی کی جو وحی کی"۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو وحی رسالت مآبؐ کو کی۔ وہ کسی اور نے نہیں سُنی۔ یعنی جس وقت ہم کلامی میں یہ ناز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ اسوقت نہ کوئی دوری تھی، نہ حجاب تھا اور نہ کوئی دوسرا موجود۔ اس طرح یہ مقام ہم کلامی کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور دیدارِ الٰہی کی بھی۔ اس سے اگلی نشانی اترنے والے کی یہ ہے کہ جب حضورؐ سے لوگ اس معراج کے واقعہ کی عظمتوں کو سنیں گے۔ تو ان کی عقل و فہم ان باتوں کو سمجھنے سے قاصر ہونگی۔ اس وجہ سے وہ ان عظمتوں کی نفی کرینگے اور ان کے بارے میں جھگڑا کرینگے۔ لیکن اللہ تعالےٰ یقین دتسلّی دے رہا ہے۔ کہ آپ نے جو کچھ دیکھا۔ اس کے بارے میں آپ کے دل نے جھوٹ نہیں بولا۔ اس کی ایک اور نشانی یہ بھی ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو یہ بتلاتے کہ انہوں نے معراج پر آسمان کے بلند کنارے پر اور پھر سدرۃ پر جبرائیل علیہ سلام کو دیکھا تو جو مسلمان مرتد ہوگئے تھے۔ وہ شاید شک وشبہ میں نہ پڑتے اور معراج کے واقعہ کو تسلیم کر لیتے۔ کیونکہ انہیں پہلے ہی معلوم تھا کہ آپ نے جبرائیل کو بار بار وحی لاتے ہوئے دیکھا ہے اور آسمان کے بلند کنارے پر بھی دیکھا ہے۔ لیکن سورہ تکویر میں جہاں جبرائیل کا ذکر ہے۔ وہاں یہ ذکر نہیں ہے کہ وہ بلند کنارے سے نیچے اترا تھا۔ اور قاب وقوسین کے فاصلے تک نزدیک ہوا تھا۔ پھر ہمیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ دوسری مرتبہ آپ نے اسے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا اور اس دیکھنے میں نظر نے کوئی کجی نہیں کی۔ یہ یقین دہانی اس لئے

کرائی جارہی ہے۔ کیونکہ اس کی اللہ تعالیٰ ضرورت محسوس کر رہا ہے۔ اگر یہ اترنے والا جبرائیل علیہ سلام ہوتے تو پھر سورہ نجم میں اس یقین دہانی کرانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا دیدار کے معاملہ میں اس یقین دہانی کی فوراً ضرورت درکار ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عام لوگوں کے لئے خود ہی قرآن پاک میں ارشاد فرمایا ہوا ہے کہ "آنکھیں (لوگوں کی) اس (اللہ) کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ پھر آخری نشانی یہ بیان فرمائی ہے کہ یقیناً رسولِ پاک نے اپنے پروردگار کی عظیم نشانیوں کو دیکھا۔ ان تمام نشانیوں میں سے جو کہ آپؐ نے معراج میں دیکھیں۔ یہ خدا کا دیدار ہی تھا جس نے ان نشانیوں کو عظیم بنایا۔ اگر اترنے والے جبرائیلؑ ہی ہوتے تو یہ نشانی اس وجہ سے عظیم کہلانے کی مستحق نہ ہوتی کیونکہ جبرائیل کو تو حضورؐ پہلے ہی اس کی اصلی شکل میں دیکھ چکے تھے۔

معراج کی عظمتوں کا تو درحقیقت یہ حال تھا کہ حضورؐ کو معراج پر بحکم الٰہی لے جانے کے لئے جبرائیلؑ مامور ہوئے تھے۔ وہ تو آغازِ سفرِ معراج ہی سے حضورؐ کے ساتھ ساتھ تھے۔ وہ کسی مقام پر حضورؐ سے علیحدہ نہ ہوئے تھے کہ پھر وہ آسمان کے بلند کنارے سے آپؐ کے قریب اترتے اگر انہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہی جانا تھا۔ تو وہ ان کے قریب ترین اس وقت تھے۔ جس وقت کہ معراج پر روانہ ہونے سے پہلے جبرائیلؑ نے آپؐ کا سینہ چاک کر کے آبِ زمزم سے دھویا تھا۔ دراصل معراج کا سفر تو اللہ تعالیٰ کے پاس جانے کا اہتمام تھا۔ تمام فرشتوں کا مقام تو اس وقت سدرۃ المنتہیٰ پر تھا۔ جہاں وہ حضورؐ کے دیدار سے فیضیاب ہونے کے لئے جمع تھے۔ شاید کسی کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے نہ آسکے۔ اس لئے یہ یاد کرانا نامناسب نہ ہوگا کہ فرشتوں کا مقام تو اس دن ہی معلوم ہوگیا تھا۔ جبکہ انہیں حضرت آدم علیہ سلام کو سجدہ کرنے کا حکم الٰہی ہوا تھا اور حضورؐ تو تمام انبیاء علیہ سلام کے سردار

ہیں اور اللہ تعالے کی تمام مخلوق میں افضل ترین و بزرگ ترین ہیں اور اس طرح وہ اللہ تعالے کے مقرب ترین فرشتے سے بھی اللہ کے زیادہ نزدیک ہیں. ہم سب یہ تو ماننے کو بظاہر تیار ہیں کہ معراج پر اللہ تعالے نے آپؐ کو دوزخ و جنت کے مناظر دکھائے گیا جنت کے مناظر میں ایک منظر یہ نہیں ہے کہ جب مومن لوگ جنت میں داخل ہونگے. تو اللہ ان کو سلام کہیگا اور ان سے کلام بھی کریگا اور جنت میں اللہ کا دیدار بھی ہوگا. جو حضرات معراج میں دیدارِ الٰہی کی نشاندہی کرتے ہیں, وہ تفصیل سے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اللہ تعالے نے پہلے آپ پر یہ درود پڑھا" ھوالذی یصلی علیکم و ملآئکتہٗ لیخرجکم من الظلمٰتِ الی النور. پھر آپ کو اسلام وعلیکم ایھا النبیؐ کہا. اور ان تمام باتوں کی سورہ احزاب سے تصدیق ہوتی ہے. جہاں جنت میں داخل ہونے والوں کا ذکر ہے.

اگر ہم مندرجہ بالا صورتِ حال کا جائزہ لیں تو واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ امام بیہقی سید سلیمان ندوی اور ابنِ کثیر نے بظاہر دیدارِ الٰہی کی نفی کی ہے. لیکن امام بیہقی اور سلیمان ندوی نے شریک کی حضرت انسؓ سے قاب و قوسین والی روایت کو درست تسلیم کیا ہے. جس کی بحث اس سے پہلے کی جا چکی ہے. ابو لہب اور اس کے بیٹے عتبہ کے واقعہ سے بھی شریک کی روایت ثابت ہوتی ہے. سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر ابنِ کثیر کے صفحہ ۲۲ پر حضرت اُمِّ ہانیؓ سے منقول ہے. کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا میں جاتا ہوں. اور جو (معراج میں) دیکھا ہے. وہ قریش سے بیان کرتا ہوں. میں نے آپؐ کا پلہ تھام لیا اور عرض کیا کہ لِلّٰہ آپؐ اپنی قوم میں اسکو بیان نہ کریں. وہ آپ کو جھٹلائیں گے. آپ کی بات ہرگز نہ مانینگے اور اگر بس چلا تو آپ کی بے ادبی کرینگے. لیکن آپ نے جھٹکا مار کر اپنا دامن میرے ہاتھ سے چھڑا لیا اور سیدھے قریش کے مجمع میں پہنچ کر ساری باتیں بیان فرما دیں. جبیر بن مطعم کہنے لگا. بس حضرتؐ آج ہمیں معلوم ہو

گیا۔ اگر آپؐ سچے ہوتے تو ایسی باتیں ہم میں بیٹھ کر نہ کہتے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے واقعہ معراج قریش کے کفار میں بیان کیا اور ابولہب کے بیٹے عتبہ نے جو واقعہ حضورؐ کے واسطہ سے سنا۔ ملک شام کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اسے جھٹلانے کیلئے آپ کے پاس آیا اور جب اس نے قاب و قوسین کے واقعہ کو خدا کے حوالہ سے جھٹلایا تو آپ نے اس کے لئے اپنے خدا سے بددعا مانگی۔ جو پوری ہوئی اور یہ اسلامی تاریخ کا ایسا اہم واقعہ ہے۔ جسے ہمارے بزرگانِ دین میں سے کسی نے آج تک نہیں جھٹلایا۔

البتہ اس مقام پر یہ سوال ذہن میں ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ جب جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ معراج کو کفار میں بھی بیان کرنا اتنا اہم سمجھتے تھے۔ تو کیا وجہ تھی کہ جن جن لوگوں نے اس واقعہ کو سنا۔ سب آزمائش میں پڑ گئے۔ کفار نے تو سرے سے ہی اس واقعہ کو من گھڑت اور جھوٹا قرار دیا۔ بعض مسلمان بھی اس واقعہ کو سنکر شک و شبہات میں مبتلا ہو کر مرتد قرار پائے۔ یہ تمام لوگ تو اس آزمائش میں یکسر فیل ہو گئے۔ باقی مسلمانوں نے جب معراج کا بیان سُنا تو وہ بھی اس کے تفصیلی اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔ صرف حضرت ابوبکرؓ ایسے بزرگ تھے۔ جنہوں نے اس واقعہ کی ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر کھلے دل سے پوری پوری تائید کی اور اس کی بدولت وہ صدیق کے دلنشیں لقب سے نوازے گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ واقعہ معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے اللہ نے اتنی عظمتیں پنہاں رکھی ہیں کہ انسانی عقل و فہم کے ادراک سے باہر ہیں اور اس حقیقت کی نشاندہی سورہ بنی اسرائیل کی آیت میں یوں کی گئی ہے۔ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً" لِّلنَّاسِ۔ ترجمہ اور ہم (اللہ) نے جو رویا (دکھاوا) تم کو دکھایا۔ اسکو ہم نے لوگوں کے لئے آزمائش بنایا ہے۔" یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ حضرت ابنِ عباسؓ جو حضورؐ کے

چچازاد بھائی تھے۔ ان سے بڑھ کر عربی لغت کا واقف شاید ہی کوئی اور ہو۔ جب وہ "رویا" کو عین آنکھ کا مشاہدہ قرار دیتے ہیں، تو پھر کس کو آنکھ سے مشاہدہ کرنے سے انکار ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک تو اس آیتِ مبارکہ کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ اللہ تعالٰے اِس آیتِ مبارکہ کی رو سے حضورؐ کو یہ تسلی دے رہا ہے کہ اس نے حضورؐ کو اس معراج میں اپنی وہ وہ نشانیاں دکھائی ہیں کہ لوگ ان کو نہ باآسانی سمجھ سکیں گے اور نہ آپؐ کی روحانی عظمتوں کی حقیقتوں کو پا سکیں گے۔ جس کی وجہ سے وہ آزمائش اور امتحان میں مبتلا ہو جائینگے اور آج واقعہ معراج کو گذرے اگرچہ چودہ سو سال گزر چکے ہیں، اس آیتِ مبارکہ کی صداقت پوری طرح سے ثابت ہو رہی ہے۔ اِس آیتِ مبارکہ میں جن لوگوں کو آزمائش میں مبتلا کیا گیا ہے۔ اُن کی یہاں نشاندہی ہو رہی ہے اور یہ لوگ وہ ہیں، جن کے دلوں میں زیادہ یا کم کجی موجود ہے اور وہ آپؐ کو کسی نہ کسی انداز میں واقعہ معراج میں آپ کے لئے جو عظمتیں پنہاں ہیں۔ اس کے اہل نہیں سمجھتے اس معراج کے دکھاوے نے جو لوگوں کو آزمائش میں مبتلا کیا ہے۔ اس کا ذرا اندازہ تو لگائیں کہ بعض لوگ ہیں جو سرے سے واقعہ معراج کی نفی کرتے ہیں۔ بعض سمجھتے ہیں کہ یہ صرف روحانی معراج تھا۔ جو خواب کی حالت میں ہوا۔ بعض ہیں جو کہتے ہیں کہ معراج تو ضرور جسمِ مبارک کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن اس میں دیدارِ الٰہی نہیں ہوا۔ بعض ہیں کہ کہتے ہیں کہ دیدار تو ہوا تھا۔ لیکن یہ صرف دل کی آنکھوں کے ساتھ ہوا تھا۔ بعض ہیں جو کہتے ہیں، کہ حضورؐ نے اللہ کو نہیں بلکہ اس کے نور کو دیکھا تھا اور بعض ہیں، جو کہتے ہیں کہ حضورِ رسالت مآبؐ نے دیدارِ الٰہی اپنی ظاہرہ جسمانی سر کی آنکھوں سے کیا تھا۔ میرے نزدیک یہی مسلک صحیح ہے اور کہنے والا تو کہہ رہا ہے کہ میں نے جو دکھاوا (معراج) تمہیں دکھایا ہے۔ اسے لوگوں کیلئے آزمائش بنا دیا ہے اور اس آزمائش میں صرف وہی شخص کامیاب و کامران ہو سکتا ہے۔ جسے اللہ تعالٰے توفیق دے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے اللہ کو دل سے دیکھا ہے۔ اور ابنِ ابی حاتم میں ہے کہ صحابہؓ کے اس سوال کے جواب میں آپؐ نے فرمایا۔ میں نے اپنے دل سے اپنے رب کو دو دفعہ دیکھا۔ قرآنِ پاک کے مطابق دل کے دیکھنے کو ظاہری جسمانی آنکھوں سے دیکھنے پر فضیلت حاصل ہے اور دل سے دیکھنے سے ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کی لازماً نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ دل سے حضور کا دیکھنا تو حضور کی ظاہری آنکھوں سے دیکھنے میں شامل ہے۔ کیونکہ رب ذوالجلال کے دیدار کے اثرات تو قلب پر ہی وارد ہونے تھے اور جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن بھی حضور کے قلب پر ہی اتارا گیا تھا۔ کیونکہ یہ صرف قلب ہی ہے جو اللہ تعالےٰ کی عظمتوں کا متحمل ہو سکتا ہے نہ کہ جسم کا کوئی اور حصہ۔

مسند امام احمد میں ہے کہ حضرت ابوذرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ میں نے اسے (اللہ کو) نور دیکھا۔ وہ تو نور ہے۔ میں اسے کیسے دیکھ سکتا۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی دو سندوں سے درج ہے۔ مجھ عاجز و مسکین کے نزدیک اس حدیث مبارکہ کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ نور ہے اور میں نے اُسے نور ہی دیکھا۔ (لیکن) میں اسے (اپنے طور) کیسے دیکھ سکتا۔ یعنی میں نے اسے اس کی توفیق ہی سے دیکھا ہے اور وہ یہ سب کچھ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

واقعہ معراج اور احادیث نبوی

اس ضمن میں ایک اور اہم مسئلہ جو غور طلب ہے۔ وہ جناب رسالت مآبؐ سے منسوب احادیث مبارکہ کا ہے۔ یہ درست ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے کافی عرصہ بعد اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کی ہدایت و راہنمائی کیلئے آپ کی احادیث کو مستقل طور پر کتابی شکل میں اکٹھا کر کے محفوظ کر لیا جائے۔ کیونکہ خدشہ یہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ان احادیث کی غیر موجودگی

میں مسلمانوں کے لئے حضورؐ کے اسوہ حسنہ پر پیروی کرنا مشکل ہوتا جائیگا۔ لہٰذا جس وقت یہ کام شروع ہوا۔ تو دشمنانِ اسلام نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سوچے سمجھے مذموم منصوبے کے تحت اپنی من گھڑت احادیث کے ذریعے اس نیک کام میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کی اس ناپاک سازش کا مسلمانوں کو جلد ہی علم ہو گیا۔ اس لیئے وہ احادیث کو اکٹھا کرنے میں ہر ممکن احتیاط برتنے لگے۔ وہ اس وقت تک کسی حدیث کی صحت کو قبول نہ کرتے۔ جب تک وہ اس کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہ ہو جاتے۔ اس وجہ سے دشمنانِ اسلام اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہ ہو سکے اور وہ کامیاب بھی کیسے ہو سکتے تھے۔ جبکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے دین کی نگہبانی خود اپنے ذمہ لی ہوئی ہے۔ سورہ حجر میں ارشادِ ربانی ہے کہ "ہم ذاللہ) ہی نے اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں"، اس آیتِ مبارکہ میں اگر "ذکر" کے معنی صرف "قرآن" ہی کا نازل کرنا ہوتا تو شاید آیت میں لفظ "ذکر" کی بجائے لفظ "قرآن" ہی استعمال ہوتا۔ جیسے کہ سورہ نحل کی آیت ۸۹ میں یوں درج ہے۔ "اور اتاری ہم نے اوپر تیرے کتاب (قرآن) ہر چیز کے بیان کرنے والی" یہاں اس آیت مبارکہ میں قرآن کی نشاندہی کرنے کے لئے کتاب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے۔ کہ یہ کتاب وہ ہے جو ہر چیز کو بیان کرتی ہے۔ تاکہ ہم اس کی خوبیوں کی مدد سے بغیر کسی شک و شبہ کے یہ سمجھ لیں کہ یہ کتاب قرآن ہے۔ لیکن چونکہ سورہ حجر میں لفظ "قرآن" یا "کتاب" کی بجائے لفظ "ذکر" استعمال ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو صرف "قرآن" کی بجائے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ نہ کہ صرف "قرآن" کے معنوں میں اور اگر ہم "ذکر" کے معنوں کو محدود کرنے کی کوشش کرینگے تو یہ قرآنِ حکیم کے اسلوب بیان کے خلاف ہوگا اور اگر قرآن پاک اپنے نازل ہونے کے چودہ سو برس کے بعد بھی یکسر [illegible]

ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی آیات کے معنوں میں بے حد وسعتیں ہیں۔ اس
لئے ہم لفظ "ذکر" کو ذکر کے معنوں میں ہی استعمال کریں گے اور اس "ذکر" میں
وہ ذکر بھی شامل سمجھیں گے۔ جس کا قرآن میں یوں حوالہ دیا گیا ہے۔ "فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ
یعنی تم (رسولؐ) میرا ذکر کرو اور میں (اللہ) تمہارا ذکر کرونگا۔" اور پھر "ذکر"
کے متعلق سورہ الانشراح میں یوں بیان ہوا ہے۔ "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ یعنی ہم
(اللہ) نے تیرے واسطے تیرا (رسولؐ کا) ذکر بلند کیا۔" کیا یہ ذکر اللہ کی نگہبانی میں محفوظ
نہیں ہے؟ صاف واضح ہو رہا ہے۔ کہ جس ذکر کو اللہ خود کرے۔ وہ محفوظ بھی ضرور ہو
گا۔ اللہ کے ذکر کو کون نیست و نابود کر سکتا ہے۔ اللہ کے ذکر میں قرآنِ پاک بھی شامل
ہے۔ حضورؐ پر درود بھی شامل ہے اور حضورؐ کا ذکر بھی شامل ہے۔ اور جس ذکر کو اللہ بلند
کرنے کا قصد کرے تو اس کے بلند کرنے کا سوال بھی تب ہی پیدا ہوتا ہے۔ جبکہ وہ ذکر
بھی اللہ کی نگہبانی میں جوں کا توں محفوظ ہو اور جوں جوں بلند ہوتا جائے تو اس ذکر
میں اللہ کی طرف سے اضافہ ہوتا جائے۔ حضورؐ کے ذکر میں احادیث نبوی شامل ہیں کیونکہ
وہ اللہ اور نبی پاک دونوں کے ذکر پہ مشتمل ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ احادیثِ نبوی اللہ
اور اس کے دین کے متعلق ہماری مناسب ہدایت و راہنمائی کے لئے ارشاداتِ
رسولؐ ہیں۔

البتہ یہاں اگر کسی کے ذہن میں یہ اعتراض پیدا ہو کہ جس "ذکر" کا اللہ نے نگہبان
ہونے کا ذمہ لیا ہے۔ سورہ حجر میں اس "ذکر" کی یہ نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ کہ وہ "ذکر"
نازل ہوا ہے۔ یعنی کہ وہ وحی کیا گیا ہے۔ اس لئے جو "ذکر" وحی نہ کیا گیا ہو۔ وہ اس "ذکر"
میں شامل نہیں ہے۔ تو اس بات کی وضاحت یوں ہے کہ سورہ نجم میں یوں ارشاد
باری تعالےٰ ہے۔ کہ "اور (حضورؐ) نہیں بولتے اپنی خواہش سے۔ (مگر) وہ تو وحی ہے
جو بھیجی جاتی ہے۔ (ان پر)"۔ اب اس آیتِ مبارکہ کے اگر ہم قرآن کی حد تک محدود

معنی لیں گے۔ تو اس کے معنی کچھ یوں ہو جائیں گے کہ حضورؐ قرآنِ پاک کی آیات کو تو
اپنی خواہش کے مطابق بنا کر بیان نہیں کرتے۔ وہ تو وحی کی جاتی ہیں۔ لیکن اگر ہم قرآنِ
حکیم کے معنی کی وسعتوں کے مطابق اس آیت کے معنی کرنا چاہیں گے۔ تو اپنے طور
پر معنوں کو محدود کرنے سے گریز کرتے ہوئے اس آیت میں استعمال شدہ لفظوں کی
سختی سے پابندی کرینگے اور وہ پابندی صرف اسی انداز میں قائم و برقرار رہ سکتی ہے۔
کہ اگر ہم اس آیت کے معنی بھی اس کے لفظوں کے مطابق ہی کریں۔ یعنی یہ کہ حضورؐ جب
بھی بولتے ہیں۔ چاہے وہ کسی معاملہ میں بولیں۔ چاہے وہ قرآن کی آیات مبارکہ ہوں
یا اُن کی احادیث۔ وہ کبھی اپنی خواہش کے مطابق نہیں بولتے۔ بلکہ جو کچھ بھی بولتے
ہیں۔ وہ صرف وہی ہوتا ہے جو ان پر اللہ تعالٰے کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک
آیتِ مبارکہ کے یہی معنی زیادہ صحیح و معتبر ہیں اور قرآنِ حکیم کے اسلوب بیان کے
مطابق بھی۔ اس لئے ہمیں اب خود کو صرف اتنا ہی مطمئن کرنا ہے کہ کیا حضورؐ اپنی
خواہشات کے تابع ہو کر بھی کبھی بولتے تھے۔ یا آپؐ ہمیشہ اللہ تعالٰے کی رضا و احکامات
کے تابع ہو کر بولتے تھے۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپؐ کبھی بھی اپنی خواہش سے
نہیں بولتے تھے۔ یعنی کہ آپ کے بولنے میں آپ کے نفس کو دخل نہ ہوتا تھا۔ سورہ بقر
میں حضورؐ کے متعلق ارشاد ہے کہ حضورؐ ہم کو پاک بھی کرتے ہیں۔ اس لئے جب آپ
ہماری نفسانی خواہشوں سے بھی ہمیں پاک کرنے کے منصب پر اللہ تعالیٰ کی جانب
سے فائز ہوئے ہوں۔ تو پھر آپ میں نفسانی خواہشات کے پیدا ہونے کا سوال ہی
پیدا نہیں ہوتا۔ آپؐ ہماری کثافتوں کو اُسی طرح دور فرماتے ہیں جس طرح کہ سورج
فضا کی کثافتوں کو مؤثر طور پر دُور کرتا ہے اور ہم سب یہ جانتے ہیں کہ سورج کا کسی
قسم کی کثافت سے آلودہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر سورج کثافت زدہ
ہو جائے تو دنیا میں زندگی جلد ہی ختم ہو جائے۔ لہٰذا حضورؐ نے جو کچھ بھی "ذکر" کیا۔ وہ

سب ان پر وحی کیا گیا اور وہ تمام ذکر جو نازل کیا گیا ہے۔ وہ اللہ کی نگہبانی میں محفوظ ہے
اس میں قرآنِ پاک بھی ہے اور احادیث نبوی بھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تو صرف قرآن ہی نازل کیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید اور کوئی ایسا ذکر نہیں، جسے اللہ نے نازل کیا ہو۔ لہٰذا صرف قرآنِ پاک ہی اللہ کی نگہبانی میں ہے اور ہماری ضروری دینی راہنمائی اور ہدایت کیلئے صرف قرآن ہی سے استفادہ حاصل کرنا ضروری۔ اگر ایک لمحہ کے لئے اس اندازِ فکر کو ہی صحیح مان لیا جائے۔ تب بھی یہ ضرورت لازمی طور پر بدستور شدت سے قائم رہے گی۔ کہ چونکہ اس قرآنِ مجید کو جو مکان و زماں پر محیط ہے اور جو اللہ تعالےٰ کی حکمتوں سے بھرپور ہے۔ ہم اس کو اپنے طور نہ سیکھ سکتے ہیں۔ نہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس لئے اس کے سکھانے کے لئے کوئی نہایت ماہر معلّم مہیا کیا جائے۔ لہٰذا سورہ بقر میں ارشاد ہے۔ کہ جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو قرآن سکھاتے ہیں، حکمت سکھاتے ہیں اور وہ کچھ بھی سکھاتے ہیں۔ جو کہ ہم نہیں جانتے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک اور قرآنِ پاک کا سکھلانا لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگر قرآن پاک محفوظ ہے تو قرآن کا حضورؐ سے سکھایا جانا بھی محفوظ ہے اور اس بات کا مطلب یہی ہوگا۔ کہ حضورؐ کے اقوال و ارشادات سب اللہ کی نگہبانی میں محفوظ ہیں۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہوتی ہے کہ اللہ ہمیں ہدایت دیتا ہے۔ کہ ہمارے لئے بہتر ہے کہ ہم حضورؐ کے اسوہ حسنہ کی پیروی کریں۔ یہ اسوہ حسنہ قرآن کی عملی تفسیر ہے۔ اس لیے یہ محفوظ ہے اور یہ اس لئے بھی محفوظ ہے۔ کیونکہ اسکا ذکر محفوظ قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ البتہ ہمیں یہاں اس بات پر ضرور توجہ دینی چاہیئے کہ جس وقت یہ "ذکر" جناب رسولِ پاک پر نازل ہوا تو سورہ حجر کی آیت ۶ کے مطابق کفار نے آپؐ کو دیوانہ کہتے ہوئے اس ذکر کو یکسر رد کر دیا۔ لیکن بعض مسلمانوں نے اس ذکر کو قرآن کی حد تک

مانتے ہوئے باقی ذکر کے نازل ہونے کو رد کر دیا۔ اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ
ہم سب خود کو اپنے تیئں مطمئن کریں کہ کیا یہ فکر کہیں کفار کی فکر سے کسی انداز میں ملتا
جلتا تو نہیں۔

سورہ نجم کی اس مذکورہ آیت " وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی " کی تفسیر ابن کثیر
میں درج ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول اور کوئی فرمان اپنے نفس کی
خواہش اور ذاتی غرض سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جس چیز کی تبلیغ کا آپؐ کو حکمِ الٰہی ہوتا ہے
آپؐ صرف اسے ہی اپنی زبانِ مبارک سے بیان کرتے ہیں۔ مسند احمد میں ہے۔ کہ
آپ نے فرمایا کہ ایک شخص جو کہ نبی نہیں ہیں۔ ان کی شفاعت سے مثل دو قبیلوں
کی گنتی کے یا ایک قبیلے کی گنتی کے برابر لوگ جنت میں داخل کئے جائیں گے۔ یہ قبیلے
ربیعہ اور مضر ہیں۔ اس ارشاد پر آپؐ سے ایک شخص نے استفسار کیا۔ کہ کیا قبیلہ ربیعہ
قبیلہ مضر سے نہیں ہے تو آپ نے جواب دیا کہ میں تو وہی کہتا ہوں۔ جو کہتا ہوں اور
مطلب اس بات کا یہ ہے کہ وہ اپنے جواب میں کوئی تبدیلی اپنی خواہش سے نہیں کر
سکتے۔ آپ تو صرف وہی کہتے ہیں، جو کہ آپ کو بذریعہ وحی کہنے کا حکمِ خدا ہوتا ہے۔ اسی
طرح مسند احمد کی ایک اور روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں
حضورؐ سے جو کچھ سنا کرتا تھا۔ اسے حفظ کرنے کے لئے لکھ لیا کرتا تھا۔ لیکن بعض قریش
نے مجھے ایسا کرنے سے روکا اور کہا کہ رسول اللہ ایک انسان ہیں، کبھی کبھی غصے اور غضب
~~میں بھی کچھ فرما دیا کرتے ہیں، چنانچہ میں لکھنے سے رک گیا لیکن بعد میں اس بات کا ذکر~~
میں نے (راہنمائی حاصل کرنے کیلئے) حضورؐ سے کیا۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ لکھ لیا
کرو۔ خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میری زبان سے سوائے حق بات
کے اور کوئی کلمہ نہیں نکلتا اور یہ حدیث ابو داؤد اور ابن ابی شیبہ میں بھی درج ہے
بزار میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔ میں تمہیں جس امر کی خبر اللہ کی طرف سے دوں۔ اس میں

کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا۔ یعنی کہ اس میں ہم لوگوں کو کوئی شک و شبہ نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ایسا کرنے کی ہمارے لئے ظاہرہ کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور مسندِ احمد میں تو یہاں تک بھی درج ہے کہ بعض صحابہؓ نے آپؐ سے بطور استفسار کہا کہ حضورؐ تو کبھی کبھی ہم سے خوش طبعی کر لیتے ہیں۔ آپؐ نے جواب دیا کہ اسوقت بھی میری زبان سے ناحق کلمہ نہیں نکلتا۔

چونکہ یہ مضمون نہایت اہم ہے۔ اس لئے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی غرض سے اب سید سلیمان ندوی ؒ کی سیرۃ النبی جلد سوم کے صفحہ ۳۳۸ کے حوالہ سے بھی لکھا جاتا ہے۔ لکھا ہے کہ سرمایۂ وحی کی جو دولت اسلام کو ہاتھ آئی۔ وہ قرآنِ پاک ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے۔ وہ حدیثِ صحیحہ کے اوراق کا خزانہ ہے اور مطلب اس بات کا یہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ بھی سرمایۂ وحی ہیں اور اس طرح یہ بھی قرآنِ پاک کی مانند اللہ کی نگہبانی میں ہیں۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے۔ کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ مجھے جو چیز دی گئی ہے۔ وہ وحی ہے۔ جو مجھ پر اتاری گئی۔ ابو داؤد کی حدیث میں ہے کہ "مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اتنا ہی اور یعنی وہ احکام و مواعظ جن کو جان نثاروں نے حرزِ جان بنا کر رکھا اور دوسروں کو سپرد کیا" مطلب اس حدیثِ مبارکہ کا بھی یہی نکلتا ہے کہ احادیث نبوی احکام و مواعظ پر مشتمل ہیں اور انہیں قرآن سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تاکہ کسی انداز میں یہ معنی نکالے جا سکیں کہ قرآن تو محفوظ ہے۔ لیکن احادیثِ نبوی نہیں۔ اسی طرح یعلی بن امیہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ' کی روایت سے ایک واقعہ یوں درج ہے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر ایک شخص نے آکر سوال کیا کہ "یا رسول اللہ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں۔ جس نے کپڑے میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا۔ آپ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ جب وہ کیفیت زائل ہوئی تو آپ نے دریافت کیا کہ وہ آدمی کہاں گیا۔ لوگ اس کو سامنے

لائے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جو خوشبو تم مل چکے ہو۔ اس کو تین دفعہ دھو ڈالو۔ اس کپڑے کو اتار ڈالو۔ پھر حسبِ معمول عمرہ ادا کرو۔ اسی طرح حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے جبرائیل نے کہا کہ آپ کی امتؐ میں سے جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے کسی کو خدا کا شریک نہیں کیا تو وہ جنت میں داخل ہو گا"۔ سلیمان ندوی نے یہ دونوں مندرجہ بالا احادیث صحیح بخاری سے درج کی ہیں اور ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ اگرچہ حضورؐ پر وحی ہوئی اور جبرائیل بھی آئے۔ لیکن یہ دونوں وحی قرآن پاک کا حصہ تو نہیں۔ البتہ احادیث مبارکہ کا ضرور ہیں۔ مگر قرآنِ پاک کی طرح یہ بھی محفوظ ہو گئیں۔ جیسے کہ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے کہ جو ذکر اللہ نے نازل کیا ہے۔ وہ اس کا نگہبان ہے۔ اس طرح یہ واضح ہو رہا ہے کہ سورہ نجم کی آیت۔ "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى"، کے جو محدود معنی یہ کرتے ہیں کہ حضورؐ جو کچھ اپنی خواہش کے بغیر بولتے ہیں۔ اس کا اطلاق صرف قرآنِ پاک پر ہوتا ہے۔ اور احادیثِ مبارکہ پر نہیں ہوتا۔ یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ احادیثِ مبارکہ بھی آپ پر اسی طرح وحی ہوتی ہیں۔ جس طرح کہ قرآنِ پاک کی آیات اور جس طرح قرآنِ پاک کا ذکر اللہ تعالےٰ کی نگہبانی میں محفوظ ہے۔ اسی طرح حضورؐ کی احادیثِ مبارکہ بھی اللہ کی نگہبانی میں محفوظ ہیں۔

سورۃ النسآء کی آیت ۸۵ میں ارشادِ حق تعالےٰ ہے۔ "وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا"۔ ترجمہ۔ اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے"۔ اس آیتِ مبارکہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ جہاں ہر چیز اللہ کی نگہبانی میں ہے۔ وہاں احادیثِ نبوی بھی اللہ تعالیٰ کی نگہبانی میں محفوظ ہیں اور اللہ کے ہاں ان کے محفوظ ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا غرض و غایت ہو سکتی ہے کہ احادیثِ مبارکہ سے حضور کی امت کی ہدایت راہنمائی کا مقصد پورا ہو۔ اللہ نے تو اپنے بندوں کی رشد و ہدایت کے لئے کم و بیش

ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کو بھیجنے کا اہتمام کیا ہے۔

اللہ تعالےٰ سورۃ النساء کی آیت ۸۰ میں بھی ارشاد فرماتا ہے۔ "مَنْ یُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ ترجمہ: جس نے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" اس آیتِ مبارکہ کا ایک مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت میں کوئی چنداں فرق نہیں اور دونوں برابر ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ حضورؐ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ تیسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی۔ انہوں نے ساتھ ساتھ اللہ کی بھی اطاعت کی اور چوتھا اس کا مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ کی اطاعت کرنے کا ہی خواہشمند ہو۔ تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ حضور کی اطاعت کرے اور اگر کوئی ان کی اطاعت کرنے سے کسی وجہ سے بھی گریز کرے گا۔ تو وہ (نعوذ باللہ) اللہ کا اطاعت گزار نہ بن سکے گا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی اطاعت کے احکامِ الٰہی ہمیں قرآن پاک سے ملتے ہیں اور رسولؐ اللہ کی اطاعت کے احکامِ رسولؐ ہمیں احادیثِ نبوی سے ملتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت کے لئے رسولؐ کی اطاعت شرط ہے قرآنِ پاک ہمارے لئے محفوظ ہے۔ اسی طرح احادیثِ نبوی بھی ہمارے لئے محفوظ ہیں سورۃ انفال میں ہے کہ" اے ایمان والو۔ کہنا مانو اللہ کا۔ اور (کہنا مانو) اس کے رسول کا۔ اِس کہنا ماننے سے (تم) روگردانی مت کرنا اور (تم سن لیتے ہی ہو۔ لیکن تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہونا۔ جو دعوے تو کرتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا۔ حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں۔" ظاہر ہے کہ اللہ کا کہنا ماننے کے لئے ہمیں اس کتاب کی طرف رجوع کرنا ہو گا۔ جس میں اللہ کے احکامات و ہدایات درج ہیں اور وہ کتاب قرآنِ پاک ہے۔ اسی طرح رسولؐ کا کہنا ماننے کے لئے ہمیں احادیثِ نبوی ہی کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اور یہاں اللہ تعالےٰ ہمیں خبردار کر رہا ہے کہ احادیثِ مبارکہ کی مکمل یا

جزوی نفی کرنے کے باعث ہم کہیں اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں۔ جو دعوے تو کرتے ہیں کہ ہم نے (احکامِ رسول کو احادیث میں) سُن لیا۔ حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں۔ یعنی کہ وہ حدیثوں کو اس طرح نہیں مانتے جس طرح کہ ان کو ماننا ضروری و لازم ہے۔

ہم سب مانتے ہیں کہ حضورؐ کا اسوہ حسنہ جو کہ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے آپ کی عملی زندگی اور اقوال (احادیث) دونوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اگر قرآن محفوظ ہے تو اس کی عملی تفسیر یعنی اسوہ حسنہ کا محفوظ ہونا بھی لازم شرط ہے اور اس بات کی تصدیق بھی سورہ احزاب کی اس آیت سے یوں ہو رہی ہے کہ "(حضورؐ کے) اسوہ حسنہ پر پیروی تمہارے لئے بہتر ہے۔" اس آیت میں اللہ تعالےٰ ہمیں ہدایت فرما رہا ہے۔ کہ ہم آپؐ کے اسوہ حسنہ کو ہرگز نہ بھولیں۔ بلکہ اس پر چلنے کے لئے اس کو پکڑ لیں۔ لیکن اگر ہم اسوہ حسنہ سے کسی انداز میں احادیثِ نبوی کی نفی کریں۔ تو پھر جس اسوہ حسنہ پر پیروی کرنے کا حکم ہمیں دیا گیا ہے۔ وہ بے معنی اور ادھورا ہو کر رہ جائے۔ لیکن اللہ تعالےٰ کے ارشاد سے تو واضح ہو رہا ہے کہ اسوہ حسنہ ہماری راہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ورنہ اس پر پیروی کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اس لئے ہم میں سے بعض اگر یہ اصرار کریں کہ احادیثِ نبوی جو چودہ سو سال کی کٹھن اور طویل مسافت طے کر کے ہم تک مستند کتابی شکل میں پہنچی ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہیں تو ایسی بات سے قرآنِ پاک کی مندرجہ بالا آیتِ مبارکہ سے بھی انکار کرنے کا پہلو نمایاں ہوتا ہے پھر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ ہم یہ تو شک کرتے ہیں کہ احادیثِ نبوی کو اللہ تعالےٰ نے ہماری ہدایت و راہنمائی کے لئے محفوظ نہیں کیا۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ نے تمام جنّ و انس کے اعمال و اقوال کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ جو روزِ قیامت ہم میں سے ہر ایک کے سامنے پیش کر دئے جائیں گے اور ان میں بظاہر وہ خفیف قسم کے گناہ بھی

شامل ہیں جوکہ لوگوں کے ذہن و تخیل تک ہی محدود رہے اور انہیں یا تو اُن گناہوں کا سرے سے احساس ہی نہیں ہوا یا وہ انکو بھولے ہوئے ہیں۔ یہ تو ہم سب مانتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ ہماری راہنمائی و ہدایت کی خاطر ہمیں متکبر فرعون اور نمرود کے واقعات تو سناتا ہے۔ قومِ لوط کی بداعمالیوں کا حال بتاتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے جنوّں اور ہُدہُد کی باتیں بیان کرتا ہے۔ اس نے تو اژدہاءِ موسیٰ سے لے کر چیونٹی تک کی باتوں تک کو محفوظ کرکے ہمیں سنایا ہے تاکہ ہماری ہدایت و راہنمائی میں کسی قسم کا سقم باقی نہ رہ جائے اس لئے اگر ہماری ہدایت و راہنمائی کی خاطر پاک پروردگار نے یہ تمام اہتمام کیا ہے۔ تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری ہدایت و راہنمائی کے لئے ان سب سے زیادہ اہم اُس رسوؐل کے اسوہ حسنہ کو اور احادیث کو محفوظ نہ کیا ہو۔ جس کی ہم امت ہیں اور جو خود تمام انبیاء علیہ سلام کے سردار ہیں۔ اللہ تعالےٰ کے انتظامات و معاملات ہر لحاظ سے مکمل اور پختہ ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے برعکس سوچنا ہماری کوتاہیٔ فکر اور کجی کی دلیل ہے اور اللہ تعالےٰ پر بہتان باندھنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ سورہ یونس کی آیت نمبر ۶۱ میں اللہ تعالےٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہا ہے کہ وہ آپ کی امت اور جمیع خلائق کے سارے احوال سے ہر لحظہ اور ہر ساعت واقف ہے ذرہ بھر چیز بھی جو زمین و آسمان میں ہو۔ خواہ وہ بظاہر کتنی ہی حقیر و صغیر کیوں نہ ہو۔ کتابِ مبین میں موجود ہے۔ اور وہ اللہ کی نگہداشت میں ہے۔

احادیثِ نبوی کے محفوظ ہونے کے متعلق ہمیں ایک اور واضح نشانی سورہ حشر سے بھی ملتی ہے۔ جہاں بیان ہوا ہے کہ "جو کچھ (ہدایات و احکامات) تم کو رسولؐ دیدے۔ اُسے لے لو۔ اور جس (بات اور کام) سے تم کو منع کرے۔ اس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو۔" اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ احادیثِ نبوی ہماری ہدایت و راہنمائی کے لئے محفوظ نہیں ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ نکلیگا کہ ہم رسولِ پاک سے

نہ سب کچھ لے سکتے ہیں جو کہ آپ ہمیں بذریعہ احادیث دے رہے ہیں اور نہ ہی ہم کسی بات سے باز رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں تو اپنے موقف کے مطابق وثوق سے کچھ پتہ ہی نہیں کہ حضورؐ ہمیں کیا کیا دے رہے ہیں اور کن کن باتوں سے منع فرما رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اگر ہم سے اللہ کے ان احکامات کی کوئی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ تو ہم کیا کریں۔ ہم تو بے قصور ہیں۔ اس لئے ہم اگر اللہ سے ڈریں تو کیونکر صاف ظاہر ہے کہ ایسا موقف اختیار کرنے میں سوائے فکر کی کجی و کوتاہی کے اور کچھ نہیں۔ ہم موسیٰ علیہ سلام کی قوم میں سے تو نہیں ہیں کہ ان کو اللہ تعالےٰ نے جنت کے طعام من و سلوا کی نعمت سے نوازا۔ لیکن وہ جلد ہی اس نعمت سے بیزار ہو گئے ہمارے نزدیک تو حضورؐ کا اسوہ حسنہ اور احادیثِ مبارکہ ہماری ضروری ہدایت و راہنمائی کے لئے اللہ تعالےٰ کی فراہم کردہ نعمتیں ہیں۔ جن سے ہم کسی صورت اور کسی انداز میں انکار نہیں کر سکتے۔ اور پھر اللہ تعالےٰ قرآنِ پاک میں جو ارشاد فرماتا ہے کہ اُس نے اس دین کو مکمل کر دیا۔ تو اس کا بھی سوائے اس کے اور کچھ مطلب نہیں نکلتا کہ قرآنِ پاک بھی مکمل ہیں۔ حضورؐ کا اسوہ حسنہ بھی مکمل ہے اور احادیثِ نبوی بھی مکمل ہیں اور ہمارا مکمل دین ان تینوں کا مجموعہ ہے۔

اس لئے اگر ہم نے احادیثِ نبوی کی صحت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ہے یا کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی سعی کرنا ہے تو لازم ہے کہ ہمیں ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر سوچنا ہو گا۔ جو کہ اس ضمن میں مندرجہ بالا بیان کئے گئے ہیں۔ نہ کہ صرف ایک پہلو سے یا جزوی پہلو سے اندریں حالات بندہ کے نزدیک جو احادیثِ نبوی مستند کتابی شکل میں ہم تک چودہ سو برس میں پہنچی ہیں۔ ان میں شک وشبہ کرنے کی بظاہر کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے اگر مختلف احادیث میں ہمیں کہیں کوئی تضاد نظر آتا ہے تو ممکن ہے کہ اس میں ہماری فکر کی کوئی کجی ہو۔ یا یہ کہ وہ حدیث مستند کتبِ حدیث

میں سے نہ ہو یا یہ کہ مختلف حالات میں۔ مختلف اوقات پر۔ مختلف لوگوں کے سامنے حضورؐ کے مختلف ارشادات کی وجہ سے ایسا ہو۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ کوئی بعد کی حدیث بدلے ہوئے حالات میں کسی پہلی حدیث کو معطل یا منسوخ کر رہی ہو لیکن حدیثِ نبوی بہر حال حدیث ہے اور اُس کی نفی اب کیسے ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں ایسی احادیث جو دروغ گوئی سے حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے منسوب ہوں۔ ان کی تعداد اب نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ یعنی نہایت ہی کم۔

مندرجہ بالا حالات میں اللہ کا یہ عاجز و مسکین بندہ صرف یہی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ شریک نے حضرت انسؓ سے دیدارِ الٰہی کی جو روایت کی ہے۔ وہ صحیح ہے اور اس سلسلہ میں یہ بات بھی مدِ نظر رکھنی چاہیئے کہ جو حضرات دیدارِ الٰہی ہونے کے حق میں ہیں۔ انہوں نے اس واقعہ معراج کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مشابہ آواز میں کلام کرنا اور اس کلام کی تفصیل بھی درج ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر دیدارِ الٰہی کا واقعہ درحقیقت غلط ہے تو کیا وہ لوگ جنہوں نے اس واقعہ کو پورے وثوق سے تمام تر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے انہوں نے کس بنا پر یہ سب کچھ کیا۔ کیا وہ دشمنانِ اسلام میں سے تھے۔ جو من گھڑت واقعہ اسلام کو نقصان پہنچانے کی غرض سے پیش کر رہے تھے اور اگر یہ لوگ واقعی مسلمان تھے تو کیا وہ دیدارِ الٰہی کی بہکی بہکی باتیں بیان کرتے تھے اور اگر ایسی بات بھی نہیں تھی۔ اور وہ تمام بلند مرتبہ ذی ہوش بزرگ تھے تو پھر اُن کے پاس کونسی ایسی گنجائش تھی کہ دیدارِ الٰہی جیسے نازک و اہم ترین معاملہ میں وہ کوئی دروغ گوئی کر کے اللہ تعالیٰ جلشانہٗ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس بری طرح ملوث کرتے۔ یہ سب نکات ایسے ہیں جو اس واقعہ معراج پر غور کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس معاملہ میں ہر لحاظ سے خاطر

خواہ طور پر مطمئن کریں اور بعد میں کوئی حتمی رائے قائم کریں۔ یہ سب باتیں اس لئے کہی گئی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ہم اس کی نشانیوں پر غور کریں۔

یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اللہ کی کتاب کو سیکھنا اور اُس کی حکمت کا سیکھنا اور اس پر عبور حاصل کر کے اسے دوسروں کے لئے بیان کرنا محض اللہ تعالےٰ کی اپنی توفیق دینے و عطا پر موقوف ہے۔ اس نے اپنے انبیاء علیہم السلام اور اولیا رحمۃ اللہ علیہم کو مختلف انعامات سے نوازا ہے۔ جیسے کہ سورہ فاتحہ میں فرمایا ہے کہ اے اللہ ہمیں ان بزرگ ہستیوں کی راہ دکھا کہ جن پر تو نے اپنا انعام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو مختلف مشاہدات کرائے جو اس کی نشانیوں (آیات) کا درجہ رکھتے ہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالےٰ نے جب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج پر بلایا تو اس کا مقصد یہ بتایا کہ "ہم اس کو (رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو) اپنی نشانیاں دکھائیں"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کی ان نشانیوں کو دیکھنا رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی زندگی کی معراج قرار پایا۔ اللہ اللہ یہ نشانیاں کیا تھیں۔ جنہیں باقی تمام مسلمانوں سے صیغۂ راز میں رکھا گیا اور وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان نشانیوں کو دیکھنے کا انعام حاصل کرنے کا صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مستحق و متحمل تھے۔ ان نشانیوں کو اگر عام مسلمانوں کے لئے بیان کر دیا جاتا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی محدود بصیرت کے تحت ان کا صحیح شعور حاصل نہ کر سکتے۔ اللہ پاک کی حکمت کی باتیں جس وقت انسانی عقل کے احاطہ سے باہر ہو جاتی ہیں تو خدشہ ہوتا ہے کہ اگر عقل پر زیادہ انحصار کیا جائے تو اس پر مزید پردے پڑ جائیں اور وہ بھٹک کر گمراہی کی تاریکیوں پہ گامزن ہو جائے اور اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اللہ پاک نے اپنی حکمت کے تحت قرآن پاک میں معراج شریف کا واقعہ صرف چند لفظوں میں اشارۃً بیان فرمانا ہی مناسب و موزوں سمجھا اور جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس پر کوئی

زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تفصیل جاننے کے لئے کوئی اصرار یا خواہش ظاہر کی ہوتا تو یہ چاہیئے تھا کہ ہم ان سب نشانیوں پر غور و فکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچتے کہ اگر اللہ پاک معراج کی مزید تفصیل کو کسی وجہ سے مخفی رکھنا چاہتا ہے تو ہم اسکے بندے ہونے کی حیثیت سے مقام بندگی پر رہتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیتے اور معراج کے واقعہ کو اپنی تحقیق کا موضوع نہ بناتے کیونکہ ہماری تخلیق کا واحد مقصد تو یہ ہے کہ ہم اپنے اللہ کی عبادت کریں نہ کہ خود سر ہو کر اپنی تحقیق کے ذریعے اس کے مخفی رازوں کو پاکر انہیں افشا کرنے کی لا حاصل کوشش کریں۔

البتہ جو اپنے راز اللہ پاک خود اپنے کسی بندہ پر منکشف کرے تو یہ عین خوش قسمتی ہے اور اسکی سراسر عنایت۔ لیکن جو خود سر ہو کر اس کے رازوں کو سمجھنے کی اپنے تئیں کوشش کریگا اس کی عقل پر پردہ پڑ جائے گا اور وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک کر گمراہ ہو جائے گا۔ اللہ پاک تو اپنے بندہ سے کہتا ہے کہ سجدہ کر اور میرے قریب ہو جا۔ قرب الٰہی کا راز سجدہ کی کیفیت میں پنہاں ہے اور سجدہ یہ ہے کہ بندہ جسمانی، ذہنی اور عقلی ہر لحاظ سے اپنے اللہ کے آگے جھک جائے۔ سر تسلیم خم کر دے۔ اپنی ہر جسمانی و نفسیاتی خواہش و تقاضے کو اس کے احکامات کے تابع کر دے۔ سجدہ میں جو بندہ جتنا جھکتا چلا جائے گا۔ وہ اتنا ہی زیادہ اپنے اللہ کے قریب ہوتا جائے گا اور قرآنِ پاک میں آیاتِ مبارکہ پر جو غور و فکر کرنے کو کہا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر کس و ناکس اپنے محدود فہم و بصیرت کے مطابق جو آیات کا مطلب چاہے نکال لے۔ بلکہ اس دعوتِ فکر میں تنبیہ کا پہلو زیادہ نکلتا ہے کہ لوگو! ان آیات کو غور سے دیکھو۔ ان کو گہری نظر سے پڑھو۔ ان کو اچھی طرح سوچو اور دل کی گہرائیوں سے ان آیات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔

محفلِ میلادالنبیؐ بیانِ نعمت ہے

اَب دین میں چند دیگر اختلافی مسئلوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے جو کہ مسلمانوں میں ضروری دینی بھائی چارہ پیدا ہونے کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور تفرقہ کا سبب ہیں۔ ان میں ایک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلِ میلاد کا منعقد کرنا ہے۔ بعض مسلمان ان محفلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے لے کر وصال تک کے تمام حالاتِ مطہر کا بیان کرنا اپنے لئے فرض وسعادت محسوس کرتے ہیں۔ نعت خوانی کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجتے ہیں اور بعض صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دَور کی سیرتِ پاک بیان کرنے کے لئے جلسے کرتے ہیں۔ کیونکہ ان مؤخر الذکر مسلمانوں کے فکر کے مطابق محفلِ میلاد منعقد کرنا بدعت اس وجہ سے ہے۔ کیونکہ ان کے مطابق اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے کے اسوۂ حسنہ کا ذکر ضروری ہوتا تو اصحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین بھی ایسی محفلیں ضرور منعقد کرتے۔ بظاہر یہ اعتراض بڑا وزنی اور مدلل معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا تجزیہ کرنا ضروری ہے بہ نسبت اس کے کہ اس ضمن میں کچھ عرض کیا جائے۔ ذہن کے پس منظر میں یہ بات رکھ لینی چاہیئے کہ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد ہمارے لئے سب سے زیادہ واجب الاحترام وعقیدت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی ذاتِ اقدس ہے اور اسلام پر عمل پیرا ہونے کے لئے سرفہرست ہم پر احکامِ خداوندی کی اطاعت لازم اور واجب ہے۔ دوسرے درجہ پر احادیثِ نبوی اور سیرتِ پاک ہے۔ لیکن یہ صرف اُن معاملات ومسائل کے لئے ہیں۔ جن کے بارے میں مناسب راہنمائی ہمیں بظاہر نہ ملتی ہو اور اس طرح تیسرے درجہ پر ہمارے لئے واجب اطاعت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اقوال وعملی زندگیاں ہیں تاکہ ہم پیروی کرنے کے لئے ان سے مناسب راہنمائی حاصل کر سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ

یہ بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ اللہ پاک کے نزدیک صرف انبیاء علیہم السلام ہی کی ذات اس اعلےٰ مقام پر فائز ہے کہ وہ بے گناہ بھی ہوتے ہیں اور معصوم بھی اور یہ کہ اللہ تبارک و تعالےٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ کچھ سفر کروایا اور حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت خصوصاً وحی نازل فرمائی جبکہ آپ نے جنگِ بدر کے کفار قیدیوں کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مشورہ پر معاف کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

رب کی نعمتوں کو بیان کرنے کا حکم

رب العالمین نے اپنے بندے پر جو نعمتیں نازل کی ہیں۔ وہ بے شمار ہیں۔ انہیں نہ تو گنا جا سکتا ہے اور نہ ان کے شکر کرنے کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ ان نعمتوں کا ذکر بار بار کرتا ہے اور سورہ والضحیٰ میں حکم دیتا ہے کہ "اور جو نعمت تیرے رب کی ہے۔ اُسے بیان کر۔" اس حکم کے تحت ہم سب پر واجب آتا ہے کہ ہم اس کی نعمتوں کو بندوں میں بیان کیا کریں۔ ظاہر ہے کہ جو نعمت جتنی بڑی ہوگی۔ اس کا ذکر بھی اتنا ہی زیادہ ہونا چاہیئے اور سب سے بڑی نعمت کا ذکر سب سے زیادہ۔ اور اللہ پاک کی ہم مسلمانوں پر سب سے بڑی نعمتیں دو ہیں۔ جن کا خصوصیت کے ساتھ ذکر قرآن پاک میں آتا ہے۔ ان میں سے ایک حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہماری رہنمائی کے لئے بعثت اور دوسری قرآن مجید کا نزول۔

حضوؐر کی بعثت فرما کر اللہ جل شانہٗ مسلمانوں پر جو اپنا احسان کر رہا ہے۔ اُس سے تو یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی ہمارے لئے سب سے بڑی نعمت حضوؐر ہی کی ذاتِ اقدس ہے۔ سورۂ العمران کی آیت ۱۶۴ میں ارشاد ہے کہ "یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا۔ جس وقت کہ اس نے اُن کے بیچ اپنا پیغمبر بھیجا۔"

اللہ عزّ وجل کے اس حکم کی رو سے ہم مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ ہم مسلمان اپنی محفلوں اور مجالس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بزرگی و فضیلت کو بیان کریں۔ اب اس ضمن میں صرف یہ بات طے کرنی باقی رہ جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کا بیان صرف دورِ نبوت سے لے کر وصال تک بیان کیا جانا چاہیئے یا کہ یوم ولادت سے لے کر نبوت پر فائز ہونے کے پہلے چالیس سال بھی۔ اگر ہمارے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے پہلے چالیس سال باعثِ نعمت ہیں تو میری دانست و بصیرت میں ہمارے پاس کوئی معقول چارہ یا عذر نہیں رہتا کہ ہم اپنے بیان میں زندگی کے اس حصہ کو شامل نہ کریں۔ اگر کسی مسلمان بھائی کے ذہن میں حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے پہلے چالیس سال کے نعمت ہونے کے بارے میں کوئی شک و شبہ ہو۔ تو اسکو اسے نکال دینا چاہیئے۔ اُسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت نبوت کا اعلان کیا تھا اور دعوتِ حق کے لئے پہاڑ کی چوٹی سے لوگوں کو پہلا خطبہ دیا تھا۔ اُس میں نبوت کی اساس اسی چالیس سالہ زندگی کو بنایا تھا۔ جس کے حوالے سے لوگوں کو یاد دلایا تھا کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صادق و امین پایا تھا اور اس طرح یہی قبل از نبوت چالیس سالہ زندگی لوگوں کے لئے اللہ پر ایمان۔ لانے کا سبب بنی اور خود اللہ پاک سورہ مریم میں اپنے رسول کے یوم پیدائش پر اس پر اپنا سلام بھیجتا ہے۔ جس کے سبب یوم ولادت کی اہمیت بزرگی اور فضیلت کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اللہ پاک معاملہ کو یہاں ہی بس نہیں کرتا۔ بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کم از کم چھ سو برس پہلے اپنے بندوں کو حضورؐ کی بعثت کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے خبر دے رہا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ اُس کے بندے اس خبر کو سُن کر خوش ہوں اور اس طرح جس وقت اللہ کے بندے کئی سو برس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خوشخبری سنتے رہے اور یہ خوشی منانے کا معاملہ کئی سو برسوں میں اپنی انتہا کو پہنچا تو اللہ پاک نے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ

وسلم کی ولادت مبارکہ کا اہتمام کیا۔ یہاں یہ قابلِ غور بات ہو رہی ہے کہ اللہ کے بندے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے بظاہر فیضیاب نہیں ہونا تھا۔ وہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی کئی سو برس تک خوشی مناتے رہے۔ لیکن ہم مسلمانوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ اگر انہیں حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی خوشی منانی پڑے تو اُنکو گھٹن و بیزاری ہوتی ہے اور وہ اپنے اندر کسی نہ کسی انداز میں کجی محسوس کرتے ہیں حالانکہ اللہ تبارک و تعالےٰ کی ذات گرامی خود اپنے رسولؐ کے یومِ ولادت پر سلام بھیجتی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے میں جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ ان سب کو اپنے فضل و کرم سے ہمارے سب کے راستے سے ہٹا دے۔

مولانا اصلاحی اور بیانِ نعمت

ہو سکتا ہے کہ کچھ مسلمانوں کے ذہن نعمت کے بیان کرنے کی اہمیت و افادیت کے پوری طرح قائل نہ ہوں کہ جس کے لئے محفلِ میلاد کے منعقد کرنے کا اہتمام ضروری سمجھا جاتا ہو۔ صاف ظاہر ہے کہ جس نعمت کو جتنا کم بیان کیا جائے گا یا اس کے بیان کرنے کا جتنا کم اہتمام کیا جائے گا۔ اتنا ہی اس نعمت کو کم مان کر ایسا کیا جائے گا۔ جو کہ اُس نعمت کی ناشکری کرنے کے مترادف ہو گا اور نعمت کو نعمت کے زمرے سے نکال کر بدل دینے کی کاوش قرار دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کو سورہ بقر میں اللہ پاک کے ارشاد کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ ارشاد ربانی ہے۔" پوچھو بنی اسرائیل سے کہ ہم (اللہ) نے اُن کو کتنی ظاہر نشانیاں دیں اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو جو اس کو پہلے دی گئی ہو، کو بدل ڈالے۔ پس (اس کے لئے) اللہ بے شک سخت عذاب دینے والا ہے۔" اور اسی اللہ کی نعمت کے ضمن میں ہی اب جناب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب بعنوان" تدبر قرآن" کا حوالہ خصوصیت کے ساتھ دے رہا ہوں۔ مولانا صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۴۸ پر لکھتے

ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کی قدر نہیں کی تھی۔ اس وجہ سے وہ قرآن کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے مستحق نہیں ٹھہرے اور جیساکہ فرمایا گیا تھا۔ جو ایک پیسہ میں چور ہے۔ اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جائے گی۔" وہ قرآن کی عظیم الشان امانت سے محروم رہے۔ ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا۔ جب اس میں وہ راست باز اور امین ثابت نہ ہوئے تو خدا ان کو اپنی پوری کتاب کیسے سونپ دیتا۔" اس ضمن میں مولانا صاحب صفحہ ۵۰ پر لکھتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالےٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس وجہ سے اس کا فہم و تدبّر صرف انہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ جو اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہوں جوں جوں وہ اس نعمت کے قدر و احترام میں بڑھتے جائیں گے۔ اسی قدر اس کی برکتیں ان کے لئے بڑھتی جائیں گی۔" اور صفحہ ۱۰۴ پر مولانا اسی نعمت کے موضوع پر ارشاد فرماتے ہیں" اور ان کے کفرانِ نعمت کی وجہ سے اللہ تعالےٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا۔" مولانا صاحب کے ان ارشادات نے میرے لئے نعمت کے بیان کے مسئلہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔ اب جو بات صرف ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ صرف اتنی ہے کہ جس طرح قرآنِ مجید ایک بہت ہی بڑی اللہ کی نعمت ہے۔ اسی طرح حضوؐر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک بہت ہی بڑی اللہ کی نعمت ہیں اور اس نعمت کا ولادت سے لے کر وصال تک پوری طرح خلوص و عقیدت سے بیان نہ کرنا ناشکری اور کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اپنی اسی کتاب "تدبر قرآن" کے صفحہ ۱۵۲ پر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کو قرآن مجید کا فہم و تدبر حاصل کرنے کے بارے میں بطور اتھارٹی پیش کرتے ہیں اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر انجمن خدام القرآن جو مولٰنا امین احسن اصلاحی صاحب سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ وہ بھی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی بزرگی اور دینی خدمات سے بے حد متاثر ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے نزدیک

موجودہ صدی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی دینی خدمات کو باقی سب کی خدمات سے امتیازی مقام حاصل ہے۔ اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا سا رجوع حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ کی طرف بھی کیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کے جناب رسالت مآب کے متعلق اس ضمن میں کیا ارشادات ہیں: تاکہ محفلِ میلاد کا مسئلہ خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔

نعمت کے بیان میں کجی نہ ہو

حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے چالیس سالہ زندگی کو صحیح معنوں میں نعمت ماننے سے اگر اب بھی کسی مسلمان کے دل میں کوئی شک و شبہ رہ جائے تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنے ہوش و حواس کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے قرآن مجید کی سورہ الرحمٰن کی طرف رجوع کرے اور غور کرے کہ اللہ پاک مسلمانوں کو کس شدت سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا ہے کہ" میں دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہوں تو تم میری کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے" اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا مشرق اور مغرب کا رَبّ ہونا بھی ہمارے لئے باعث نعمت ہے اور ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا ذہن کے مسلمانوں کو اس نعمت کے نعمت ہونے میں کہیں زیادہ کجی نظر آتی ہو۔ ایسے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سوچ و فکر میں قرآنی آیات سے مطابقت پیدا کرے۔ ہم میں سے بعض ایسے بھی مسلمان ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنے جیسا بشر سمجھتے ہیں اور بعض ان میں سے وہ ہیں جو اپنی ظاہرہ فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کا درجہ دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جناب رسالت مآبؐ بشر تھے لیکن ہمارے بشر ہونے اور ان کے بشر ہونے میں زمین و آسمان کے فرق سے بھی کہیں زیادہ فرق ہے۔ ہم سب قرآن مجید کی عظمت و شان سے تو متاثر ہوتے ہیں۔ اگر قرآن اللہ کا کلام ہے تو حضورؐ بھی تو اللہ ہی کے رسول ہیں۔ قرآن کے معلم ہیں۔ قرآن

کی حکمت بھی پڑھاتے ہیں اور مسلمانوں کے ظاہر و باطن کو پاک و صاف بھی کرتے ہیں.
ان کے علم کا یہ حال ہے کہ اگر آج تک کے تمام علمائے دین جن میں سے بے شمار نے قرآن
پر اپنی اپنی تفسیریں لکھی ہیں اور آئندہ بھی لکھنی ہیں. اگر ان تمام علمائے دین کا علم اکٹھا کر دیا
جائے تو بھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے مقابلے میں ہیچ و نامکمل رہے گا کیونکہ
علمائے دین کے علم کا حصول دنیاوی اسباب کی بدولت ہے. لیکن حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کے علم کا اہتمام خود اللہ تعالیٰ عالمِ غیب سے کرتا ہے.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو اپنے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کون بہتر طور
بیان کر سکتا ہے. اللہ فرماتا ہے کہ حضور سب جہانوں کے لئے رحمت ہیں. یعنی مطلب
ہے کہ آپ سب آسمانوں اور زمین کی ہر شے کے لئے باعث رحمت ہیں اور اللہ کی رحمت
تو ایک بہت ہی بڑی نعمت ہے. جسے یہ میسر آجائے اُسے اور کیا چاہیئے. اس لحاظ
سے اگر غور و فکر کریں تو معلوم ہو رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ساری کائنات کی
ہر شے کے لئے ایک انتہا کی نعمت ہیں اور اپنی اُمت کیلئے خصوصاً. حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے. سورہ الِ عمران میں ہے کہ اگر مسلمان اللہ
سے محبت و دوستی کا دم بھرتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کی اتباع کرے. اللہ تعالیٰ ایسے مسلمان کو حضور کی اطاعت کے صدقے اپنا دوست
بنالے گا اور اس کے تمام گناہ بخش دے گا. اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت
کو اپنی اطاعت سے تعبیر کر کے اپنے عاجز و ناتوان بندوں کے لئے معاملہ بہت آسان کر دیا
کیونکہ مسلمانوں کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اطاعت کرنے کی سند لینا نسبتاً بہت
آسان ہے. کیونکہ آپ رحمت اللعالمین ہیں. جلد ہی راضی ہو جانے والے ہیں. جلد ہی خوش
فرمانے والے ہیں. جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے. لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ
عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

(التوبہ آیت ۱۲۸) ترجمہ " تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں. جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں. ایمانداروں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں"
لیکن اگر کوئی شخص اللہ کی نعمت کے بیان میں کجی کرتا ہے تو اس کے متعلق سورہ والعادیات میں ارشاد ہے کہ تحقیق انسان اپنے پالنے والے کا ناشکرا ہے اور پروردگار ان کے ساتھ اس دن خبردار ہے اور جو کچھ اس کے سینے میں بظاہر مخفی ہے. اللہ اس کو حاصل کرلے گا" اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم سب اللہ کی نعمتوں کا بھرپور شکر ادا کرتے رہا کریں اور بیانِ نعمت سے بھی شکر ہی ادا ہوتا ہے.

رسول پر ایمان لانے کی شدت کیسی ہو.

اللہ جس شدت سے اپنے اوپر ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے اسی طرح شدت سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لانے کا تقاضا کرتا ہے. ذرا غور سے سنو کہ سورۂ حدید میں کیا فرماتا ہے. کیا تنبیہہ کر رہا ہے. فرماتا ہے کہ" اے لوگو! جو ایمان لائے ہو. اللہ سے ڈرو اور لاؤ ایمان اس کے پیغمبر کے ساتھ"
صاف ظاہر ہے کہ ایمان لانے والے تو صرف وہی ہوتے ہیں جو کہ اللہ کے ساتھ رسول پر بھی ایمان لائیں. جیسا کہ سورہ نساء میں ارشاد باری تعالٰے ہے کہ" جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ بعض پر ایمان ہے اور بعض پر نہیں. اور چاہتے ہیں کہ اس کے (اللہ) اور اس کے (رسول) کے بین بین کوئی راہ نکالیں. یقین مانو کہ یہ سب لوگ کافر ہیں حقیقت میں" لیکن چونکہ ان ایمان والوں کا رسول پر ایمان اس کیفیت کا نہیں ہے کہ جس سے ایمان لانے کی شرط اور حق پورا ہوتا ہو. اس لئے ڈرایا جا رہا ہے کہ خدا سے ڈرو اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پہ صحیح ایمان لاؤ. حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا تو تمام انبیاء علیہ السلام

پر بھی واجب ہے۔ سورہ العمران میں ارشاد حق تعالےٰ ہے "اور جس وقت اللہ تعالےٰ نے پیغمبروں سے عہد لیا البتہ میں (اللہ) جو کچھ دوں تم (انبیاء) کو کتاب سے اور حکمت سے پھر آوے۔ تمہارے انبیاء پاس پیغمبر (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) اُس چیز کو سچا کرنے والا جو تمہارے ساتھ ہے۔ البتہ ایمان لانا ساتھ اس (حضور صلی اللہ علیہ وسلم) کے اور مدد دینا اس کو۔ کہا (اللہ نے) کیا اقرار کیا تم (انبیاء) نے اور اس پر تم نے میرا بھاری عہد لیا۔ کیا انہوں (انبیاء) نے اقرار کیا۔ ہم نے کہا (اللہ نے) پس گواہ رہو اور میں (اللہ) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں"۔ یہ میثاق کا معاملہ عالم ارواح میں پیش آیا۔ جس وقت کہ ابھی حضرت آدم علیہ السلام بھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبییّن قرار پانے سے نبوت کا سلسلہ اپنی تکمیل کو پہنچا اور قرآن مجید کے نزول سے اللہ کا دین اپنی تکمیل کو پہنچا۔ جس وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دنیا میں نہ ہوئی۔ دین کی تکمیل کا سلسلہ رکا رہا اور جس وقت تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم چالیس برس کی عمر پاکر تخت نبوت پر فائز نہ کئے گئے۔ نزولِ قرآن انتظار کے مراحل طے کرتا رہا اور پھر بتدریج بذریعہ وحی کئی سال تک نازل ہوتا رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کرنے سے عاجز بندہ اپنی بے بسی کا اعلان کرتے قطعاً نہیں شرماتا۔ ان کی شان تو ہر ہر پہلو سے اجاگر ہو کر بندہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے۔

حضورؐ نور کیسے ہیں

بعض مسلمانوں کا خیال ہے کہ نور میں مادیت نہیں ہوتی جیسے کہ فرشتوں میں۔ اور چونکہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے وہ نور نہیں۔ دوسری دلیل اُن کی یہ ہے کہ چونکہ انسان سے گناہ تو سرزد ہو سکتا ہے اس لئے وہ بشر تو ضرور ہے۔ لیکن نور نہیں۔ کیونکہ نوری مخلوق (فرشتوں) سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ یعنی فرشتے اپنے تئیں کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے۔ کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے۔ جو کہ اللہ تعالےٰ کی مرضی کے خلاف ہو اور جس سے

کہ اللہ کے کسی فیصلے یا کسی حکم پر اعتراض کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔

یہ تو سب مسلمان مانتے ہیں کہ تمام لوگ ہی نہیں بلکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بھی بشر ہیں۔ کیونکہ حضور کے بشر ہونے کے متعلق قرآن میں ارشادِ ربانی موجود ہے۔ اس لئے اب تحقیق صرف یہ کرنا ہے کہ کیا بشر میں بھی نور ہوتا ہے۔ یا کہ نہیں اس سلسلہ میں پہلی بات جو سمجھ لینی چاہیئے۔ وہ یہ ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ مادہ چیز یعنی (MATTER) میں نور نہ ہو۔ کیونکہ سورج مادہ ہے اور وہ اپنے نور سے تمام دنیا کو منور کرتا ہے۔ اس کے نور میں بھی طاقت (ENERGY) ہوتی ہے، حرارت ہوتی ہے۔ یہ تاریکی کو ختم کرتا ہے اور کثافت کو بھی۔ سورج کی طرح چاند اور ستاروں میں بھی نور ہے۔ جیسے کہ سورہ یونس کی آیت ۵ میں ہے کہ اللہ نے سورج کو چمکتا ہوا بنایا ہے اور چاند کو نور بنایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مادیت میں بھی نور ہوتا ہے اب رہا یہ سوال کہ بشر سے چونکہ گناہ سرزد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نوری نہیں ہو سکتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ بقر میں ہے کہ جب اللہ نے یہ کہا کہ وہ بیج اس زمین کے اپنا خلیفہ پیدا کرنے لگا ہے۔ تو نوری فرشتوں نے اعتراض کیا اور کہا کہ کیا بناتا ہے۔ (نائب) اس شخص کو جو زمین پر فساد کریگا اور خون بہائیگا۔ لیکن ہم (فرشتے) تو تیری تعریف کے ساتھ تیری پاکی بیان کرتے ہیں۔ لیکن اللہ نے فرشتوں کے اس اعتراض کو رد کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً جو کچھ میں جانتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ پھر اسی وقت اللہ نے آدم کو سارے نام سکھا دئے اور فرشتوں سے پوچھا کہ اگر تم سچے ہو تو یہ سارے نام بتاؤ۔ جس پر فرشتوں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ لیکن آدم علیہ سلام نے یہ سب نام بتا دئے۔ اس طرح اللہ نے بشر کی فرشتوں پر فضیلت ثابت کی۔ اور انہیں آدمؑ کو سجدہ کرنے کو کہا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ بشر بھی نوری ہو سکتا ہے۔

سورہ الحدید میں اللہ ارشاد فرماتا ہے کہ مومن لوگ جس وقت جنت میں داخل ہو رہے ہوں گے۔ ان کا نور ان کے آگے آگے دوڑ رہا ہوگا۔ اور اسوقت منافق مرد اور عورتیں اُن مومنوں کے نور سے روشنی مانگیں گے۔ لیکن ان منافقوں کو کہا جائیگا۔ کہ تم پیچھے کی طرف ہٹ جاؤ اور ڈھونڈھ لاؤ۔ (اپنے لئے) نور یعنی یہ کہ منافقوں کا نور نہیں ہوگا اور اس بات کی سمجھ سورہ بقر سے یوں آتی ہے "کہ اللہ لے گیا اِن لوگوں کا نور اور چھوڑ دیا اِن کو اندھیروں میں"۔ اسی طرح مومن بندوں کے نور کے متعلق سورہ الحدید میں ایک اور جگہ آیا ہے کہ جو بندے اپنے پروردگار کے نزدیک سچے اور شہید ہیں۔ ان کے واسطے اُن کا ثواب ہے اور ان کا نور ہے اس طرح یہ بات واضح طور پر سامنے آ رہی ہے کہ بشر نوری بھی ہوتا ہے۔

اب ہمیں صرف یہ غور کرنا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے کس طرح کے نور ہیں۔ بظاہر تو یہ سمجھ آتا ہے کہ جس طرح حضورؐ باقی سب مخلوق سے اعلےٰ ہیں۔ اسی طرح آپ کا نور بھی اعلےٰ ہی ہوگا۔ سورہ صف میں ارشاد ہے کہ "کافر چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہوں سے بجھا دیں مگر اللہ تو اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے چاہے کہ کافر اس (بات) سے ناخوش ہوں"۔ اس جگہ اللہ تعالےٰ بظاہر اپنے دین کو نور بیان فرما رہا ہے۔ کیونکہ جس نور سے کافروں کا تعلق ہو سکتا ہے اور جس نور سے وہ ناخوش ہیں اور جس نور کو وہ بجھا دینا چاہتے ہیں۔ وہ اللہ کا دین ہے۔ اور جس طرح اللہ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ اللہ نے دین کو مکمل کر دیا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے۔ یہ دین کا نور سوائے قرآن پاک اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کیا ہے۔ یعنی یہ دونوں ہی اللہ کے نور ہیں اللہ نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ بھی نور بیان کیا ہے۔ قرآن کو سورہ التغابن میں یوں نور بیان کیا گیا ہے کہ "ایمان لاؤ ساتھ اللہ کے۔ اور اس کے رسولؐ پر اور اس

نور پر جو نازل کیا ہے اللہ نے" یہاں جو نور نازل ہوا ہے وہ قرآنِ پاک ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور ہونے کے متعلق ارشادِ ربّانی یوں ہے۔ قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیْنٌ ۝ ترجمہ : یقیناً تمہارے پاس آیا۔ اللہ کا نور اور ایک روشن کتاب" یہاں روشن کتاب سے مطلب قرآن ہے۔ اور اللہ کے نور سے مطلب جناب رسالتِ مآب ہیں اور اسی پہلو سے سورہ ابراہیم کی یہ آیت مبارکہ ہے" یہ کتاب ہے۔ جس کو ہم نے تیری طرف اتارا ہے تاکہ تو (رسول) لوگوں کو ظلمت سے نکال کر نور میں لے آئے" یعنی آپ لوگوں کو اپنے اور قرآن کے نور کی طرف لے آئیں۔ قرآنِ مجید میں سے ان متعدد آیات کا حوالہ اس لئے دیا گیا ہے کہ ان کی روشنی میں ہم نور کا صحیح مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نور اللہ پاک کی وہ تخلیق ہے، جس سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور اس کی بدولت اندھیرے میں مخفی چیزوں کا علم ہمیں حاصل ہوتا ہے اور اس کی بدولت چیزوں کی ہیئت اور خواص معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑی بڑی چیزوں کا علم تو نور کی معمولی سی روشنی میں بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن جو چیز چھوٹی ہو گی یا جتنی لطیف اور مخفی ہو گی اس کا علم حاصل کرنے کے لئے نور کی اتنی ہی تیز روشنی درکار ہو گی۔ پھر نور کا ایک عمل یہ بھی ہے کہ وہ کثافت کو دور کرتا ہے اور پاک بناتا ہے

میرے نزدیک کائنات میں سب سے زیادہ لطیف اور سب سے مخفی اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات ہے۔ اس نے خود کو لاکھوں کروڑوں پردوں میں چھپا رکھا ہے۔ لہٰذا اس کا علم حاصل کرنے کے لئے ہمیں اسی نسبت سے اعلیٰ ترین نور کی ضرورت ہے جس کی روشنی تمام پردوں سے گذرتی ہوئی اللہ تعالیٰ کے وجود کی ہمیں خبر دے اُس کے ہمارے ساتھ تقاضوں سے ہمیں آگاہ کرے۔ اللہ کی ضروری معرفت فراہم کرے اس کا ہر ضروری علم عطا کرے۔ تاکہ یہ علم ہم ... نجات کا باعث بنے اور یہ اعلیٰ

دارفع نور سرورِ کائنات۔ رحمتِ عالم۔ شافع محشر جناب محمد مصطفےٰ۔ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ہیں۔ سورہ احزاب کی آیت ۴۶ ۴۵ میں اللہ آپؐ کے نور کو یوں بیان فرماتا ہے کہ اے نبیؐ! یقیناً ہم (اللہ) نے تم کو گواہ بھیجا ہے۔ (لوگوں پر) خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور (تو) سِرَاجاً مُّنِیْراً ہے"۔ یعنی تو ایسا چراغ ہے کہ جس سے نور پھوٹتا ہے اور چاروں اطراف روشنی کرتا ہے۔ تشریح اس آیتِ مبارکہ کی یوں کی جاسکتی ہے کہ جناب رسالتِ مآبؐ اللہ کے نور کا ایسا چراغ ہیں کہ تمام دنیا آپؐ سے منور ہو رہی ہے۔ تاریکیاں چھٹ رہی ہیں۔ زمین و آسمان کی ہر شے کی اصل حقیقت معلوم ہو رہی ہے۔ اس نور کی بدولت لوگوں کی ظاہر و باطن کی تمام کثافتیں دور ہو رہی ہیں۔ لوگ پاکیزہ و لطیف ہو رہے ہیں۔ حجابات اٹھ رہے ہیں۔ لوگ اللہ تعالےٰ کی صفاتِ بابرکات سے روشناس ہو کر معرفتِ الٰہی حاصل کر رہے ہیں اور اللہ کی توفیق کے مطابق ہر بندہ اپنے پروردگار کا قرب حاصل کر رہا ہے۔ حضورؐ بیک وقت گواہی دینے والے بھی ہیں۔ اللہ کی رحمت وجنت کی خوشخبری دینے والے بھی ہیں۔ اللہ کے غضب اور دوزخ سے ڈرانے والے بھی ہیں اور اللہ کے نور کے چراغ بھی ہیں۔ حضور ہمارے لئے اسی طرح اللہ کا نور ہیں جس طرح کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ ہی کے بندے ہیں۔ جیسے کہ سورہ بنی اسرائیل میں اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے کہ لے گیا۔ وہ (اللہ) اپنے بندے (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور اللہ تعالےٰ نے خود اپنے آپ کو جو آسمانوں اور زمین کا نور کہا ہے تو وہ اپنے اس نور سے آسمانوں اور زمین کو ہمارے لئے منور کر رہا ہے تاکہ ہم ان میں اس کی نشانیاں بخوبی دیکھ سکیں۔ ان پر خوب غور و فکر کریں اور ان کا صحیح علم حاصل کر کے اللہ پاک پر مکمل ایمان لائیں۔ اس نے اپنے نور کی بدولت اپنی ہر مخلوق کو بھی اس کی زندگی کے عمل کے لئے ضروری علم عطا کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا نے اللہ کی خلافت

کا بوجھ اٹھانے سے ڈر محسوس کیا۔

جو مسلمان رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو (نور کا اخراج کرتے ہوئے) صرف بشر مانتے ہیں۔ اُن کی یہ کیفیت بظاہر اس وجہ سے ہے۔ کیونکہ وہ نور کو بشریت کے مقابلہ میں اعلیٰ و ارفع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اللہ پاک نے جہاں باقی کائنات کی تمام اشیاء کو تخلیق کیا ہے۔ وہاں اس نے سورہ انعام کے مطابق نور کو بھی تخلیق کیا ہے اور نور سمیت اللہ تعالےٰ کی تمام مخلوق میں سے انسان اشرف المخلوق قرار پایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسان ہی کو اپنا خلیفہ منتخب فرمایا اور نورانی فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کروایا اور جہاں فرشتے اپنے نور کی مدد کے باوجود اللہ کو کائنات کی تمام چیزوں کا نام بتانے سے عاجز و بے لبس رہے۔ وہاں حضرت آدم علیہ السلام نے اللہ کے نور کے تصرف سے تمام غیبی اشیا کے ناموں کا علم حاصل کر کے ان کے نام بتا دیئے۔ نہ صرف ہم میں سے بعض لوگ بلکہ فرشتے بھی نور کو بشریت کے مقابلہ میں اعلےٰ و ارفع سمجھتے تھے۔ جس کی وجہ سے فرشتوں نے اللہ پر اعتراض اس وقت کیا۔ جبکہ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا قصد کیا۔ لیکن فرشتے تو جلد ہی سنبھل گئے اور اللہ کے فیصلے کے آگے جھک گئے مگر شیطان ابلیس جو اسوقت فرشتوں کا سردار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ وہ آگ سے پیدا کیا ہوا ہے۔ اس لئے وہ انسان سے بزرگ و افضل ہے ابلیس ملعون نے تکبر کیا اور انسان کو جو اعلےٰ مقام اللہ نے عطا کیا۔ اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ اس حکم عدولی پر اللہ تعالےٰ نے شیطان کو ہمیشہ کے لئے ٹھکرا دیا۔ اس لئے ہم لوگوں کے لئے لازم ہے کہ اس مقام پر ہم محتاط ہوں اور اس بشریت اور نور کے معاملہ میں ہم اس سوچ اور فکر سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ جس کو کہ ملعون ابلیس یا فرشتوں نے اختیار کیا تھا۔ چونکہ اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنے اعلےٰ قسم کے نور سے نوازا ہے۔ اسی لئے اب وہ خود کو پردوں

میں چھپا کر اپنے بندے سے تقاضا و توقع کرتا ہے کہ اس کا بندہ اپنے نور کی مدد سے اس کی نشانیوں کو دیکھ کر اپنے خالق و مالک کا علم حاصل کرے اور اس پر ایمان لائے اور اپنے رب کی اس طرح اطاعت کرے۔ جیسے کہ وہ اسے دیکھ رہا ہو اور اسے سن رہا ہو۔ چونکہ انسان ہی اللہ کے نزدیک اشرف المخلوقات قرار پایا ہے۔ اسی لئے صرف یہی روزِ قیامت اس کے امتحان کے اہل قرار پایا ہے۔ یہ جس وقت اپنی نورانی کیفیت کی مدد سے اپنے اللہ کو روزِ قیامت دیکھے گا تو فوراً اس پر ایمان لانا چاہے گا۔ کیونکہ یہ ابلیس نہیں ہے۔ جو کہ اللہ تعالےٰ کو دیکھتے ہوئے بھی اس کی حکم عدولی کی غلطی سر زد کرے گا۔ لیکن چونکہ اللہ پاک نے انسان کی تخلیق میں جو اعلےٰ نورانی عنصر رکھا ہے اس کے مطابق اللہ تعالےٰ انسان کے روزِ قیامت ایمان لانے اور اس کی اطاعت پر آمادہ ہونے کو اس وقت قبول نہیں فرمائے گا۔ لہٰذا جو انسان اس امتحان میں پاس ہوں گے۔ وہ نورانی فرشتوں سے اعلےٰ درجات پر فائز ہوں گے اور جو اس میں فیل ہوں گے۔ ان کو سزا بھی اُسی شدت سے ملے گی۔ انسان میں نور کا حال وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ اب آپ خود ہی اخذ کر لیں۔ کہ حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا کیا عالم ہو گا جو کہ اس اشرف المخلوقات میں سب سے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں اور اللہ پاک کے بعد بزرگ ترین ہیں اور اپنے اللہ کے ہر لحاظ سے اتنے قریب ترین ہیں کہ انسان کی عقل اس حقیقت کا ادراک کرنے سے عاجز و قاصر ہے۔

قبلہ کا تعین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش کے تابع

مسلمان جس وقت حج کرتے ہیں تو خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے کی بدولت اور اللہ کے گھر کی طرف منہ کر کے سجدہ کرنے کی بدولت بھی ان کے گناہوں کی کثافت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ پاک ہو جاتے ہیں۔ ان کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

اور حضور کا مقام یہ ہے کہ انہوں نے خانہ کعبہ کو بتوں کی کثافتوں سے اپنے دستِ مبارک سے پاک کیا ہوا ہے اور ہمارے نزدیک یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ جن پر ہمیں پوری طرح غور کر کے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اللہ پاک سے دعا مانگنی چاہیئے کہ وہ ہمیں اپنی نشانیوں کو صحیح انداز میں سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا کرے مسلمانوں کے لئے قبلہ کی بزرگی اور تقدس اپنی انتہا پر ہے۔ لیکن حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اعلیٰ شان دیکھیئے کہ اللہ تعالیٰ قبلہ کا تعین کرنا آپ کی خواہش کے تابع کر کے مسجد اقصےٰ سے بدل کر خانہ کعبہ کو قبلہ بنا دیتا ہے اور سورہ البقرہ میں حکم ہوتا ہے کہ تم اپنا منہ (نماز کے لئے) مسجد حرام کی طرف پھیر لو اور حد تو یہ ہے کہ اللہ پاک سورہ انفال میں حکم دیتا ہے کہ اے مسلمانو! جس وقت اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں پکارا کرے۔ اس کے پکارنے پر لبیک کہا کرو۔ چاہے تم نماز ہی کی حالت میں کیوں نہ ہو۔ یہ سب کچھ اس غرض سے بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ مسلمان بھائی حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلےٰ مقام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں اور اس طرح اللہ پاک کی اس نعمت کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان کی اُمت پر کی ہے اور جن کے صدقہ سے اس اُمت کو باقی تمام امتوں پر بزرگی و فضیلت عطا کی ہے۔ کا پورا پورا احساس کر سکیں۔ جیسے کہ سورہ احزاب میں اللہ پاک حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرماتا ہے کہ خوشخبری دے ایمان والوں کو اس بات کی کہ ان کے واسطے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان و بزرگی کا جتنا زیادہ احساس ہمیں ہوتا جائے گا۔ اسی لحاظ سے ہم پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی جائے گی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے اللہ پاک کی عظیم ترین نعمت ہیں اور اس نعمت کا بیان بھی عظیم انداز میں ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے ہمیں میلاد کی محفلیں بھی منعقد کرنی چاہیئں اور سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اجلاس بھی۔ لیکن ربیع الاوّل کے مہینے میں میلاد

کی محفلیں خصوصیت کے ساتھ پورے ذوق و شوق کے ساتھ اور پورے دین کے ادب واحترام کے ساتھ منعقد کرنی چاہئیں. کیونکہ جناب رسولِ خدا ﷺ اسی مبارک مہینہ میں پیدا ہوئے تھے.

محفلِ میلاد میں جو نعت خوانی ہوتی ہے. وہ ہمارے دین میں کوئی بدعت اسلیئے نہیں ہے. کیونکہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں حضرتِ حسان (رضی اللہ تعالٰے) بن ثابت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور شان میں مسجد نبوی میں نعت پڑھا کرتے تھے اور اصحابہ کرام رضی اللہ تعالٰے علیہم اجمعین اس محفل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود ہوا کرتے تھے اور نعت خوانی سے بہت محظوظ ہوا کرتے تھے. وجہ اس کی یہ ہے کہ جس کی تعریف بیان کر کے خود اللہ تعالٰے فخر و خوشی محسوس کرے. اس کی تعریف اس کے امتی کیوں نہ کریں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعمت ہونے کے بیان کو پایہ تکمیل تک کیوں نہ پہنچائیں. پھر اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ کسی تخلیق کی جتنی بھی تعریف جب کی جاتی ہے وہ دراصل تمام تعریف تو اس تخلیق کے خالق ہی کی ہوتی ہے. اس لحاظ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی بھی ہم مسلمان تعریف اور شان بیان کرتے ہیں. وہ تمام تر اللہ پاک ہی کی تعریف ہوتی ہے اسی کی حمد و ثنا ہوتی ہے. کیونکہ اس اعلیٰ مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فائز کرنے والا خود اللہ جلشانہٗ ہی تو ہے. البتہ ہمیں اتنی احتیاط ضرور کرنی چاہیئے کہ ہم نعت خوانی میں تعریف کرتے کرتے اس حد سے تجاوز نہ کر جائیں، جس سے کہ نعوذ باللہ کسی انداز میں کفر و شرک کا پہلو نکل سکے. جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت کے بعض لوگ ان کی شان و عظمت سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ اللہ کا بیٹا سمجھ بیٹھے اور اس مقام پر وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے.

اللہ کے نزدیک زندہ کون ہے

اب ہم محفل میلاد میں درود سلام کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں۔ ویسے تو سب مسلمان بھائی جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں۔ کیونکہ قرآنِ مجید کی سورہ احزاب کی اس آیتِ مبارکہ پر ان کا ایمان ہے۔ جس میں ارشاد ربانی ہے۔ "بے شک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں۔ اس نبی پر اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجا کرو"۔ لیکن چونکہ اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کے لئے کوئی واضح درود وسلام ہدایت نہیں فرمایا، جس میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا جاتا ہو یا یوں سمجھیں کہ ندا دی جاتی ہو۔ کیونکہ ایک فرقہ کے مسلک میں صرف خدا کی ذاتِ بابرکات کے سوا اور کو پکارنا جائز نہیں اور دوسرے یہ کہ انبیاء مر جانے کے بعد اپنی قبروں میں مردہ ہیں اور کسی کی پکار کو نہیں سن سکتے۔ اس وجہ سے اس فرقہ کے نزدیک صرف درودِ ابراہیمی پڑھنا ہی صحیح و جائز ہے اور دوسرا فرقہ انبیاء علیم السلام کو چونکہ اپنی قبور میں زندہ مانتا ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک ندائی درود وسلام بالکل واجب و جائز ہے۔ وجہ اس تفرقہ کی یہ ہے کہ ہم اپنے محدود مادی مشاہدے کے مطابق جو سطحی ہوتا ہے۔ اس شخص کو جو مر جائے۔ جس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے۔ اس کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ مر جانے والا بظاہر ہمارے ساتھ اب بولنا۔ کھانا پینا چلنا پھرنا اور سونا، جاگنا سب کچھ بند کر دیتا ہے۔ لیکن چونکہ اس مسئلہ کا کہ کون زندہ ہے اور کون مردہ ہے کا براہِ راست تعلق اللہ پاک کی ذات عالیشان سے ہے۔ اسلئے نہایت موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے اپنی اپنی عقل و فہم کے ساتھ اسی قادرِ مطلق کی طرف مناسب راہنمائی حاصل کرنے کے لئے رجوع کریں۔ جو کہ ہم سب کا خالق و مالک ہے۔ قرآن پاک میں جو ارشاداتِ ربانی ہیں۔ ان سے یوں ہی سمجھ آتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک زندہ صرف وہ بندے ہیں۔ جو اس کی پکار کو سنتے اور اس سے

ڈرتے ہیں اور اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے مکمل ایمان لاتے ہیں۔ یہ بندے اس کے نزدیک زندہ ہیں۔ چاہے وہ اس مادی دنیا میں ہوں یا مر جانے کے بعد قبر کی مسافت طے کر کے اگلی دنیا میں چلے گئے ہوں۔

اور جو بندے اس کی پکار پر کان نہ دھریں۔ کافر ہوں اس سے نہ ڈریں اور اس پر ایمان نہ لائیں۔ وہ اللہ کے نزدیک مردہ ہیں۔ چاہے وہ بندے اس مادی دنیا میں بظاہر چلتے پھرتے کھاتے پیتے ہی کیوں نہ ہوں یا مر جانے کے بعد قبر کی مسافت طے کر کے دوسری دنیا میں چلے جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے۔ وہ بعض ذہنوں کو آسانی سے سمجھ نہ آ رہا ہو اور ان میں تنگی محسوس ہو رہی ہو لیکن امید کرنی چاہیئے کہ میں اپنی بات اگلی چند سطور میں ان پر کھول سکوں گا۔ پہلے سب سے تو یہ جان لینا چاہیئے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جس شخص کی روح اس کے جسم سے پرواز کر جائے۔ وہ زندہ نہیں رہتا اور اس کا ثبوت سورہ زمر کی یہ آیت کریمہ ہے کہ "اللہ جانوں کو ان کی موت کے نزدیک قبض کر لیتا ہے اور جو (موت کے نزدیک ابھی نہیں ہوتے) ان کی جانوں کو نیند کے دوران قبض کر لیتا ہے۔ پس بند کر رکھتا ہے۔ ان (جانوں) کو جن پر کہ موت مقرر کی ہے اور بھیج دیتا ہے۔ باقی جانوں (روحوں) کو ایک وقت مقرر تک بے شک اس میں غور کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔"

ابھی ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک صرف مومن زندہ ہیں۔ اس دنیا میں بھی اور موت کے بعد بھی اور کافر مردہ ہیں۔ اس دنیا میں بھی اور موت کے بعد بھی اس بیان سے جو مسئلہ تجزیہ کے لئے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک تو یہ معلوم کیا جائے کہ کافر کیسے اس مادی دنیا میں موت آنے سے پہلے مردہ ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ مومن موت کے بعد کیسے زندہ ہوتے ہیں۔ پہلے ہم کافر کے مردہ ہونے کا معاملہ لیتے ہیں۔ سورہ انفال میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اے ایمان والو تم اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول

کا بھی اور تم اس کا کہنا ماننے سے روگردانی مت کرنا اور تم تو سن لیتے ہی ہو اور تم ان لوگوں (کافروں) کی طرح نہ ہونا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے (سب کچھ) سن لیا حالانکہ (حقیقت میں) وہ سنتے سناتے کچھ نہیں۔ بے شک بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں، جو بہرے ہیں گونگے ہیں جو کہ ذرا بھی نہیں سمجھتے"۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اگرچہ بظاہر کافر بھی سنتے ہیں اور بولتے بھی ہیں۔ لیکن اللہ کے حساب یا پیمانے سے وہ اپنے کفر کی کیفیت کی وجہ سے بہرے اور گونگے قرار دیئے جا رہے ہیں تاکہ یہ بات مزید واضح ہو سکے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کرنی چاہیئے کہ زندگی کون بخشتا ہے۔ موت کون دیتا ہے اور مردہ کون کرتا ہے اگر یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔ تو پھر اس معاملہ میں اسی کے فیصلہ کو بھی حرفِ آخر ماننا پڑے گا۔ سورہ بقر میں ارشاد ہے کہ "وہ (کافر) نہیں دیکھتے۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں۔ پس وہ لوٹ کر نہیں آتے"۔ یہاں کافروں کو گونگے بہرے ہونے کے علاوہ اندھے بھی کہا جا رہا ہے۔ مزید غور کریں۔ سورہ الروم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ "بے شک نہیں سناتا تو مردوں کو اور نہیں سناتا بہروں کو اپنا پکارنا جس وقت کہ وہ پیٹھ پھیر کر مڑ جاتے ہیں اور تو (رسول) اندھوں کو ان کی گمراہی سے راہ دکھانے والا نہیں"۔ یہاں صاف طور پر ان لوگوں کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ جو کہ اللہ اور اس کے رسول کی پکار کو نہیں سنتے۔ انہیں اللہ پاک مردے بہرے اور اندھے قرار دے رہا ہے اور یہ مقام اللہ کے ہاں انسان کے تنزل کا ہے اور درجہ کے لحاظ سے گمراہی کی گہرائیوں میں گر جانے کا ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالےٰ سورہ اعراف میں یوں بیان فرماتا ہے کہ" واسطے ان لوگوں کے دل ہیں کہ نہیں سمجھتے ساتھ اُن (دل) کے اور واسطے ان کے آنکھیں ہیں۔ کہ نہیں دیکھتے ساتھ ان کے اور واسطے ان کے کان ہیں کہ نہیں سنتے ساتھ اُن کے"۔ یعنی کہ ان لوگوں کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں۔ یہ اندھے ہیں۔ بہرے ہیں۔ مردہ ہیں۔

اب اس بات کو بالکل برعکس انداز میں سنیئے تو بات مزید واضح ہو جائے گی. اللہ تعالےٰ سورہ انفال میں ارشاد فرماتا ہے کہ "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو پکارنا قبول کرو واسطے رسول کے. جبکہ (وہ) پکارے تم کو واسطے اس کے تاکہ وہ تم کو زندہ کرے" اس آیت کریمہ کا آپ اب خود ہی تجزیہ کرلیں. صاف صاف کہا جارہا ہے کہ اے ایمان والو اگر تم زندہ ہونا چاہتے ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی پکار کو قبول کرو. یعنی جو اس پکار کو قبول نہیں کریں گے. وہ زندہ نہیں کئے جائیں گے اور صاف ظاہر ہے کہ جو زندہ نہ ہو. وہ مردہ ہوتا ہے. چاہے اسے ابھی موت آئی ہو یا نہ آئی ہو. ہو سکتا ہے کہ اس مقام پر کسی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ اللہ نے اس آیت مبارکہ میں زندہ کا لفظ اصطلاحاً استعمال کیا ہے. ایسے شخص کو میں یہ کہوں گا کہ اگر تیرا اپنا لفظوں کا علم جو اللہ پاک کے علم و دانائی سے بہتر ہے اور تو اس آیت کریمہ کا یہ لفظ تبدیل کرنے کی صلاحیت و ہمت رکھتا ہے تو ایسا کرکے دکھا. لیکن اگر کوئی ایسی تبدیلی اللہ کے کلام میں کرنے سے عاجز ہے تو پھر اس زندہ کے لفظ کو کوئی اور معنی بھی پہنانے کی گستاخی نہ کر. کیونکہ اگر کوئی شخص لفظوں کے واضح معنی کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا. تو وہ صرف کلام الٰہی کے کسی لفظ کو ہی اپنے لفظ سے تبدیل کرنے کی جسارت کرنے کا مرتکب ہو گا.

زندہ کو مردہ کہنے والوں کو اللہ کی تنبیہہ

اسی ضمن میں اللہ پاک فرماتا ہے کہ مسلمانو!

"زندہ اور مردہ ایک برابر نہیں ہوتے" لہٰذا تم مردہ کو زندہ نہ سمجھو چاہے وہ دنیا میں تمہیں بظاہر چلتا پھرتا ہی نظر کیوں نہ آتا ہو اور زندہ کو مردہ مت سمجھو چاہے اُس پر موت ہی کیوں نہ واقع ہو چکی ہو اللہ کے ہاں زندہ تو مردہ سے بہت بلند درجہ پر فائز ہے. اس لئے اللہ پاک کو گوارا نہیں کہ تم اسے اپنے لاشعور کی وجہ سے مردہ کہو. سورہ فاطر

میں ہے۔" اور اندھا اور آنکھوں والا برابر نہیں اور نہ تاریکی اور روشنی اور نہ چھاؤں اور دھوپ اور زندہ اور مردہ بھی آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔"

"اللہ تعالیٰ تو جس کو چاہتا ہے سنوا دیتا ہے اور آپ (رسول) ان لوگوں کو نہیں سنا سکتے جو کہ قبروں میں ہیں، عوام کے فہم کے مطابق تو قبروں میں صرف مردے ہی ہوا کرتے ہیں، مگر دنیا میں چلتے پھرتے سانس لیتے لوگ نہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ تو یہی فرما رہا ہے کہ یہ لوگ جو نہیں سنتے اپنی قبروں میں ہیں اور اپنے کفر کی وجہ سے مردہ ہیں اور اسی ضمن میں سورہ الانعام میں ارشاد باری ہے۔ ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا۔ پھر ہم (اللہ) نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے ایسا نور دیا کہ وہ اس کو لئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیا یہ شخص ایسے شخص کی طرح ہو سکتا ہے۔ جس کی حالت یہ ہو کہ وہ (کفر) کی تاریکیوں میں ہے۔ (۵۹) ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا" اور سورہ یٰسین میں ارشاد ہے کہ "قرآن، ہدایتوں کی ایک روشن کتاب ہے تاکہ ڈراوے (صرف) اس شخص کو جو کہ زندہ ہے اور کافروں کے اوپر (عذاب) کی بات سچ ہو۔"

کافروں کے مردہ ہونے کے مسئلہ کی کافی وضاحت ہو چکی ہے اب مومنوں کے زندہ ہونے یا زندہ رہنے کے بارے میں کچھ تحقیق درکار ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ کیا مومن اپنی موت وارد ہو جانے کے بعد بھی زندہ ہی ہوتے ہیں یا مردہ ہو جاتے ہیں۔ اس بارے میں سورہ البقر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے" اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں۔ ان کے بارے میں یہ مت کہو کہ وہ مردہ ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں اور لیکن تم اس بات کو سمجھنے کا شعور نہیں رکھتے۔" اس آیت کریمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے بعض مسلمان اللہ کے ان مومن بندوں کو ان کی موت وارد ہو جانے پر مردہ تصور کرتے تھے اور یہ بات اللہ کو ہرگز گوارا نہ تھی کہ اس کے مومنوں کو زندہ ہونے کے اعلےٰ مقام و درجے سے گرا کر کافروں میں شامل کر دیا جائے۔ جو کہ موت سے پہلے اور بعد دونوں حالتوں میں مردہ ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس

آیت میں مسلمانوں کو جھڑک پلائی جا رہی ہے اور تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ تم ان کو مردہ صرف اس وجہ سے مت کہو۔ کیونکہ یہ بات تمہاری عقل کی حدود سے باہر ہے اگر اللہ پاک اپنے شہیدوں کو مردہ کہلوایا جانا برداشت نہیں فرماتا تاکہ اس وجہ سے شہیدوں کے درجہ کو گھٹایا نہ جائے تو جو شہیدوں سے بلند درجہ پر صدیقین اور صدیقین سے بلند درجہ پر انبیاء علیہ السلام ہیں۔ ان کو مردہ کہلوا کر ان کا درجہ کم کرنے کی کوشش کو کب برداشت کرے گا۔ اگر شہید جنت میں زندہ ہیں تو انبیاء علیہ السلام اور صدیقین بھی جنت میں زندہ ہیں اور اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں یا مر جائیں تو اللہ ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کرے گا۔ اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں مارے جانے والے یا مرنے والے ایک جگہ پر اکٹھے کیے جائیں گے ان سب کی حالت اور کیفیت ایک جیسی ہو گی اس طرح اگر اللہ کی راہ میں مارے جانے والے زندہ ہوں گے تو اس کی راہ میں مرنے والے بھی زندہ ہی ہوں گے اور ہر اللہ کا ولی جس وقت مرتا ہے۔ وہ اسی کی راہ پر زندگی کے آخری لمحہ تک گامزن ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ بھی زندہ ہے ہم سب یہ بات متفقہ طور پر مانتے ہیں کہ اللہ تعالٰے کے ہاں شہید اپنی موت وارد ہو جانے کے بعد بھی زندہ ہوتے ہیں۔ البتہ ہم سے بعض صرف ان لوگوں کو شہید مانتے ہیں۔ جو کہ حقیقتاً اللہ ہی کی راہ میں مارے جائیں۔ لیکن سورہ الحدید میں اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ "جو لوگ ایمان لاتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ یہ سب لوگ سچے ہیں اور شہید ہیں اپنے پروردگار کے نزدیک"۔ اس سے واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ جن لوگوں کے ایمان کو اللہ تعالٰے نے شرف قبولیت بخشا۔ وہ سب کے سب اپنے پروردگار کے نزدیک شہید یعنی حاضر ہیں۔ موجود ہیں۔ زندہ ہیں۔ کیونکہ جو حاضر اور موجود ہو۔ وہ مردہ نہیں ہوتا۔ جیسے کہ سورہ البروج میں ہے کہ " اور اللہ ہر چیز پر شہید یعنی حاضر ہے"۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ زندہ ہے۔ یہاں یہ بات کھل کر روز

روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے کہ اللہ پاک نے جس شخص کو مردہ قرار دیا وہ مردہ ہی رہے گا اور موت وارد ہونے کے بعد بھی وہ اللہ کے نزدیک مردہ ہی رہے گا اور جس شخص کو اللہ پاک نے زندہ قرار دے دیا. تو وہ بھی موت وارد ہونے کے بعد اپنے اللہ کے نزدیک زندہ و سلامت ہی رہے گا. یہ بات بھی اچھی طرح واضح ہو جانی چاہیئے کہ جس شخص کو اللہ پاک اپنی سلامتی میں لے لے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے. وہ کبھی مردہ نہیں ہو سکتا. جیسے کہ سورہ بقر میں ارشاد ہے کہ" یہ (مومن) لوگ ہیں (کہ) جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے درود اور رحمت ہے."

زمین، سورج، چاند، پہاڑ سب زندہ ہیں

ہو سکتا ہے کہ کسی مسلمان بھائی کا ذہن اس بات کی طرف ہی صرف جاتا ہو کہ انسان کو اللہ تعالٰے نے دو چیزوں سے تخلیق کیا ہے. ایک تو اس کا جسم ہے جو کہ زمین کی مٹی سے بنا ہے اور دوسری اس کے جسم میں روح پھونکی اور جس وقت انسان مرجاتا ہے تو اس کی روح تو اوپر پرواز کر جاتی ہے اور خاکی جسم زمین کے اندر زمین کا حصہ بن جاتا ہے. لہٰذا یہ کیسے کہا جائے کہ یہ خاکی جسم بغیر روح کے زندہ ہوتا ہے. اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے اس بات کا تجزیہ کرنے کی اب ضرورت ہے کہ زمین بذاتِ خود کیا زندہ ہے یا کہ مردہ. سورہ روم میں ارشادِ حق ہے کہ" پس دیکھو خدا کی رحمت کی نشانیوں کی طرف. کس طرح وہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا، سورہ حج میں ارشاد ربانی غور طلب ہے کہ" کیا نہیں دیکھا تو نے یہ کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں. واسطے اس اللہ کے جو کوئی بھی بیچ آسمانوں کے ہے اور جو کوئی بیچ زمین کے ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت آدمیوں میں سے اور بہت ایسے آدمی ہیں کہ ان پر عذاب ثابت ہوا."

سورۃ الاحزاب کی آیت ۷۲ میں ہے کہ جب اللہ نے امانت، کو آسمانوں۔ زمین اور پہاڑوں کے

روبرو پیش کیا تو وہ ڈر گئے اور انھوں نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کر دیا۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوا
کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے ہمکلامی کی اور امانت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیتے
ہوئے انکار کیا۔ اس سے بھی ثابت ہوا کہ یہ سب چیزیں زندہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بات کا جواب بھی
دیتی ہے سورۃ الزلزال میں ہے کہ قیامت کے دن زمین بولے گی اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی روداد
پیش کریگی۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ سورج چاند، ستارے، پہاڑ درخت وغیرہ سب زندہ
ہیں۔ زمین بھی زندہ ہے اور زمین کا زندہ ہونا تو سائنس کی رو سے بھی سمجھ آتا ہے۔ سائنس
زندگی کے عمل کو طاقت و توانائی کے ظہور سے حرکت سے۔ آواز کے پیدا ہونے سے
شناخت کرتی ہے۔ طاقت سے حرکت پیدا ہوتی ہے۔ حرکت سے نشو و نما ہوتی ہے
اور منتقلی مقام بھی ہوتی ہے اور یہ سارے عمل زمین میں کیمیاوی عمل کے تحت ہوتے ہیں
اور پہاڑ تو حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ اللہ کی حمد و ثناء میں شامل ہوتے تھے۔
سمجھ آتا ہے کہ زمین زندہ ہے تو اس کا ایک ایک ذرہ بھی زندہ ہوتا ہے لیکن
انسان صرف وہ زندہ ہیں جو کہ اللہ کی پکار کو سن کر اسے قبول کرتے ہیں۔ اللہ کی تسبیح
کرتے ہیں۔ اس کی نماز پڑھتے ہیں اور اس کو سجدہ کرتے ہیں اور جو مسلمان دنیا میں زندہ ہوتے
ہیں۔ وہ مر جانے کے بعد بھی زمین میں دفن ہو کر بھی زندہ ہی رہتے ہیں۔ البتہ وہ لوگ جو اللہ
کی پکار کو نہیں سنتے اور اس کو سجدہ نہیں کرتے۔ اس کے حضور سر تسلیم خم نہیں کرتے وہ
اللہ کے ہاں مردہ ہیں اور دنیاوی لحاظ سے ہمارا مردے کے بارے میں بھی یہی تصور ہے
کہ وہ کچھ سنتا نہیں، دیکھتا نہیں اور ہماری پکار کے مطابق کوئی عمل نہ کرتے ہوئے اپنی بے
حسی کا ثبوت دیتا ہے۔ اب ہم اللہ کے نقطہ نگاہ سے اسی معاملہ کو دیکھیں تو یہ بات سامنے
آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو انسان کو صرف اسی مقصد کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت
کرے، اس لئے جو انسان اللہ کی پکار نہ سنے اس کی پکار کو قبول نہ کرے۔ اس کو سجدہ نہ کرے
اس کی تسبیح نہ کرے بلکہ ان تمام ضروری شرائط کو پورا کرنے کی بجائے وہ اس سے بغاوت

کرے اس کی ذات گرامی کو ماننے سے انکار کردے اور وہ انسان پیدائش کے واضح مقصد عبادات کی خلاف ورزی کرتا ہو تو اللہ پاک سے مردہ قرار نہ پائے تو اور کیا ہو۔

صرف کافر مردہ ہوتے ہیں

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض مسلمان بھائی عام مومنوں کو تو درکنار انبیاء اور اولیا اللہ کو بھی مر جانے کے بعد زندہ تصور نہیں کرتے۔ اسی سلسلہ میں میری توجہ کا سبب ایک کتابچہ بعنوان "یہ قبریں یہ آستانے" بنا ہے۔ اس کو میرے بھائی کیپٹن ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی (جو کہ حزب اللہ کراچی کے امیر ہیں) نے سپرد قلم کیا ہے۔ انہوں نے آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالے سے ثابت کرنے کی ہر چند کوشش کی ہے کہ ہر انسان مر جانے کے بعد مردہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ نبی ہو، ولی ہو، مومن ہو یا کافر ہو۔ اس ضمن میں انہوں نے سب سے زیادہ سہارا سورہ نحل کی ان آیاتِ مبارکہ کا لیا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ ج وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ترجمہ: اور جو لوگ پکارتے ہیں سوائے اللہ کے نہیں پیدا کرتے ہیں وہ کچھ اور وہ پیدا کئے جاتے ہیں، مردے ہیں، نہیں زندہ اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ ان آیات کریمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں کا پہلی آیت میں ذکر کیا جا رہا ہے۔ وہ لوگ وہ ہیں جو یہ حقیقت نہیں جانتے کہ جن کو وہ پکارتے ہیں، وہ خالق نہیں ہیں، بلکہ مخلوق ہیں، چونکہ جو مسلمان رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کے روضوں پر جاتے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں اور ان کا ایمان اس بارے میں کم از کم پختہ ضرور ہے۔ کہ سب انسانوں کا خالق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس کے سوا اور کوئی نہیں، اس لئے ان ایات میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ ایسے کافر لوگ ہیں، جو عقل پر پردہ پڑنے اور دلوں پر مہر لگنے کے باعث جن بتوں کو پکارتے ہیں، اُن کو خالق مانتے ہیں، اس لئے یہ لوگ کافر ہیں اور اپنے معبودوں کو

پکارنے اور پوجا کرنے کی وجہ سے اللہ پاک ان کافروں کو مردے قرار دے رہا ہے نہ کہ زندہ اور پھر یہ بتا رہا ہے کہ یہ مردہ کافر اس لئے کفر کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہی نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ یعنی وہ یقین نہیں رکھتے کہ واقعی قیامت آئے گی۔

اور دوسری آیت سورہ الاعراف کی ہے۔ جسکا کہ سہارا لینے کی کوشش کیپٹن صاحب نے کی ہے۔ وہ یہ ہے۔ "تم لوگ اللہ کو چھوڑ کر جنہیں پکارتے ہو۔ وہ تو محض اللہ کے بندے ہیں۔ جیسے تم بندے ہو۔ ان سے دعائیں مانگ دیکھو۔ یہ تمہاری دعاؤں کا جواب دیں، اگر ان کے بارے میں تمہارے خیالات صحیح ہیں۔ اس آیت کو کیپٹن مسعود مسلمانوں پہ مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا نہیں ہے۔ جسے یہ نہ پتہ ہو کہ سب انسان اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ کوئی مسلمان اللہ کو چھوڑ کر یعنی اس کی نفی کرتے ہوئے اور اس کے وجود سے انکار کرتے ہوئے کسی غیر اللہ سے مانگتا ہو۔

ان آیات مبارکہ کا متن صاف بتا رہا ہے کہ ان میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ کافر ہیں۔ لیکن جو لوگ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں رہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگتے ہیں وہ مسلمان ہیں، کفر و شرک نہیں کرتے۔ کیونکہ سورہ مومن میں ارشادِ ربانی ہے کہ " اور ہم (اللہ) نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا۔ مگر اس واسطے کہ اللہ کے حکم کے ساتھ اس کی فرمانبرداری کی جائے اور اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر کے تیرے (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) پاس آویں۔ پس اللہ پاک سے بخشش مانگیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے واسطے بخشش مانگے البتہ پاویں گے یہ لوگ اللہ کو پھر آنے والا مہربان" اس آیت مبارکہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلمان اپنی بخشش کے لئے نہ صرف خود ہی اللہ پاک سے دعا مانگے، بلکہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنی خاطر دعا کرنے کی استدعا کرے۔ جو کہ مانگنے ہی کی ایک قسم ہے۔

کیپٹن صاحب کو نہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی زندہ معلوم نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی برکات کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔

حالانکہ کوہِ طور برکت والا ہے، یعنی اس کی تمام مٹی اور تمام پتھر (سورۃ طٰہٰ آیت ۵۲، ۸۰) جہاں حضرت موسیٰؑ کے قدم لگے۔ اسی طرح حضرت جبرائیلؑ کے قدموں کے نیچے آنے والی مٹی جس کو سامری نے اپنے بنائے ہوئے سونے کے بچھڑے کے پیٹ میں ڈالا تو وہ اس کی وجہ سے بولنے لگ گیا اور سامری نے لوگوں کو راہِ ہدایت سے بھٹکانے کے لئے بچھڑے کو بطور معبود پیش کیا (سورۃ طٰہٰ آیت ۹۶) پھر جو مٹی حضرت اسماعیلؑ کی ایڑیوں کے نیچے بچپن کی حالت میں آئی۔ وہاں سے آبِ زم زم نکلا، جو دنیا کے تمام پانیوں سے برکت والا بن گیا۔ اسی طرح صفا اور مروا کی پہاڑیوں پر جہاں حضرت بی بی حاجرہ کے پانی کی تلاش میں قدم لگتے رہے۔ وہ پہاڑیاں برکت والی بن کر شعائر اللہ کا درجہ پاگئیں۔ (سورہ البقرآیت ۱۵۸) اب جب تک ان پہاڑیوں کے درمیان کوئی مسلمان اگر اپنی کسی کجی کے باعث سعی کرنے سے گریز کرے تو نہ اسکا حج اور نہ ہی عمرہ ادا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح جس پتھر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کا نشان خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران لگا۔ وہ مقامِ ابراہیم کا درجہ پاکر برکت والا بن گیا اور خانہ کعبہ کے تقدس اور زینت کا حصہ بن گیا۔ اسی طرح غارِ حرا کا پہاڑ بھی مقدس اور برکت والا اور غارِ ثور کا پہاڑ بھی خانہ کعبہ کا حجرِ اسود بھی اور دوسرے پتھر بھی اور جو غلاف خانہ کعبہ کا غلاف بن کر خانہ کعبہ کے پتھروں کو چھو جائے۔ وہ غلاف بھی نہایت برکت والا۔ اگر سورۃ بنی اسرائیل کے مطابق مسجدِ اقصیٰ اور اس کے گردو نواح کو اللہ کی برکتوں نے گھیرا ہوا ہے تو مسجد نبوی اور روضۂ مبارک کے تقدس اور برکت کا کیا عالم ہوگا۔ سورۃ احزاب کے مطابق اللہ تعالیٰ، اس کے تمام فرشتے اور کروڑوں مسلمان دن رات حضور علیہ السلام پر درود و سلام بھیج رہے ہیں۔ یہاں ممکنہ معترضین کی خدمت میں یہ گوش گزار کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی ذاتِ اقدس کی تکمیل ان کی روحِ مبارک اور جسم مبارک دونوں کے مجموعہ سے ہوتی ہے۔ ایک کو دوسرے سے جدا کرکے یا سمجھتے ہوئے حضورؐ کی ذات مبارک ادھوری رہتی ہے۔ جسم اور روح دونوں کی شرکت لازم ہے۔ لہٰذا رحمت اللعالمین روضہ مبارک سے تمام عالموں کی ہر شے پر رحمت بھیج رہے ہیں۔ جو شے اس رحمت کی طالب ہو اور جس پر رحمت کرنا حضور علیہ السلام منظور یا پسند فرمالیں۔ لہٰذا ان کے روضۂ مبارک کا ہر پتھر، تمام مٹی اور جالی نہایت مقدس اور برکت والی۔ جس نے اسے چھو لیا یا چوم لیا وہ پاک ہوگیا۔ ہمیں ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ ہم تو عام پاک مٹی سے جس وقت تیمم کرتے ہیں تو ہمارا جسم نماز کے لئے پاک ہو جاتا ہے اور تیمم کے

عمل میں مٹی جس طرح ہمارے منہ پر لگتی ہے تو وہ ہماری آنکھوں سے بھی لگتی ہے اور لبوں سے بھی
جو کہ ایک لحاظ سے مٹی کو چومنے کے مترادف ہی ہوتا ہے اور یہ شرک نہیں کیونکہ سب جانتے ہیں
کہ اللہ تعالیٰ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ سجدہ اور عبادت سوائے اس قادرِ مطلق کے کسی اور کی نہیں
کی جا سکتی۔ بات صرف یہ وضاحت کرنا مقصود ہے کہ ہر پہاڑ کا اپنا اپنا تقدس اور مقام ہے
ہر پتھر اور ہر کنکری اور ہر مٹی کا اپنا اپنا تقدس اور مقام جیسے کہ آپ جانتے ہیں کہ شیطان کے جمروں
کو سوائے مزدلفہ کی کنکریوں سے رمی نہیں کی جا سکتی اور سورۃ الفیل کی آیت ۴ کے مطابق جن
کنکریوں نے کفار کے ہاتھیوں کو مار ڈالا تھا۔ عام کنکری یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ بلکہ ایک چھوٹے
سے کبوتر کو بھی نہیں مار سکتی۔ اسی طرح نہ ہر کنکری قوتِ گویائی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ شرف صرف
ان کنکریوں کو ہی حاصل ہوا، جو کہ حضورؐ کے حکم سے بول اٹھیں جن کی ایک جنبش نے لاکھوں میل دور حجم میں
زمین کی مانند بڑے چاند کے دو ٹکڑے کر دیے۔ (سورۃ القمر آیت ۔ ۱) لہٰذا اب تک یہ سمجھ
آ جانا چاہیے کہ ہر روضہ مبارک کی اپنی اپنی برکت اور اپنا اپنا مقام ہے چاہے وہ روضہ مبارک انبیاء
علیہ السلام میں سے کسی کا ہو یا اولیاء کرام میں سے کسی کا۔ سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ موسیٰ
علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی وہ چیزیں جو صندوق میں بند تھیں اور فرشتوں کی تحویل میں دے دی
گئی تھیں۔ وہ سب برکت والی اور تسکین عطا کرنے والی تھیں۔ سوچنے کا مقام ہے کہ جہاں انبیاء
علیہ السلام اور برگزیدہ بندوں کے قدم لگ جائیں تو وہ جگہیں کتنی مقدس اور برکت والی ہو جاتی
ہیں اور جس جگہ پر سردار الانبیاء رحمتِ دو عالمؐ موجود ہوں۔ اس کی برکت اور تقدس کا کیا عالم ہو
گا اور یہ شرف مسجد نبوی اور روضہ مبارک کی جگہ کو حاصل ہے۔ ہماری بظاہر مشکل یہ ہے کہ ہم
زمین اور اس کی مٹی کو مردہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ سورۃ الزلزال کے مطابق قیامت کے دن زمین بولے
گی اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی روئیداد پیش کرے گی۔
پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ کیپٹن صاحب اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے حضرت امام
مسلم رضی اللہ عنہ کی احادیث کا سہارا لے لیتے ہیں اور متعدد جگہ پر ان کا حوالہ دیتے
ہوئے انہیں صحیح قرار دیتے ہیں، لیکن جب امام مسلم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج کے
واقعہ کے سلسلے میں دو حدیثیں بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کو اپنی قبر مبارک میں نماز پڑھتے دیکھا اور دوسری حدیث میں حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو مسجد اقصےٰ میں نماز پڑھتے دیکھا تو ان حدیثوں کو جھوٹا مانتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پلک جھپکنے میں اللہ کی قدرت کے ساتھ ساتویں آسمان سے پرے سدرہ سے آگے جا کر اللہ تعالےٰ کی نشانیاں دیکھ سکتے تھے۔ جنت دوزخ کی سیر کر سکتے تھے۔ نیز اگر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک ادنیٰ غلام صرف آنکھ کے ایک جھپکنے میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے بلقیس کا تخت اللہ کی قدرت کے تحت حضرت سلیمان علیہ السلام کے قدموں میں لاکر رکھ سکتا تھا تو کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام قبر سے مسجد اقصیٰ میں اپنے اللہ کی قدرت سے آناً فاناً نہیں پہنچ سکتے تھے اور کیا ہمارا روزمرہ کی زندگی کا مشاہدہ نہیں ہے کہ لوگ اکثر نماز کا کچھ حصہ مسجد میں اور کچھ اپنے گھر میں بعض اوقات ادا کرتے ہیں۔ پھر کیپٹن صاحب شہیدوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ قبروں میں تو مردہ ہیں، لیکن جنت میں زندہ ہیں۔ اس طرح وہ بیک وقت ایک شخص کو زندہ بھی قرار دیتے ہیں اور مردہ بھی۔ انہیں کون سمجھائے کہ جو زندہ ہے وہ صرف زندہ ہے۔ اسے مردہ کہنا اللہ پاک کی سورہ بقر کی اس آیت کی نافرمانی کے مترادف ہے، جس میں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ " جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں تم مردہ مت کہو وہ زندہ ہیں" لیکن کیپٹن صاحب بضد ہیں کہ انہیں مردہ کہیں۔

پھر کیپٹن صاحب کو اور ان کے ہم خیال مسلمان بھائیوں کو یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے ہمارے علمائے دین کو پوری پوری توجہ دینی چاہیئے تاکہ جو مسلمان بھی روضۂ مبارک پر جائے اپنی صحیح دینی کیفیت اور عقائد کے ساتھ جائے۔ شعائر اللہ کا اپنا اپنا مقام تقدس ہے حجرِ اسود کا اپنا صفا و مروا کی پہاڑیوں کا اپنا اور روضوں کا اپنا اپنا۔ مثال کے طور پر تو گلاب کا پھول بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ لیکن اسے دیکھنے سے اگر کوئی منہ موڑے تاکہ اس کی خوبصورتی گھٹن پیدا نہ کرے یا اس کی خوشبو سونگھنے سے اس کے دل میں کجی پیدا ہو۔ تو ایسے شخص کے متعلق آپ کیا رائے قائم کرینگے۔

کیپٹن عثمانی اور توحیدِ خالص

کیپٹن ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی صاحب نے حال ہی میں ایک اور کتاب بعنوان "توحیدِ خالص" شائع کی ہے. اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت عثمانی صاحب کو بظاہر اس لئے پیش آئی. کیونکہ مولانا محمد یوسف بنوری صاحب نے اپنے والد مولانا سید محمد زکریا صاحب کی وصال کی یاد میں اُن کی روحانی بزرگی و کمالات کے حالات کچھ اس انداز سے لکھے جو کہ کیپٹن عثمانی صاحب کے ادراک و فہم سے بالا تر تھے اور بقول ان کے "توحیدِ خالص" کی نفی کرتے تھے. مولانا یوسف بنوری صاحب ملک کے نامور علماء میں سے ہیں اور دینی حلقوں میں اعلےٰ شہرت کا مقام رکھتے ہیں. تحفظِ ختم نبوت کمیٹی پاکستان کے صدر بھی ہیں اور بقول ڈاکٹر عثمانی صاحب بنوری صاحب ان کے استاد بھی ہیں. امکانِ غالب ہے کہ مولانا یوسف بنوری صاحب نے اپنی پہلی فرصت میں عثمانی صاحب کے اعتراضات کا بحوالہ قرآن خاطر خواہ جواب اس وقت تک دیدیا ہوگا.

عثمانی صاحب تمام اولیائے کرام پر اعتراضات کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ ان بزرگوں (مثلاً شفیق بلخی. ابراہیم ادھم. بایزید بسطامی. سری سقطی معروف کرخی اور جنید بغدادی) کے متعلق ضرور معلوم کرنا چاہیں گے کہ یہ حضرات کون اور کیا تھے. کوشش کرونگا کہ مشہور حضرات کی کتابوں کے حوالہ جات سے ان کی شخصیات پر روشنی ڈالوں اور ان کے حالات پر روشنی ڈالنے کی غرض سے حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ صاحب کی کتاب "کشف المحجوب" اور حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ صاحب کی کتاب "انیس الارواح" کے حوالہ جات دیتے ہیں اور ان پر اپنی دانست کے مطابق بحث کرتے ہیں اور اپنی کتاب کے شروع میں حضرت خواجہ ابراہیم ابن ادھمؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ واقعات پڑھنے سے "اب اگر

کسی کو یہ وسوسہ ستائے کہ ہرن فصیح عربی کیسے بولنے لگا اور جنگل میں ہر میل طے کرنے پر چار سو رکعات نماز کیوں؟ یا یہ مسلسل صحرانوردی کیسی؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس کی تعلیم نہیں دی اور اس ساری مدت میں بغیر کسی سبب کے رزق کا مہیا ہو جانا عجیب بات ہے اور عجیب تر یہ کہ خضر علیہ السلام سے جن کے متعلق سارے محدثین اور مفسرین کا اجماع ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں، ملاقات اور بیعت کیسی اور وہ کونسا اللہ کا نام ہے کہ جس کے سیکھ لینے کے بعد ماسوا اللہ سے دل فارغ ہو جاتا ہے"۔

کیپٹن عثمانی صاحب نے مندرجہ بالا سطور میں "توحیدِ خالص" کے نام پر متعدد اعتراضات اٹھائے ہیں، توحیدِ خالص سے ان کا اصل مدعا کیا ہے، یہ تو وہی جانیں۔ ہم اتنا وثوق سے ضرور کہہ سکتے ہیں کہ عثمانی صاحب کے محترم استاد مولانا محمد یوسف بنوری صاحب بدرجۂ اتم اللہ کی توحید کے قائل ہیں، توحید کے پرستار ہیں۔ یہاں بنوری صاحب کے متعلق ایک واقعہ یاد آگیا۔ کچھ سال کی بات ہے کہ انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام لاہور میونسپل کارپوریشن کے ٹاؤن ہال میں قرآن کانفرنس کا ایک سالانہ اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ اس کی ایک نشست کا صدارتی خطبہ جناب مولانا یوسف بنوری صاحب نے ادا کیا۔ خطبہ کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اور حمد و ثنا کا ایسا پرکشش و دلنشیں بیان تھا کہ ہال کی تمام فضا انوارِ الٰہی سے لبریز ہو رہی تھی۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ بنوری صاحب عالموں کے بھی عالم ہیں۔ تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ البتہ مولانا بنوری صاحب کا یہ قصور ہے کہ انہوں نے اپنے والدِ محترم کے حالات و کرامات کو عقیدت کے طور پر شائع تو کر دیا۔ لیکن انہیں ایسا کرتے وقت یہ دھیان نہ رہا کہ اس دنیا میں عثمانی صاحب بھی موجود ہیں۔ مولانا یوسف بنوری صاحب کے ان شاگرد کی موجودہ کیفیت دیکھ کر کسی وقت یوں احساس سا ہونے لگتا ہے کہ اگر بنوری صاحب کے والدِ بزرگوار کے حالات بنوری صاحب کی مناسب راہنمائی و ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ سے فراہم نہ

ہوئے ہوتے۔ تو شاید وہ بھی عثمانی صاحب کی طرح محض اپنے کتابی علم کی مادی اساس پر عثمانی صاحب سے اپنے عقیدہ میں قدرے مختلف نہ ہوتے۔

اب ہم کیپٹن عثمانی صاحب کے مندرجہ بالا اعتراضات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ہرن فصیح عربی زبان کیسے بولنے لگا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم ادہم نے اس کا جواب بھی دیا ہے کہ ہرن کو قوتِ گویائی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی یعنی اس میں ابراہیم ادہم کا اپنا کرشمہ کوئی نہیں ہے۔ لیکن عثمانی صاحب اس جواب سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے غیر مطمئن ہونے کی وجہ تین وجوہات میں سے ایک ہو سکتی ہے۔ اوّل شاید ان کی وجہ یہ ہو۔ کہ اللہ تعالیٰ ہرن کو قوتِ گویائی دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ دوم شاید ان کا اعتراض یہ ہو کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ قوتِ گویائی دینے کی قدرت تو رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ ہرن محض ایک جانور ہے اس لئے اللہ اُس کو قوتِ گویائی کیونکر عطا کرے گا۔ اس لئے حضرت ابراہیم نے اس معاملہ میں دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ سوم۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ عثمانی صاحب کا بیان کردہ وسوسہ محض ان کی ذہنی کیفیت و رجحان کی عکاسی کرتا ہے جس کا کہ اصل حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں پہلی وجہ اعتراض تو "آناً فاناً" یکسر رد ہو جاتی ہے کیونکہ سب خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ وہ جو چاہتا ہے۔ جب چاہتا ہے اور جیسے چاہتا ہے فوراً ہو جاتا ہے۔ وہاں نہ تو کسی سبب کی کوئی قطعاً ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی اللہ کے ہاں اس بات کی کوئی پرواہ ہوتی ہے کہ فلاں ہونے والی بات کسی کی سمجھ میں آئے گی یا نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوقات کے دلائل و اعتراضات سے بالا و بے نیاز ہے۔ دوسری وجہ اس واسطے رد ہوتی ہے کہ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر شے کو زندگی بخشی ہے اور زبان بھی بخشی ہے جس سے کہ وہ شے اپنے اللہ کی تسبیح کرتی ہے اس کی نماز پڑھتی ہے لیکن اگر ہم لوگ اپنی محدود کیفیت کے باعث یہ تسبیح نہیں سنتے اور نہ ہی نماز پڑھتے ہوئے کسی شے کو دیکھتے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ کی ہر شے

ہیں نہ تو جان ہے نہ وہ تسبیح کرتی ہے اور نہ ہی نماز پڑھتی ہے۔ جانوروں اور پرندوں کے متعلق ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہر جنس اپنی اپنی بولی بولتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے کی بات کو سمجھتی ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم ننھی چیونٹیوں کو آپس میں باتیں کرتے سن نہیں سکتے۔ اس لئے ہم میں سے کچھ وہ بھی ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ چیونٹیاں بول نہیں سکتیں لیکن اللہ ہمیں قرآن پاک میں بتاتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ سلام کو یہ تصرف حاصل تھا۔ کہ آپ نے چیونٹی کی بات کو دور ہی سے سن لیا کہ وہ اپنی زبان میں دوسری رعایا چیونٹیوں کو حضرت سلیمان کی فوج کی آمد سے خبردار کر رہی ہے اور انہیں جلدی رستہ سے ہٹ جانے کی ہدایت دے رہی ہے۔ البتہ جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام نے چیونٹی کی اس بات کو سنا تو چیونٹیوں کو تسلی دی کہ وہ خوفزدہ نہ ہوں۔ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اللہ کے بندوں اور جانوروں میں مخصوص حالات میں ہمکلامی ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالٰے ایک کو دوسرے کی زبان بولنے اور سمجھنے کی قوت عطا فرما دیتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے ہُدہُد اور جنات سے بھی یہ بات ثابت ہے البتہ ایسی صورتِ حال کے ظہور پذیر ہونے کی صرف ایک ہی شرط ہے کہ یہ سب کچھ صرف اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالٰے خود چاہے اور یہ شرط حضرت ابراہیم ادھم کے معاملہ میں اس انداز میں پوری ہو رہی ہے کہ وہ خود ہی صاف طور پر یہ بتا رہے ہیں کہ ہرن کو قوت گویائی اللہ تعالٰے نے عطا فرمائی اور اس وقت ابراہیم ادہم کا اپنا حال یہ ہے اشرف المخلوقات میں سے ہوتے ہوئے بھی آپ ہرن کی تنبیہ سے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ فوراً اللہ تعالٰے کی طرف اپنی توبہ کیلئے رجوع کر لیا۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ عثمانی صاحب کو اس میں " توحیدِ خالص " کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

عثمانی صاحب کی مشکل دراصل یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالٰے حضرت ابراہیم ادہم کے معاملہ میں یہ متذکرہ باتیں کیونکر کریگا۔ حالانکہ قرآنِ پاک سورہ کہف میں ہمیں

بتاتا ہے کہ اصحاب کہف بھی اللہ کی نشانیوں کو عجیب و حیران کن سمجھتے تھے۔ اصحابِ کہف بھی کوئی نبی تو نہ تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں کئی برس تک غار میں سلا دیا۔ ان کا کتا بھی ان کے ساتھ غار میں تھا۔ لیکن جب ان اصحابِ غار کو کئی برسوں کے بعد جگایا گیا۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ صرف ایک دن یا ایک دن سے بھی کم سوئے ہیں اور اسی طرح سورۃ بقر کی آیت ۲۵۹ میں ارشاد ہے کہ ایک شخص نے گمان کیا کہ اللہ موت کے بعد کیونکر زندہ کریگا۔ پس اللہ نے اس شخص کو مار ڈالا اور سو برس بعد اسکو جلایا اور جب اس شخص سے پوچھا گیا کہ وہ کتنی دیر تک اس حالت میں رہا تو اس نے کہا ایک دن یا ایک دن سے بھی کم۔ پھر اس شخص کو کہا گیا کہ وہ اپنا کھانا دیکھے تو اس نے دیکھا کہ اس کا کھانا سو برس گزرنے کے بعد بھی جوں کا توں تھا یعنی کھانا بالکل نہ سڑا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ اپنے جن بندوں کے ساتھ جیسے معاملے چاہتا ہے۔ کرتا ہے اور اگر یہ معاملات عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے تو اس سے اُن معاملات کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

یہاں سمجھنے کی بات دراصل یہ ہے کہ ہم امتی لوگ جب نبیوں کی امت ہونے کے باعث اپنے اپنے نبی کے اسوہ حسنہ پر چلتے ہیں تو جو خلافِ معمول اور خلافِ عقل باتیں انبیاء علیہ السلام کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ وہ تو نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہیں اور معجزات کہلاتی ہیں۔ لیکن جو باتیں ان کے امتیوں کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہیں، وہ کرامات کہلاتی ہیں اور معجزات کی طرح کرامات بھی علیحدہ علیحدہ ہوتی ہیں اور صرف وہی کرامت کسی ولی اللہ بزرگ کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جسے اللہ چاہے اور یہ بات تمام تر اللہ تعالےٰ کے فضل پر منحصر ہے اللہ اپنے جس بندہ پر جتنا فضل کرنا چاہتا ہے۔ کرتا ہے وہاں کسی شخص کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ اپنی محدود عقل کا سہارا لے کر کسی قسم کا اعتراض کر سکے کہ یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا اور جس طرح معجزات عام لوگوں کے فہم و ادراک سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اسی طرح کرامات بھی سب لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے

نہیں آتیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں۔ جو ان کرامات کو جھٹلاتے ہیں اور ان پر اعتراضات بھی کرتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کو قرآنِ مجید اور حکمت دونوں سکھاتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ قرآن کو اور اس کی حکمتوں کو سیکھنے کیلئے حضور کی بطور معلم شرط لازم ہے اور اس کے بغیر قرآنِ پاک سیکھا اور سمجھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کیپٹن عثمانی صاحب اگر اپنے استاد مولانا بنوری صاحب کی نفی کریں گے۔ اور انہیں اپنی فکر کے مطابق جھٹلائیں گے تو ان کا معاملہ تسلّی بخش طور پر کیسے حل ہو سکے گا۔

اب ہم اس بارے میں تحقیق کرتے ہیں کہ کیا حضرت ابراہیم ادہم نے ہرن کی بات بیان کر کے دروغ گوئی سے کام تو نہیں لیا۔ ہم سب اتفاق کریں گے کہ جب بھی کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس وقت اس کے سامنے کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جسے وہ جھوٹ کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور جتنا بڑا مقصد ہو گا۔ اتنا ہی بڑا جھوٹ بولنے کیلئے وہ شخص آمادہ ہو گا۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ پہلے زمانوں میں لوگ نسبتاً کم جھوٹ بولا کرتے تھے اور وہ بہتر اخلاقی قدروں کے حامل ہوتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی اور مادی وسائل بتدریج کم ہوتے گئے۔ لوگوں نے اپنے مقاصد کے حصول کیلئے جھوٹ کا زیادہ سے زیادہ سہارا لینا شروع کر دیا اور آج جس دَور میں ہم رہ رہے ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ بات بات پر جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور جھوٹ بولنا اس حد تک عام ہو گیا ہے کہ لوگوں کا آپس میں اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ اور وہ ہر بات پر چاہے وہ سچی ہو یا جھوٹی وسوسہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اب ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم نے کون سے وہ دنیاوی یا دینی مقاصد تھے۔ جن کے حصول کی خاطر یہ ہرن کے متعلق جھوٹ بولا۔ حقیقتِ حال اس بارے میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ادہم کو اس وقت دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ ان کے پاس تخت و

تاج تھا. حکومت تھی. شہرت تھی. دنیاوی جاہ و جلال تھا. اس لئے وہ دنیا کی تقریباً ہر ضروری چیز باآسانی حاصل کر رہے تھے. اس لئے اس مادی دنیا کے کسی مقصد کے حصول کے لئے انہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت نہ تھی اور اگر جھوٹ بولنے کی کوئی دنیاوی وجہ نہ تھی تو کیا وہ کوئی دینی مقصد حاصل کرنے کے لئے جھوٹ بول رہے تھے اور کیا جھوٹ سے کوئی دینی مقصد حاصل ہو سکتا ہے. اس بادشاہِ وقت کا اس وقت یہ حال تھا کہ جب ہرن نے ان کو عربی زبان میں تنبیہہ کی تو انہوں نے ہرن کو محض ہرن نہ سمجھا. بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس ہرن کے ذریعہ اللہ انہیں تنبیہہ کر رہا ہے فوراً اپنے اللہ سے توبہ کرتے ہیں.

اس کے بعد عثمانی صاحب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم ادہم نے یہ صحرا نوردی کیوں کی اور جنگل میں ہر میل طے کرنے پر چار سو رکعات نماز ادا کیوں کی. سورہ جمعہ میں ارشادِ ربانی ہے کہ لوگو تم نماز پڑھنے کے بعد ساری زمین پر پھیل جایا کرو اور اللہ کے فضل سے تلاش کیا کرو اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا فضل ساری زمین پر محیط ہے. جس میں شہر جنگل بیابان. صحرا اور سمندر سب شامل ہیں. اس لئے اگر کسی شخص کو اللہ کے فضل کی تلاش جنگل و بیابان میں لے جاتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں. کوئی وجہ اعتراض نہیں. جنگلات تو زمین کے خزانوں سے بھرپور ہوتے ہیں اور ان خزانوں کو موجودہ سائنسی دور میں اقتصادی اور مادی ترقی میں بڑا دخل ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ جہاں لوگوں کے جسموں کی پرورش کرتا ہے وہاں روح کی غذا کو بھی مہیا کرتا ہے اور اس جسم و روح کی غذا حاصل کرنے کے لئے بندے کو زمین کے ہر حصہ سے اللہ کا فضل تلاش کرنا چاہیئے. چاہے بندہ جنگل میں جا کر اللہ کی عبادت کرے. یا غارِ حرا میں جا کر عبادت کرے. روح کو غذا دونوں حالتوں میں ملتی ہے اور پھر جو شخص عارضی طور پر جنگلوں میں چلا جاتا ہے. اس نے دنیا کو ہمیشہ

کے لیے ترک نہیں کیا ہوتا۔ اسے تو وہاں بھی دنیا اس لحاظ سے متاثر کر رہی ہوتی ہے۔ کہ وہ اس کی مادی کششوں سے گھبراتا ہے۔ خوف زدہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا کی کشش سے کچھ دیر دور رہ کر اپنا تزکیۂ نفس کرے اور کچھ یکسوئی کے ساتھ اپنے اللہ کو یاد کر لے۔ اس کی عبادت کرے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلقات کچھ استوار کر لے اور اس کے مزید قریب ہونے کی کچھ سعادت حاصل کرے۔ بندہ جس وقت چاہے۔ جہاں چاہے اور جس حالت میں چاہے۔ اپنے اللہ کو یاد کر سکتا ہے۔ اٹھتے۔ بیٹھتے۔ کھاتے پیتے۔ سوتے جاگتے۔ گھر کے اندر یا باہر۔ دفتر میں یا گھر کے غسل خانے میں۔ سفر میں یا مسجد میں۔ دن میں یا رات میں اللہ کو یاد کرنے پر کوئی قید نہیں۔ اب جب ہم حضرت ابراہیم ادہم کی تمام زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دنیا میں گذارا اور جو بھی دنیاوی معاملات انہیں پیش آئے۔ ان کو طے کرتے رہے اور اس طرح انہوں نے دنیا میں رہ کر اللہ کی عبادت کرنے کی شرط اس طرح پوری کی کہ وہ دنیا میں بھی رہے اور اللہ کی عبادت بھی کی اور دنیا کے لوگوں کی اصلاح کے لئے اپنا یہ سبق دے گئے کہ اس مادی دنیا کے تخت و تاج۔ جاہ و حشمت۔ عیش و آرام آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ اس لئے اس دنیا میں اللہ تعالےٰ کی جتنی بھی عبادت کی جائے کم ہے۔ چاہے وہ ہر میل طے کرنے پر چار سو رکعات نماز ہی کیوں نہ ہو۔

سورہ یونس کی آیات کریمہ ۶۲ تا ۶۴ کی تفسیر میں ابنِ کثیر میں درج ہے کہ "ارشادِ باری ہوتا ہے کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے کے بعد پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں چنانچہ جو پرہیزگار ہے۔ خدا کا ولی ہے۔ احوالِ آخرت سے اگر انہیں سابقہ پڑیگا تو ان کو کوئی خوف دامن گیر نہ ہوگا۔ اور نہ دنیا میں کوئی حزن و غم انہیں گھیر لیگا۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو ہر وقت ذکر و فکرِ خداوندی میں دیکھے جاتے ہیں۔ ابنِ عباسؓ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا۔ یا رسول اللہ! اولیاء اللہ کون ہیں؟

تو فرمایا، وہ لوگ کہ جب دیکھو یادِ خدا میں مصروف۔ ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کے بندوں میں ایسے بھی بندے ہیں کہ انبیاء اور شہداء بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔ پوچھا گیا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ ہم بھی ان سے محبت رکھیں گے فرمایا، انبیاء کے لئے بھی قابلِ رشک لوگ وہ ہیں کہ نہ مال کا کوئی تعلق نہ نسب کا کوئی لگاؤ، مگر صرف اللہ کے لئے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ان کے چہرے نورانی ہیں، وہ نور کے منبروں پر ہیں۔ لوگ جہاں خوف سے تھرآ جائیں، وہاں ان پر ذرا بھی آثارِ خوف نہیں" مندرجہ بالا حوالہ جات سے بھی معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مصروف ہوتے ہیں، اس لئے اگر حضرت ابراہیم ادہم نے ہر میل پر چار سو رکعات نماز ادا کی تو اس میں کوئی تعجب و حیرانی کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ پر انبیاءؑ علیہ سلام بھی رشک کرتے ہیں، اس لئے عثمانی صاحب اگر انبیاء علیہ سلام کی سنت پر چلنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیئے کہ وہ بھی اولیاء اللہ پر رشک تو بے شک کریں، لیکن ان پر اعتراض کرنے سے ہر چند گریز کریں کیونکہ اعتراض میں بے ادبی اور سرکشی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ اگر اولیاؑ اللہ کے چہرے نورانی ہیں اور وہ نور کے منبروں پر فائز ہیں تو رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا کیا حال ہوگا۔ کیا وہ سراپا نور نہ ہونگے۔

اب ہم تین ایسی بزرگ ہستیوں کا ذکر کریں گے جو کہ نبی تو نہیں تھیں، لیکن انبیاء علیہ سلام بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت مریم تھیں، جن کے بطن سے حضرت عیسیٰ علیہ سلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ دوسری حضرت حاجرہ تھیں، جنھوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خاطر پانی کی تلاش میں کئی ہزار برس پہلے صفا اور مروا کی پہاڑیوں کے درمیان سعی کی تھی۔ اس لئے اللہ تعالےٰ نے صفا اور مروا کو" اللہ کی نشانیوں" کا درجہ عطا کیا اور رسولِ پاک اور ان کے امتیوں سے بھی حج اور عمرہ کے دوران

یہ سعی کروا کر حضرت حاجرہ کی سنت کو ہمیشہ کیلئے دوام بخشا۔ تیسری اماں حوا ہیں۔ جب ہم منزدلفہ میں حج کے بعد تمام رات اللہ تعالےٰ سے اپنی بخشش کے لئے دعائیں مانگتے ہیں، تو اس وقت ہم حضرت آدم علیہ سلام اور اماں حوّا دونوں کی سنت پر چل رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا عثمانی صاحب کے عقلی استدلال کے مطابق چونکہ حضورؐ صفا مروا میں سعی کے دوران بظاہر حاجرہ کی سنت پر چلے۔ اس لئے حضرت حاجرہ کا روحانی درجہ حضور سے بڑھ گیا۔ لیکن حقیقت اپنی جگہ پر یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سردار الانبیاء ہیں تمام جہانوں کے لئے رحمت ہیں۔ خاتم النبین ہیں اور اللہ تعالےٰ کے بعد بزرگ ترین ہیں کوئی آپ کا نہ ہمسر ہے نہ ثانی ہے۔ اس لئے جب حضورؐ صفا و مروا کی سعی کرتے ہیں، تو یہ معاملہ اللہ تعالےٰ کی حکمت ہے۔ جو ہر کس و ناکس کو سمجھ نہیں آسکتا۔ خدا جو چاہتا ہے جب چاہتا ہے۔ جس کے ساتھ چاہتا ہے اور جس انداز میں چاہتا ہے کرتا ہے ہم کون ہیں کہ اس پر اعتراض کریں۔ ہم جس وقت اللہ تعالےٰ کو سجدہ کرتے ہیں تو اسکا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اے اللہ! ہم تیرے ہر حکم اور ہر فیصلے کے آگے کلّی طور پر جھکتے ہیں اور تیرے آگے ہم اپنے تمام ہتھیار ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد عثمانی صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس ساری مدت میں بغیر کسی سبب کے رزق مہیا ہونا عجیب بات ہے۔ دراصل ہر معجزہ اور ہر کرامت عام آدمی کے لئے بہت عجیب ہوتا ہے کیونکہ اس کی فکر معجزہ یا کرامت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ سلام کی قوم پر جب آسمانوں سے من وسلویٰ اترا کرتا تھا۔ تو بظاہر وہ بھی بغیر کسی سبب کے ہوتا تھا اور آج بھی سننے والے کو یہ واقعہ نہایت عجیب لگتا ہے۔ لیکن عجیب لگنے سے اس واقعہ کی حقیقت جوں کی توں برقرار رہتی ہے یہ جو ہم نے لکھا ہے کہ من وسلویٰ بغیر کسی سبب کے اترتا تھا۔ یہ ہم نے محض عثمانی صاحب کا اندازِ فکر اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں سے من وسلوا کا

طعام اترنے کا پہلا سبب یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ سلام کی قوم کو بھوک لگی تھی.
دوسرا سبب یہ تھا کہ قوم نے موسیٰ علیہ سلام سے اس طعام کو حاصل کرنے کا تقاضا کیا
تھا. تیسرا سبب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ سلام نے اپنی قوم کی خاطر تمام جہانوں کے پالنے
والے سے اس طعام کی دعا کی تھی، جو کہ اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور چوتھا سبب یہ ہے
کہ اللہ نے موسیٰ علیہ سلام کی دعا کو اس لیے شرفِ قبولیت بخشا کہ اللہ تعالیٰ قادر
مطلق ہے. اپنے جس بندے کی جس دعا کو چاہتا ہے قبول کر لیتا ہے. اسی طرح کی
ایک عجیب بات اور بھی ہے کہ جب تک بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے. ماں کی چھاتیوں
میں دودھ نہیں آتا. لیکن جونہی بچہ جنم لیتا ہے اس کی خوراک کے لئے دودھ پیدا ہونا شروع
ہو جاتا ہے. حالانکہ بظاہر ماں تو وہی ہے. اس کے جسم کا نظام بھی بظاہر وہی ہوتا ہے
اور خوراک بھی وہی ہوتی ہے، جو کہ بچہ کے جننے سے پہلے ہوتی ہے. لیکن عثمانی صاحب کی
فکر کے مطابق بچے کا یہ رزق بغیر کسی سبب کے ماں کی چھاتیوں میں دودھ کی صورت میں
نمودار ہوتا ہے. اس طرح حضرت ابراہیم ادہم کو جنگل میں رزق ملنا سمجھ میں آتا ہے. یہ
رزق جسم کا بھی ہے اور روح کا بھی.

پھر عثمانی صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ چونکہ سارے محدثین اور مفسرین کا
اجماع ہے کہ خضر علیہ سلام وفات پا چکے ہیں. ان سے (ابراہیم ادہم کی) ملاقات اور
بیعت کیسی اور وہ کونسا اللہ کا نام ہے. جس کے سیکھنے سے حضرت ادہم کا دل ماسوا
اللہ سے فارغ ہو گیا. یہ مانا کہ جس بات پر محدثین اور مفسرین کا اجماع ہو جائے. وہ بات
ہمیں صحیح اور زیادہ وزنی معلوم ہونے لگتی ہے. لیکن کیا ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے
ہیں کہ ہر ایسا اجماع حقیقت پر ہی مبنی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو بھی ضرور صحیح ثابت
ہوگا. کیا ہمارے واجب الاحترام محدثین اور مفسرین اللہ تعالیٰ کے معاملات اور حکمتوں
کا موسیٰ علیہ سلام سے زیادہ صحیح علم رکھتے ہیں. موسیٰ علیہ سلام اور خضر علیہ سلام کے واقعہ

قرآن سے تو صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے معاملات کی حکمتوں کو انسان پا لینے سے عاجز و قاصر ہے اور اگر یہ بات ایسے نہ ہوتی تو حضرت موسیٰ علیہ سلام حضرت خضر علیہ سلام پر بار بار یوں اعتراض نہ کرتے اور پھر حضرت ابراہیم ادہم کے حوالہ سے صرف اتنا لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے خضرؑ کی زیارت کی۔ یہ نہیں لکھا کہ یہ زیارت بحالتِ بیداری ہوئی یا خواب کی حالت میں اور زیارت بحالتِ خواب بھی اسی طرح معتبر اور سچی ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ سلام کو حضرت اسماعیل علیہ سلام کی قربانی دینے کا صرف خواب ہی آیا تھا لیکن یہ خواب اس حد تک سچا اور حقیقت پر مبنی تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ سلام نے اپنے بیٹے کی قربانی بھی پیش کی۔ قرآن میں اس خواب کا ذکر بھی ہزاروں برس گزر جانے کے باوجود آیا اور ہم مسلمان اس خواب پر مبنی واقعہ کی یاد ہزاروں برس سے آج تک پورے اہتمام و عقیدت سے منا رہے ہیں۔ اس کے بعد کیپٹن عثمانی صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ وہ کونسا اللہ کا نام تھا۔ جس کو سیکھنے سے حضرت ابراہیم ادہم کا دل ماسوا اللہ سے فارغ ہو گیا۔ عثمانی صاحب غالباً یہ سمجھ رہے ہیں کہ خضر علیہ سلام نے ابراہیم ادہم کو اللہ کا کوئی ایسا نام سکھایا جو باقی تمام لوگوں سے تو مخفی ہے جسے اب صرف ابراہیم ادہم ہی جانتے ہیں۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کیونکہ ابراہیم ادہم کے حوالہ سے تو لکھا ہے کہ انہوں نے خضرؑ سے اللہ کا نام سیکھا۔ اللہ کا نام تو بہر حال اللہ ہی ہے لیکن اس نام کو سکھانے والا خضرؑ ہیں اور یہ بات واضح طور پر یوں نمایاں ہوتی ہے کہ ایک خوش قسمت شخص قرآنِ پاک کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے اور پھر اسی قرآن کو کوئی دوسرا شخص کسی عام آدمی سے سیکھے۔ تو قرآن کے ان دونوں سیکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اگرچہ بظاہر دونوں حالتوں میں سیکھا تو قرآن ہی گیا ہے۔

عثمانی صاحب نے خضر علیہ سلام کی موت کو ثابت کرنے کے لئے محدّثین کا سہارا تو لیا ہے اور ان کی بات کو سند مانا ہے۔ لیکن عثمانی صاحب ایک محدّث یعنی شاہ ولی اللہ

پر اعتراض بھی کرتے ہیں اور وہ یہ اعتراض حضرت بایزید بسطامیؒ پر اعتراض کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ "حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کردہ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ کچھ ایسے بزرگ بھی ہوتے ہیں، جو رسول اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ تربیت حاصل کرکے خدائی صفات سے متصف ہو جاتے ہیں اور مارنا اور جلانا ان کے قبضہ اختیار میں آ جاتا ہے کیونکہ یہ تو اللہ ہی کے کام ہیں۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالےٰ توحید کے انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتا ہے کہ ان کے سامنے یہ اعلان کیجئے کہ آپ صرف اس مالک کی بندگی کرتے ہیں، جو اکیلا ہی تم کو موت دیتا ہے۔ گویا یہ انکاری بھی اس بات کے قائل تھے کہ مارنا اور جلانا تو صرف ایک آسمان والے ہی کے ہاتھ میں ہے۔ آیت یوں ہے۔ پس میں بندگی نہیں کرتا۔ ان کی بندگی اللہ کو چھوڑ کر تم کرتے ہو۔ بلکہ میں تو صرف اس اللہ کی بندگی کرتا ہوں، جو تم کو موت دیتا ہے سورہ یونس ۱۰۴"
عثمانی صاحب کو یہ وسوسہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث کو سورہ یونس کی مندرجہ بالا آیتِ مبارکہ کا علم یا تو سرے سے تھا ہی نہیں اور اگر علم تھا تو اس آیت پر ان کا ایمان نہ تھا۔ ایسی سوچ و فکر کے مالک تو عثمانی صاحب ہی ہو سکتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ حضرت بایزید بسطامی، حضرت شاہ ولی اللہ اور باقی تمام مسلمان صرف اسی اللہ کی بندگی کرتے ہیں جس کی کہ اس آیت مبارکہ میں نشاندہی کی گئی ہے اور جس کی بندگی رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں۔ وہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کی بندگی نہیں کرتے۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ سلام مردوں کو زندہ نہیں کیا کرتے تھے۔ کیا وہ مٹی کے پرندے بنا کر ان میں جان نہیں ڈالا کرتے تھے اور اگر وہ ایسا کیا کرتے تھے۔ تو کیا وہ بقول عثمانی صاحب اللہ بن بیٹھے تھے۔ عیسیٰ علیہ سلام نے تو کبھی ایسا دعویٰ نہ کیا۔ حقیقت صرف یہ ہے کہ نہ حضرت عیسیٰ علیہ سلام کبھی اللہ بنے تھے اور نہ ہی کوئی اور۔ البتہ یہ بات ضرور تھی کہ ان سب کو یہ قدرت۔ یہ معجزہ اور یہ کرامت سب اللہ تعالیٰ

ہی کی طرف سے عطا کردہ تھی، اس لئے جو لوگ اولیاء اللہ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں، وہ صرف اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ان بزرگوں میں اللہ تعالےٰ کی قدرت و صفات کا پرتو دیکھتے ہیں اور یہ اولیاء اللہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اگر ہم حضرت داتا گنج بخشؒ علی ہجویری کے روضہ پر حاضری دینے والے لوگوں کے اعداد و شمار کو اکٹھا کریں تو یہ تعداد آج تک کروڑوں تک پہنچ جائے گی۔ داتا صاحب کے سبب ان کروڑوں مسلمانوں کی اپنے دین کے ساتھ وابستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں اپنے دین کا اعتماد پیدا ہوا ہے اور انہوں نے راہِ ہدایت پائی ہے اور اس لحاظ سے بھی ان اولیاء کرام کی بزرگی و عظمت کی واضح طور پر نشاندہی ہوتی ہے۔ محدثین اور مفسرین کا دین میں اپنا مقام ہے۔ لیکن ان سے اولیاء اللہ کی اور اولیاء اللہ کے مقام کی نفی نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابراہیم ادہم نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ مشاہدہ کیا۔ وہ ان کے لئے براہِ راست علمِ الٰہی کا حصہ بنا۔ جو انہوں نے ہماری راہنمائی و ہدایت کے لئے بیان فرما دیا۔

کیپٹن عثمانی صاحب نے مولانا اشرف علی صاحبؒ کی کتاب "امداد المشتاق" جس میں حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے ملفوظات درج ہیں، پر بھی اعتراض کیا ہے اور اسی طرح عثمانی صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی کتاب "انیس الارواح" پر یوں اعتراض کیا ہے کہ "اس عظیم الشان واقعہ سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم ادہم اور رابعہ بصریؒ جیسے بزرگ کس عظیم الشان بڑائی کے مالک تھے۔ وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ خواجہ ابراہیم ادہم کو بھی موسیٰ علیہ سلام کی طرح ندائے غیب سے نوازا گیا اور کیوں نہ ایسا کیا جاتا جبکہ چودہ سال میں ہر ہر قدم پر دو رکعت نفل شکرانہ پڑھتے ہوئے خانہ کعبہ تک پہنچے تھے پھر خانہ کعبہ کا وہاں موجود نہ ہونا اور آواز کا آنا کہ خانہ کعبہ جنگل میں ایک ضعیفہ کی زیارت کو گیا ہے۔ ابھی آیا چاہتا ہے۔ صبر کرو۔ پھر آپ کا خانہ کعبہ کی تلاش میں جنگل میں جا دیکھنا کہ خانہ کعبہ رابعہ بصری کو پکار کر کہنا کہ یہ شور تم نے ڈال رکھا ہے۔ اس کے جواب میں

رابعہ بصری کی ان پر فضیلت اور غیب دانی کہ ابراہیم ادہم کی ۱۴ برس کی ریاضت اور انجام کا۔ ان کی ناکامی کا راز اسی وقت فاش فرما دیا۔ ہاں یہ بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ خواتین کا اکیلے جنگل میں کیا کام اور یہ کہ کیا یہ ولیہ پردہ نہیں کرتی تھیں؟ چاہے اسکا جواب میرے پاس ہو۔ مگر اس واقعہ سے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ ایک جامد چیز نہیں ہے۔ یہ اور بات کہ کسی اپنی مصلحت کی بنا پر وہ صلح حدیبیہ کے موقع پر چند میل آگے بڑھ کر حدیبیہ تک نہ آیا۔ ورنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو عمرہ سے محروم واپس مدینہ لوٹنا نہ پڑتا۔" افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ عثمانی صاحب کا اندازِ تحریر اس مقام پر شائستہ نہیں رہا۔ بلکہ گر کر گستاخانہ ہو گیا ہے۔ انہیں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ رابعہ بصری ان کی دادی اماں کا درجہ رکھتی ہیں۔ عثمانی صاحب اس ضعیفہ دادی سے کس قسم کا پردہ کروانا چاہتے تھے اور انہیں کس قسم کے جواب کی دھمکی دے رہے ہیں۔ دینی معاملات کی تفصیل میں اختلاف رکھنے کی گنجائش تو ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ آدمی تحمل و بردباری کا دامن چھوڑ دے۔ اس جگہ عثمانی صاحب کا عقلی استدلال یہ ہے کہ خانہ کعبہ جامد ہے۔ متحرک نہیں ہے۔ اس لئے خانہ کعبہ کا رابعہ بصری کی زیارت کیلئے جنگل میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر ایسا ہو سکتا ہوتا تو خانہ کعبہ اپنے جامد مقام سے چند میل آگے بڑھ کر "حدیبیہ" کے مقام پر ضرور جاتا۔ تاکہ نبی کریم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین کے ساتھ بغیر عمرہ کئے واپس نہ لوٹتے۔ کیونکہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام حضرت رابعہ بصری سے کہیں بلند رتبہ پر فائز ہیں اور فضیلت رکھتے ہیں۔ یہ تو ہم سب مانتے ہیں کہ جو اعلیٰ درجہ و فضیلت حضورؐ اور آپ کے صحابہ کو حاصل ہے وہ رابعہ بصری کو حاصل نہیں۔ لیکن اس بنا پر جو عقلی استدلال عثمانی صاحب نے قائم کیا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ بھی صحیح ہو۔ کیونکہ اسی استدلال کے عین مطابق یہ بھی اخذ

کیا جاسکتا ہے کہ چونکہ خانہ کعبہ فضیلت و بزرگی میں زیادہ ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کی جامد کیفیت کو عمرہ کرنے کی غرض سے متحرک نہ کر سکے۔ حالانکہ رسولِ پاکؐ نے لاکھوں میل کی بظاہر دوری سے جسامت میں جامد چاند کو حرکت دے کر دو ٹکڑے تو کر دیا تھا۔ لیکن یہ بات دراصل یوں ہے کہ خانہ کعبہ بھی اللہ کی لاتعداد تخلیقوں میں سے ایک ہے اور اللہ کے اعلان کے مطابق چونکہ انسان ان سب میں سے اشرف المخلوقات ہے۔ اس لئے سرورِ کائناتؐ خانہ کعبہ سے زیادہ افضل و بزرگ ہیں اور توحیدِ خالص بھی یہی ہے کہ ہم سمجھیں کہ خانہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ اللہ نہیں ہے۔ ہم سجدہ خانہ کعبہ کی سمت میں تو ضرور کرتے ہیں۔ لیکن خانہ کعبہ کو نہیں۔ ہم سجدہ تو صرف اللہ جلشانہٗ ہی کو کرتے ہیں۔ اللہ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ بزرگی و فضیلت حاصل ہے تو وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ اس لئے اگر خانہ کعبہ حرکت کر کے حدیبیہ کے مقام پر نہیں جاتا تاکہ حضورؐ عمرہ کر لیں تو یہ معاملہ اللہ کی حکمت کا ہے۔ اس سے نہ تو خانہ کعبہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بزرگی و فضیلت میں بڑھ جاتا ہے اور نہ ہی حضرت رابعہ بصری۔ کیا ہم سب نہیں جانتے کہ جب اللہ تعالےٰ نے موسیٰ علیہ سلام کو صحرائے سینا میں کوہ طور کے قریب ایک درخت کی اوٹ سے پکارا تھا۔ تو جبرائیل علیہ سلام کی بجائے بظاہر اللہ تعالےٰ موسیٰ علیہ سلام کے پاس نبوت عطا کرنے خود پہنچے تھے تو کیا عثمانی صاحب کے استدلال کے مطابق ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں، نعوذ باللہ حضرت جبرائیل علیہ سلام بزرگی و فضیلت میں اس واقعہ کی وجہ سے اللہ کے برابر ہیں اور موسیٰ علیہ سلام اللہ اور جبرائیلؑ دونوں سے بزرگ و افضل ہیں۔ اسی طرح جب موسیٰ علیہ سلام فرعون کو دعوتِ دین کے لئے تمام اہتمام کے ساتھ اللہ نے بھیجے تھے۔ اسوقت موسیٰؑ کا مددگار تو خود اللہ تھا اور دوسری طرف مدِمقابل یا تو اکیلا فرعون تھا۔ یا پھر شیطان ابلیس اس کا مددگار و معاون تھا۔

فرعون کے ساتھ اس مقابلہ میں موسیٰ علیہ سلام بظاہر کامیاب نہ ہوئے. کیونکہ فرعون نے ایمان لانے سے آخر وقت تک انکار کیا اور اپنے کفر پہ ڈٹا رہا. کیا ہم اس واقعہ سے بھی عثمانی صاحب کی فکر کے مطابق یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ موسیٰ علیہ سلام سے فرعون زیادہ طاقتور تھا اور ملعون ابلیس اللہ تعالےٰ سے زیادہ طاقتور ہے. کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے. اور اپنی سرکشی پر اسوقت سے بدستور ڈٹا ہوا ہے. جس دن کہ اللہ تعالےٰ نے اُسے حضرت آدم علیہ سلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا. جیسے کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں. اللہ تعالےٰ کی حکمتوں کو بغیر اللہ کی توفیق و بصیرت کے سمجھا نہیں جا سکتا. کیونکہ محض انسانی عقل اللہ کے معاملات کا ادراک کرنے سے یکسر قاصر و عاجز ہے.

کیپٹن عثمانی صاحب نے اولیائے کرام کے ایک ایک واقعہ کو لے کر اپنی دانست کے مطابق مندرجہ بالا انداز میں بحث کی ہے. اس لئے ہم نے ان کی کتاب کے شروع میں درج اعتراضات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے. تاکہ عثمانی صاحب کے عقل و فکر کی خاطر خواہ طور پر عکاسی ہو سکے. جس کے سہارے انہوں نے یہ تمام کتاب لکھی ہے اور اب ہم عثمانی صاحب کے توحید خالص کے مضمون کو ختم کرنے پر اکتفا کرتے ہیں.

رسولؐ سے ظلم کی بخشش کیلئے دعا منگوانا لازم ہے

اور جو لوگ اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں پر جا کر دعا مانگتے ہیں، تو ان میں سے اکثر کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ وہاں جا کر بھی براہِ راست خدا ہی سے سب کچھ مانگتے ہیں. لیکن جو بزرگ ہستیوں کو زندہ جان کر ان سے سوالی ہوتے ہیں تو ان کا معاملہ اس کے مطابق ہوتا ہے. جیسے کہ ایک سوالی اللہ کے نام پر کسی سے دنیا میں مانگتا ہے اور سورہ بقرہ میں ارشاد ہے کہ بھلائی یہ نہیں ہے کہ تو نماز میں اپنا منہ مغرب یا مشرق کی طرف کرے بلکہ بھلائی یہ ہے کہ تو اللہ پر مکمل ایمان لاتے ہوئے سوالی کو مشرک نہ سمجھتے ہوئے اللہ کی راہ میں اپنا مال دے. اس

طرح اگر کوئی سوالی کو یا فقیر کو یا یتیم کو یا بیوہ کو اس کے مانگنے پر کھانا کھلا دے تو نہ تو کھانا کھلانے والا نعوذ باللہ رازق بن جاتا ہے اور نہ ہی مانگنے والا اسے کسی انداز میں اپنا رازق ماننے کو تیار ہوتا ہے۔ بلکہ مانگنے والا تو اللہ کے نام پر ہی مانگ رہا ہوتا ہے اور اگر مانگنے والا جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پہ جا کر اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش کی خاطر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد مانگتا ہے تو یہ بات تو نہایت احسن ہے اور قرآن پاک میں سورہ مومن کی آیت کے مطابق۔

اس مقام پر غور طلب بات یہ پیدا ہو رہی ہے کہ جو بندہ اپنی جان پر ظلم کر لیتا ہے اس کے لئے اللہ پاک کیوں یہ کافی قرار نہیں دیتا کہ وہ صرف اللہ تعالےٰ ہی سے خود اپنی بخشش کیلئے دعا مانگ لے اس پہ یہ پابندی اللہ جلشانہٗ نے کیوں لگا رکھی ہے کہ وہ حضور رسول کریمؐ کی خدمت میں بھی ضرور حاضر ہو اور ان سے درخواست کر کے انہیں اپنی بخشش کیلئے دعا مانگنے پر آمادہ کرے اور پھر اللہ تبارک وتعالےٰ یہ کیوں یقین دلا رہا ہے کہ جب حضورؐ بھی ایسے بندے کی بخشش کیلئے دعا مانگیں گے تو اللہ پاک مہربان ہو جائے گا اور کیا اگر یہ بندہ صرف خود ہی اللہ سے اپنی بخشش کیلئے دعا مانگنے پر اکتفا کرے اور حضور سے بے نیاز ہوتے ہوئے ان کی طرف رجوع نہ کرے تو پھر کیا اللہ مہربان نہیں ہوگا؟ اور ایسے شخص کی براہِ راست دعا کو شرف قبولیت حاصل نہ ہوگا؟ یہ وہ سوالات ہیں جو کہ اس آیت مبارک کا تجزیہ کرنے سے ایسے لوگوں کیلئے پیدا ہو رہے ہیں جو کہ سختی سے یہ موقف اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ہر دعا براہِ راست اللہ سے مانگنی چاہیئے اور اس کی قبولیت کے لئے درمیان میں کوئی وسیلہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ بعض تو ان میں ایسے بھی ہیں جو کہ حضورؐ کو بطور وسیلہ اپنانے کو شرک گردانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ مندرجہ بالا سوالات کا تسلی بخش جواب ڈھونڈ کر اپنے اپنے ضمیر کو کلی طور پر مطمئن کریں۔

جناب کیپٹن مسعود عثمانی صاحب جہاں انبیا علیہ السلام کو مردہ گردانتے ہیں۔ وہاں وہ ترمذی کی مندرجہ ذیل حدیث کو بھی صحیح جانتے ہوئے اپنے کتابچہ میں بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر جا کر یہ دعا پڑھنے کی تعلیم فرمائی کہ " اے قبروں کے باسیو، تم پر سلامتی ہو۔ اللہ تعالٰے ہمیں بھی معاف فرمائے اور تمہیں بھی۔ تم ہم سے پہلے جا چکے ہو اور ہم تم سے بعد آنے والے ہیں۔ اگر کیپٹن صاحب اس دعا کو جسے پڑھنا وہ حق جانتے ہیں کا تجزیہ کریں تو واضح ہو جائے گا کہ اہلِ قبور کو اس دعا میں ہمکلام ہو کر مخاطب کیا جا رہا ہے اور جس سے ہمکلامی کی جائے وہ زندہ ہوتا ہے مردہ نہیں ہوتا اور اسے السلام وعلیکم کہنا بھی جائز ہوتا ہے۔ شرک نہیں ہوتا۔ لیکن پھر بھی کچھ مسلمان اس ذہن کے بھی مالک ہیں کہ وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام و درود بھیجنا تو جائز مانتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ صرف درودِ ابراہیمی ہی پڑھ کر ان پر بھیجنا چاہیئے مگر جو سلام و درود میلاد کی محفلوں میں ندا کے انداز میں پڑھا جائے۔ وہ اس کے قائل نہیں ہیں اس کی دو وجوہات پیش کرتے ہیں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ سوائے اللہ تعالٰے کے کسی اور کو مخاطب کر کے ندا دینا یا پکارنا شرک ہے اور دوسری وجہ یہ کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا محفل میلاد میں حاضر و ناظر ہونا تسلیم نہیں کرتے۔ مقام شکر ہے کہ یہ مسلمان بھائی کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زندہ تو مانتے ہیں اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم ولادت ہی سے اللہ تعالٰے کی ایک بہت بڑی نعمت مانتے ہیں تو ان کو اپنے طور پر محفل میلاد منانے پر کوئی اعتراض یا تنگی محسوس نہیں ہونی چاہیئے اگر یہ اپنے قول کے سچے ہیں تو پھر یہ محفل میلاد ضرور منعقد کرینگے۔ چاہے یہ ندائی درود وسلام کی بجائے درودِ ابراہیمی ہی کیوں نہ پڑھیں۔

ہو سکتا ہے کہ اس مقام پر کسی بھائی کا ذہن سورۃ البقر کی اس آیت مبارک کی طرف جائے جس میں کہ ارشاد ربانی ہے کہ " اور جب سوال کریں تجھ کو بندے میرے مجھ سے۔ پس تحقیق میں نزدیک ہوں، جواب دیتا ہوں پکارنے والے کا پکارنے والے کو جب پکارتا ہے۔ (۵۵) جو کو ظاہر ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کی بدولت مسلمان یقیناً اللہ پاک سے براہِ راست یعنی بغیر حضور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے دعا مانگ سکتے ہیں، لیکن یہاں یہ شرط لاگو ہے کہ

دعا مانگنے والا شخص واقعی اللہ کا ایسا بندہ ضرور ہو جس نے کہ اپنی جان پر کسی گناہ کے سبب کوئی ظلم نہ کیا ہوا ہو. کیونکہ اگر کسی نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو تو پھر ایسے شخص کیلئے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی بخشش کیلئے نہ صرف اللہ تعالیٰ سے خود ہی دعا مانگے. بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کی بخشش کیلئے رب العزت سے دعا مانگیں تاکہ ایسے شخص کی دعا کے قبول ہونے کے راستے میں جو رکاوٹ اس کے ظلم کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے وسیلہ سے دور ہو جائے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی اپنے عاجز و گناہگار بندوں پر خاص عنایت ہے کہ اس نے ان کی خطاؤں کو معاف کرنے کیلئے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت کی درخواست کرنے کا حق آپ کی امت کے ہر فرد کو دے رکھا ہے. اس لحاظ سے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زندہ ہونا ثابت ہوتا ہے. یہاں یہ بات اب واضح ہونی چاہیئے. کہ اللہ تعالےٰ صرف ایسے لوگوں کو کافر و مشرک کہتا ہے جو کہ سوائے اللہ کے یعنی اللہ کی نفی کرتے ہوئے اور اس کے وجود کا انکار کرتے ہوئے غیر اللہ سے اپنی حاجت روائی کیلئے مدد مانگتے ہیں اور انہیں پکارتے ہیں. لیکن جو مسلمان ہیں. وہ سب یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ واحد ہے. اس کا کوئی شریک نہیں. حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور جو کچھ بزرگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء اللہ کی ہے. وہ تمام تر اللہ تعالےٰ ہی کی عطا کی ہوئی ہے. اس لئے جو امتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر سوالی بن کر جاتا ہے. وہ دراصل اپنے اللہ تبارک و تعالیٰ ہی سے مانگ رہا ہوتا ہے. عملاً اور نیتاً دونوں لحاظ سے. درودِ ابراہیمی کی فضیلت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے. جبکہ خود اللہ تبارک و تعالےٰ اور جناب رسول کریمؐ اس درود و سلام کا حوالہ دے رہے ہوں جو کہ اللہ پاک نے حضرت ابراہیمؑ کے لئے مخصوص کیا. اس میں شک نہیں کہ درود نہایت اعلےٰ و مثالی ہے. لیکن یہاں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس درود کی وجہ سے دوسرے درود و سلام کی نفی نہیں ہوتی. اللہ پاک نے کسی جگہ یہ پابندی نہیں لگائی کہ حضورؐ پر کونسا درود و سلام بھیجا جائے اور کونسا نہ بھیجا جائے اس کی واضح ہدایت صرف اتنی ہے کہ اس کے رسولؐ پر ان کے امتی بھی درود و سلام بھیجیں. یہاں تک کہ اللہ جو اپنا درود حضور صلی اللہ

علیہ وسلم پر جو درود بھیجتا ہے اس کے متعلق بھی کچھ نہیں بتاتا اور یہ سارے اشارے اس بات
کی دلیل ہیں کہ پابندی صرف یہ لگائی گئی ہے کہ رسول پاک پر درود وسلام ضرور بھیجا جائے
لیکن یہ پابندی کوئی نہیں ہے کہ کونسا درود وسلام بھیجا جائے۔ درود وسلام بہرحال درود
سلام ہی ہے اور اس کی اپنی مخصوص افادیت ہے۔ اس لئے جو لوگ ندائی درود پر معترض
ہیں۔ ان کی خدمت میں عرض ہے کہ جو سلام و درود محفل میلاد میں پڑھا جاتا ہے۔ وہ ہوتا
ہے۔ "یا نبی سلام علیک" اگر آپ اس کا عربی زبان میں ترجمہ کریں گے تو اَلسَّلامُ عَلَیکَ
اَیُّھَا النَّبِیُّ ہ کے سوا اور کچھ نہ ہوگا جو کہ آپ حضرات دن میں پانچوں نمازوں میں بار بار
"التحیات" میں پڑھتے ہیں۔ اس لئے اگر آپ نماز میں "یا نبی سلام علیک" کو بار بار پڑھ
کر مشرک قرار نہیں پاتے تو یقین رکھیں کہ محفلِ میلاد میں اسی درود وسلام کو جو لوگ
پڑھتے ہیں، وہ مشرک نہیں ہو جاتے۔ پھر آپ کے علم میں یہ بھی ہونا چاہیئے کہ جس کو آپ
زندہ سمجھتے ہیں، ان کو آپ روزمرہ کی زندگی میں مخاطب کرتے ہیں، ندا دیتے ہیں۔ لیکن شرک
کرنے کا خوف آپ پر طاری نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض دفعہ تو آپ اپنے مسلمان عزیز یا دوست کو جو
کہ حاضر و ناظر ہونے کی بجائے کہیں دور دراز ملکوں میں قیام پذیر ہوتا ہے۔ اس کو بھی بے
خوف و خطر السلام علیکم کر کے مخاطب کرتے ہیں اور آپ بھی مشرک نہیں بنتے۔ اگر آپ کا
یہ سلام و پیغام ایک خط کے وسیلہ سے آپ کے اس عزیز کو پہنچ سکتا ہے تو کیا جو درود
وسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بھیجا جاتا ہے وہ اللہ تعالےٰ اور اس کے
فرشتوں کے وسیلہ سے ان تک نہیں پہنچ سکتا اور پھر کیا کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ
آخر یہ درود وسلام ہے کیا جو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجتے ہیں۔ ہم اللہ تعالےٰ کے
حضور میں جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر یہ دعا مانگتے ہیں کہ اللہ تو جناب نبی کریم پر
اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل کر۔ ہم اپنی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں دیتے اور ہم
ان کو اپنے تئیں کچھ عطا کرنے کی کیا صلاحیت رکھتے ہیں جو اتنا شور و غوغا کرتے ہیں کہ ہم ان پر

یہ بھیجیں گے اور وہ نہیں بھیجیں گے۔ جس وقت جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجا جاتا ہے۔ چاہے وہ ندائی ہو یا اور کوئی دوسرا یا ابراہیمی وہ ایک دعا کی حیثیت میں پہلے اللہ پاک کے حضور پہنچتا ہے۔ جہاں اسے شرف قبولیت عطا ہوتا ہے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں اس درود وسلام کے صدقے میں نازل ہوتی ہیں اور جناب رسول کریم اس سلام و درود سے اس قدر خوشی محسوس کرتے ہیں کہ اس کا اظہار بیان ممکن نہیں۔

مشاہدہ کرنے والے خوش نصیب مسلمان تو یہاں تک بیان کرتے ہیں کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک پر جاکر سلام و درود پڑھا جاتا ہے تو آپ انتہائی خوشی کی حالت میں قہقہہ لگاتے ہوئے اٹھکر بیٹھ بھی جاتے ہیں۔ قبر غائب ہو جاتی ہے اور سلام و درود بھیجنے والے سے آپ نہایت شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں اور یہ سب کچھ اللہ کے عاجز و مسکین بندے کیلئے اس کی نعمتیں ہوتی ہیں، جن کا کہ بیان کرنا بندہ اپنے اوپر حکم خداوندی کے تحت واجب و لازم سمجھتا ہے۔ البتہ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس قسم کے مشاہدات کو کوئی کم بصیرت انسان سن لے تو ان پر اپنے شک و شبہات کی وجہ سے یقین نہ کرے۔ ایسا شخص روحانیت کے میدان میں قدم رکھنے کا دم تو بھرے۔ لیکن اسے موجودہ دور کے جھوٹ سے بھرپور سیاست کے اکھاڑہ سے زیادہ اہمیت نہ دے اور اس وجہ سے یہ سمجھنے سے بالکل قاصر رہے کہ اللہ کے مخلص نیک بندے کیلئے کسی کے ساتھ جھوٹ بولنا اور پھر دین جیسے اہم ترین معاملہ میں جس کا براہِ راست تعلق قادرِ مطلق کی ذات سے ہے۔ کسی قسم کا کسی پہلو سے دھوکا دینا قطعاً ناممکن ہے۔ اس کیلئے دین کی پابندیوں کے تحت اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ صرف اور صرف حق بات ہی کہے۔

پاکستان میں مسلمانوں کے عقیدت مند شاہ ولی اللہ کی آنکھوں سے دیکھیں

اس خاص طبقہ کی طرف اب رجوع مقصود ہے جو کہ بظاہر حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دینی خدمات سے بے حد متاثر دکھائی دیتا ہے اور انہیں اپنا دینی راہنما مانتے ہوئے ان سے ضروری عقیدت بھی رکھتا ہے۔ لیکن انبیاء کو اپنی قبور میں زندہ ماننے سے گریز بھی کرتا ہے۔ اندریں حالات مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی طرف بھی تھوڑا سا رجوع خصوصیت کے ساتھ کیا جائے تاکہ اس معاملہ میں ان کا موقف معلوم کیا جا سکے۔ شاہ صاحب اپنی کتاب "فیوض الحرمین (مترجم اردو)" کے صفحہ ۸۱ پر بعنوان "مشاہدہ جمالی۔ انبیاء کرام اپنی قبور میں زندہ ہیں" کے تحت ارشاد فرماتے ہیں کہ "جس وقت میں مدینہ منورہ میں حاضر ہوا اور روضۂ اقدس علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و الف الف تسلیم کی زیارت سے مشرف ہوا تو میں نے روح مبارک و مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہراً اور عیاناً دیکھا نہ صرف عالم ارواح میں بلکہ عالم مثال میں ان آنکھوں سے قریب۔ تو میں سمجھ گیا کہ یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں حاضر ہوتے ہیں اور لوگوں کی امامت فرماتے ہیں۔ وغیر ذلک کہ یہ سب اسی دقیقہ کی باتیں ہیں۔ اسی طرح اکثر لوگ کوئی بات زبان پر نہیں لاتے۔ مگر جو اُن کی ارواح پہ کسی علم کی وجہ سے مترشح ہو تو یہ چیز حقیقتاً ہو یا اس کی صورت بھر۔ اسے ایک بیان کرتا ہے اور دوسرا اس چیز کو جسے اجمالی طور پر معلوم کیا قبول کر لیتا ہے اور تیسرا سنتا ہے تو وہ اس کی اور وجہ سے تائید کرتا ہے اور چوتھا سنتا ہے تو وہ اس کے مناسب ایک اور صورت بیان کر دیتا ہے اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں کی جماعت اس پر متفق ہو جاتی ہے اور ان کا اتفاق ایسے معاملات میں مہمل نہیں ہے۔ لہٰذا تو ان مشہورات عوام کی تحقیر نہ کر۔ مگر تو اس میں ان اسرار کو سمجھ جنہیں وہ بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر میں روضۂ عالیہ مقدسہ کی طرف چند بار متوجہ ہوا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لطافت میں لطافت کے بعد ظہور فرمایا۔ گاہے تو بصورت عظمت اور ہیبت جلوہ افروز ہوئے اور کبھی جذب و محبت اور انسیت و انشراح کی شکل میں ظاہر اور کبھی سریان کی شکل میں حتیٰ کہ میں نے خیال کیا کہ تمام

فضا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے لبریز ہے اور روح اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تیز ہوا کی طرح موجیں مار رہی ہے۔ حتیٰ کہ دیکھنے والے کو موجیں ملاحظہ اقدس کی طرف نظر کرنے سے روک رہی تھیں اور میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اصلی صورت کریمہ میں بار بار دیکھا۔ باوجود یہ کہ میری تمنا اور آرزو تھی کہ روحانیت میں دیکھوں نہ کہ جسمانیت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں تو میری یہ بات سمجھ میں آئی کہ آپ کا خاصہ ہے۔ روح کو صورت جسم صلی اللہ علیہ وسلم میں کرنا اور یہی وہ بات ہے کہ جس کی طرف آپ نے اپنے قولِ مبارک سے اشارہ فرمایا ہے۔ کہ ابنیاء کرام علیہم السلام کو موت نہیں آیا کرتی۔ وہ اپنی قبروں میں نمازیں پڑھا کرتے اور حج کیا کرتے ہیں اور وہ زندہ ہوا کرتے ہیں اور جس وقت بھی میں نے آپ پر سلام بھیجا تو آپ مجھ سے خوش ہوئے اور انشراح فرمایا اور ظہور فرمایا اور یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپ رحمت اللعالمین ہیں"

شاہ ولی اللہ صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جب تک آپ نے بذاتِ خود حضورؐ کے روضۂ اقدس پر یہ مشاہدہ نہ کیا کہ حضور رسالت مآب زندہ ہیں۔ اس وقت تک آپ اسرار الٰہیہ سے روشناس نہ ہو سکے اور اپنی علمی بساط پر یہ معلوم کرنے سے عاجز رہے کہ کیا واقعی انبیاءؑ علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں۔ لیکن مشاہدہ ہو جانے کے بعد آپ پر یہ حقیقت واشگاف ہو گئی اور اس مشاہدہ کے ذریعے چونکہ اللہ اپنے غیب کے راز و حقیقت کو اپنے خاص مقبول بندے پر کھولتا ہے مشاہدہ سے سرفراز ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں یہ تو تمام تر اللہ کا فضل ہوتا ہے۔ جو کہ اللہ اپنے جس بندے پر جتنا اور جب چاہتا ہے، کرتا ہے،

ایک صاحب نے سرگودھا ٹیکسٹائل ملز سے اپنے خط میں کتاب کے اس متن پر کچھ اعتراضات کئے ہیں اور نجی طور پر ان کی وضاحت طلب کی ہے۔ چونکہ ہو سکتا ہے کہ ان سے ملتے جلتے اعتراضات کسی اور شخص کے ذہن میں بھی پیدا ہوں۔ اس لئے ان کی وضاحت کو کتاب

میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا ہے۔ سرگودھا سے ان صاحب نے لکھا ہے کہ مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۹۱ پر بعنوان "عقیدتمند شاہ ولی اللہ کی آنکھوں سے دیکھیں" اگر یہی واقعہ درست ہے تو خیال پیدا ہوتا ہے کہ جنگِ جمل، صفین، نہروان وغیرہ میں کیوں خون خرابہ ہوا، ناموس صحابہؓ کیوں شہید ہوئے۔ جنگ میں ایک طرف اگر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ تھیں تو دوسری طرف حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ تھے یہ وہ بزرگانِ دین ہیں کہ تمام دنیا کے مسلمان اگر ولی بن جائیں تو ایک صحابی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کیا وجہ ہے کہ ان بزرگوں کو مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے حضور نبی کریم کے روضہ سے استفادہ حاصل نہ ہو سکا۔ مختصر یہ کہ اگر ایسا ہوتا تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ جنگیں ہوتیں۔ نبی کریم ان صحابہؓ کو ضرور اس کا حل بتا دیتے اور راہنمائی فرماتے۔"

ان صاحب سے جواباً عرض ہے کہ آپ نے مندرجہ بالا اعتراض تو ضرور اٹھایا ہے لیکن آپ کے اعتراض سے محسوس یوں ہوتا ہے کہ آپ نے کتاب کو مناسب غور اور توجہ سے نہیں پڑھا کیونکہ اگر آپ نے اسے بغور پڑھا ہوتا تو آپ پہلے اپنے تئیں یہ فیصلہ کرتے کہ آپ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے عقیدت مندوں میں سے ہیں یا نہیں۔ میں نے اس حصہ میں صرف شاہ صاحب کے عقیدتمندوں کو مخاطب کیا ہے۔ دوسروں کو نہیں اور اگر آپ شاہ صاحب کے عقیدتمندوں میں سے ہوتے تو پھر آپ صرف دو میں سے ایک ہی راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ ایک یہ کہ یا تو آپ اُس تحریر کو جو کہ میں نے اپنی کتاب میں شاہ ولی اللہ صاحب سے منسوب کر کے درج کی ہے اس کو غلط ثابت کرتے یا یہ کہ اسے درست مانتے ہوئے مجھ پر اعتراض نہ کرتے۔ کیونکہ عقیدتمندی کا شیوہ اعتراض کرنا نہیں ہوتا اور اگر آپ بہر صورت اعتراض کرنا ہی چاہتے تھے تو شاہ ولی اللہ صاحب پر کرتے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نے تو ان کے حوالہ سے ضمناً محض ایک خاص طبقہ کو دعوتِ فکر دی ہے جو کہ ان کے عقیدت مند ہونے کا دم بھرتا ہے۔ لیکن آپ کے اعتراض سے [illegible]

واضح ہو رہا ہے کہ آپ شاہ ولی اللہ صاحب کے عقیدت مندوں میں سے نہیں ہیں ورنہ آپ کے پاس اس اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی اور اگر آپ واقعی شاہ صاحب کے عقیدت مندوں میں سے نہیں ہیں تو پھر جس متن پر آپ معترض ہیں، اس میں آپ سے خطاب نہیں ہے۔ میں نے اپنے طور پر جو کچھ بھی انبیاء علیہ سلام کے قبروں میں زندہ ہونے کے متعلق لکھا ہے۔ اس کے حق میں میں نے متعدد آیاتِ قرآنی کا سہارا لیا ہے اسلئے اگر آپ واقعی مجھے غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اُن تمام آیاتِ قرآنی کے معنی و تشریح کو جو کہ میں نے اس ضمن میں کی ہے۔ قرآن ہی کی رو سے غلط ثابت کرنا ہوگا۔ میں نے اس موضوع پر کم و بیش بیس صفحات سپردِ قلم کئے ہیں، جن میں سے بمشکل چار صفحات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب سے متعلقہ ہیں، باقی تمام کے تمام قرآن پاک کی آیات۔ ان کے معنی اور تشریح پر مشتمل ہیں۔

آپ نے محض عقلی استدلال کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر رسول پاکؐ واقعی اپنی قبر میں زندہ ہیں تو پھر ہمارے جلیل القدر اصحابہ کرامؓ نے ان سے کیوں نہ استفادہ کیا۔ تو جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جو لوگ اس کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ہم ان کو مردہ نہ کہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے نزدیک (یعنی اللہ کے حساب میں) زندہ ہوتے ہیں۔ لیکن ہم لوگ اس بات کا شعور نہیں رکھتے۔ یعنی ہم دنیا والے نہ ان کو زندہ حالت میں دیکھ سکتے ہیں نہ ان کو سُن سکتے ہیں اور نہ ہی ان کو چھو سکتے ہیں۔ یعنی ہم ان کے زندہ ہونے کا ادراک نہیں کر سکتے اور اس کے ثبوت میں آپ ہی کے استدلال سے عرض کرتا ہوں کہ میدانِ بدر میں کتنے نامور اصحابیؓ شہید ہو کر مدفون ہیں اور ہم سب کا بمعہ آپ کے ایمان ہے کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں۔ لیکن آپ مجھے بتائیں کہ آج تک آپ نے یا ہمارے عوام میں سے کسی اور نے ان میں سے کسی ایک سے کبھی کوئی گفتگو کی ہو۔ تیسرا سوال آپ نے پوچھا ہے کہ یہ خون خرابہ پھر کیوں ہوا تو اس کا جواب

یہ ہے کہ آپ کے استدلال کے مطابق جب اللہ تعالےٰ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی مدد اپنے بے شمار فرشتوں سے کر رہا تھا تو پھر اس جنگ میں تو کسی صحابی کا بال بیکا بھی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ کفار کے تمام لشکر کو آناً فاناً نیست ونابود کر لے کیلئے تو اللہ کا صرف ایک ہی فرشتہ کافی تھا۔ اسی طرح آپ کے استدلال کے مطابق یہ اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ کو غیب کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر غیب کا علم ہوتا تو اللہ کو پہلے ہی معلوم ہوتا کہ فرعون نے ایمان ہرگز نہیں لانا۔ اس لئے وہ موسےٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام کو فرعون کے پاس دعوتِ دین دینے کیلئے نہ بھیجتا۔

آپ کے پہلے اعتراض سے جو نکات پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے جواب سے امید کرتا ہوں کہ آپ کی خاطر خواہ تسلی ہو گئی ہو گی۔ اب میں آپ کے دوسرے اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ "میں شرک کی تعریف یہ سمجھتا ہوں کہ جس نظریہ سے اللہ سے دعا کی جائے۔ عقیدہ ہے کہ وہ سنتا ہے اور ہاں نا میں جواب نہیں دیتا۔ اس عقیدے کے تحت کسی بزرگ، ولی یا صاحب مزار کو پکارا جائے شرک ہے۔" اگر آپ کے اس عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ایسے معاملہ میں جس میں کہ صرف خدا ہی کو پکارنا لازم وجائز ہے۔ اگر ایسے معاملہ میں کسی اور کو پکارا جائے تو وہ شرک ہے تو مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے اور اسی بات کو میں نے اپنے الفاظ میں یوں لکھا تھا کہ اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کو پکارنا شرک کے مترادف ہے اور اس بات کی مزید وضاحت میں نے کتاب کے پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۸۴ پر یوں کی ہے کہ "کوئی جاہل سے جاہل مسلمان بھی ایسا نہیں ہے جسے یہ پتہ نہ ہو کہ سب انسان اللہ کے بندے ہیں اور کوئی مسلمان اللہ کو چھوڑ کر اس کی نفی کرتے ہوئے اور اس کے وجود سے انکار کرتے ہوئے غیر اللہ سے مانگتا ہو"۔ اور مطلب اس بات کا یہ ہے کہ جب ایسا مسلمان کسی ولی اللہ یا صاحبِ مزار کے پاس جاتا ہے تب بھی وہ عبادت اللہ ہی کی کرتا ہے اور اللہ ہی کو پکارتا ہے اور اللہ ہی سے مانگتا ہے اور جبھ

صفحہ ۸۷ پر مزید یہ بھی لکھا ہے۔ "اور جو لوگ اللہ کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں پر جا کر دعا مانگتے ہیں تو ان میں سے اکثر کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ وہاں جا کر بھی براہِ راست خدا ہی سے سب کچھ مانگتے ہیں۔ لیکن جو بزرگ ہستیوں کو زندہ جان کر ان سے سوالی ہوتے ہیں۔ تو ان کا معاملہ اس کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک سوالی اللہ کے نام پر کسی سے دنیا میں مانگتا ہے۔" دنیا میں اللہ کے نام پر سوالی ہونے کی اجازت سورہ بقر میں دی گئی ہے۔ اس لئے یہ بھی شرک نہیں ہے اور اس دنیا میں شاذ ہی کوئی ایسا مسلمان ہو۔ جس نے اپنی زندگی میں کسی نہ کسی وقت اپنے ماں باپ سے، بہن بھائیوں سے، عزیز واقارب سے یا اپنے کسی بزرگ سے اپنے لئے دعا نہ کروائی ہو۔ اگر کوئی کسی ولی اللہ کے پاس جاتا ہے تو ولی اللہ اپنے طور پر اسے نہ کچھ دیتا ہے اور نہ ہی دے سکتا ہے اور جو کچھ بھی اگر کسی کو ملتا ہے۔ وہ سب خدا ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ جو ہم جب کسی میت کی نمازِ جنازہ ادا کرتے ہیں تو یہ بھی سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ ہم سب میت کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ مرنے والے کو بخش دے اور اسی لحاظ سے کسی کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھ لینا بھی شرک نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا شرک نہیں ہے۔ اور اس بات کی مزید تصدیق مولانا مفتی محمود صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جو "نوائے وقت" لاہور کے ۵ / فروری ۱۹۷۷ء کے شمارہ میں لیاقت باغ راولپنڈی کے انتخابی جلسہ کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مولانا موصوف نے ارشاد فرمایا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور مولانا مفتی محمود صاحب دونوں حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ اور قائداعظم محمد علی جناح کے مزاروں پر جا کر فاتحہ خوانی کرنے کو تیار ہیں۔ بشرطیکہ مولانا کوثر نیازی صاحب اپنا استعفیٰ لکھ کر انہیں دے دیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا مفتی محمود صاحب کا یہ بیان سیاسی نوعیت کا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ چونکہ یہ دین کا معاملہ ہے اور مولانا

مفتی محمود صاحب ایک بزرگ دینی راہنما ہیں، اس لئے یہ ناممکن ہے کہ اس دینی معاملہ میں انہوں نے کسی قسم کی دروغ گوئی سے کام لیا ہو۔ انہوں نے تو یہ واشگاف اعلان مولانا مودودی صاحب کی جانب سے اس جلسہ میں کیا ہے کہ جہاں مولانا مودودی صاحب کے معتبر نمائندگان بھی موجود تھے اور اس خبر کو چھپے کافی دن گزر گئے ہیں اور اس کی ابھی تک کوئی تردید نہیں ہوئی، البتہ اگر کوئی شخص کسی بزرگ ہستی کے روضہ مبارک پر جانے سے یہ خدشہ محسوس کرے کہ کہیں وہ روضہ کو پوجنا نہ شروع کر دے اور عین عبادت سمجھتے ہوئے اسے سجدہ نہ کرنے لگے تو ایسے شخص کو ہرگز روضہ پر نہیں جانا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا شخص اپنی جہالت کے سبب اللہ سے بہت دور گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جب بندہ اللہ کو پکارتا ہے تو اللہ اس کے قریب ہوتا ہے اس کی پکار کو سنتا ہے اور پکار کا جواب بھی دیتا ہے۔ لیکن اللہ تعالٰے اس رعایت و عنایت کے ساتھ ساتھ بندے پر یہ پابندی بھی لگاتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی جان پر ظلم کرلے تو اس شخص کا محض اپنے طور پر اکیلے اپنے گناہ کی بخشش کیلئے دعا مانگنا کافی نہ ہوگا۔ بلکہ قرآن پاک کی رو سے اس پر لازم ہے کہ وہ شخص رسول پاکؐ کی خدمت میں حاضر ہو اور ان سے بھی اپنی بخشش کی خاطر اللہ کے حضور دعا کروائے۔ اگر کوئی اپنی جان پر ظلم کرنے والا شخص ایسا نہیں کرتا تو اس کے دل میں کجی ہے اور وہ اللہ تعالٰے کے متعلقہ حکم کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح سورہ ممتحنہ میں یہ بیان ہے کہ جب نیک عورتیں بیعت کرنے کیلئے رسول پاکؐ کی خدمت میں آئیں، تو آپؐ ان عورتوں کی بخشش کے واسطے اللہ تعالٰے سے دعا مانگیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رسول پاکؐ کی دعا کی کیا اہمیت اور قدر و منزلت ہے اور جلشانہٗ آپ کی دعاؤں کو کتنا پسند فرماتا اور ترجیح دیتا ہے۔ صاف عیاں ہو رہا ہے کہ حضورؐ کی دعاؤں

کے صدقہ میں اللہ تعالے دوسرے لوگوں کو فیضیاب کرتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص حضورؐ سے دعا کروانے سے کسی وجہ سے عاری یا بے نیاز ہے تو یہ اس کا معاملہ اپنے اللہ سے ہے۔ میں تو دعاگو ہوں کہ اللہ تعالےٰ ہم سب پر اپنا فضل و کرم کرے اور جو اس کے نزدیک سیدھی راہ ہے، وہ ہم سب کو دکھائے۔

ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ چونکہ حضورؐ اس فانی دنیا سے اب رحلت فرما چکے ہیں۔ اس لئے ان سے بخشش کیلئے دعا منگوانے کا سوال صرف اسی وقت پیدا ہوا کرتا تھا۔ جب کہ حضورؐ اس دنیا میں موجود تھے۔ اس لئے قرآن پاک کی متعلقہ آیتِ مبارکہ کا اطلاق اب صرف اسی حد تک رہ گیا ہے کہ اُسے تلاوت کر لیا جائے۔ اس سے اب مزید استفادہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ تو جواباً عرض ہے کہ اس اندازِ فکر کے مطابق اس آیت مبارکہ سے استفادہ تو صرف وہ چند اصحابہ کرامؓ ہی کر سکتے تھے جنہوں نے حضورؐ کی حیات طیبہ کے باقی ماندہ مختصر دَور میں کوئی ظلم کر لیا ہوگا۔ حالانکہ اصحابہ کرامؓ تو پہلے ہی خوش قسمتی سے جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی انمول صحبت سے فیضیاب ہو رہے تھے اور اس وجہ سے تمام اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین سے کہیں بلند روحانی درجے پر فائز تھے۔ اس لئے اس متذکرہ آیتِ کریمہ کی سب سے زیادہ ضرورت ان مسلمانوں کو رہتی دنیا تک تھی، جو کہ آپؐ کی صحبت کی عظیم نعمت حاصل کرنے سے محروم رہے اور جن کیلئے رحمت کی یہ گنجائش میسّر کرنا از حد ضروری تھا تاکہ اگر اور جب کوئی مسلمان اپنی جان پر ظلم کر لے تو اس آیتِ مبارکہ سے استفادہ کرتے ہوئے جناب رسالتِ مآب سے اپنی بخشش کیلئے دعا منگوا لے۔ کیا اللہ تعالےٰ ہم سب مسلمانوں کو اپنے اعلانِ بخشش سے یکساں طور پر استفادہ حاصل کرنے کا موقع و حالات فراہم نہیں کرتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس وقت کوئی ذہن اس انداز میں سوچنا شروع کر دے کہ انبیاءؑ علیہ سلام مر جانے کے بعد مردہ ہو چکے ہیں، ان سے تمام دنیاوی و روحانی روابط ٹوٹ

چکے ہیں تو پھر ایسا ذہن یہ کج بحثی بھی کر سکتا ہے کہ اے اللہ میں اپنے نبیؐ سے اپنی بخشش کیلئے دعا تو منگوانا چاہتا تھا۔ لیکن کیا کرتا۔ تو نے اسے مردہ کر دیا۔ میں اپنے نبی سے رحمت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن رحمت العالمین کو تو نے اس دنیا میں رہنے ہی نہ دیا۔ اے اللہ۔ میں تیرے نبیوں پر بھی ایمان لانا چاہتا تھا۔ لیکن تو نے چونکہ میرا ان سے کوئی روحانی تعلق قائم نہ رہنے دیا۔ میں نے نہ ان کو دیکھا۔ نہ ان کا نام تک سُنا تو پھر میں ایسے مردوں پر کیسے ایمان لا سکتا تھا۔ کیونکہ ایمان لانے سے روحانی تعلق کا قائم ہونا لازم ہے۔ جس کے لئے ایمان لانے والے اور جس پر ایمان لایا جائے۔ دونوں کا زندہ ہونا ضروری شرط ہے۔ مردہ زندہ پر ایمان نہیں لا سکتا۔ تو اے اللہ کوئی زندہ مردہ پر کیسے ایمان لا سکتا ہے۔ اور اے اللہ اسوقت جو روز محشر تو رسول پاک سے یہ گواہی لے رہا ہے۔ کہ انہوں نے تیرا پیغام حق مجھ تک پہنچا دیا۔ تو یہ بھی غلط اس لئے ہے کہ جس وقت میں دنیا میں زندہ تھا تو یہ مردہ تھا۔ ان کا میرے ساتھ کوئی روحانی رابطہ نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھ تک تیرا پیغام ذاتی طور پر کوئی نہیں پہنچایا اور اے اللہ۔ پھر تو نے مجھے یہ بھی حکم دیا۔ کہ میں اپنے رسولؐ پر درود اور سلام بھیجوں۔ لیکن یہ بھی میں اس لئے ان تک نہ پہنچا سکا۔ کیونکہ حضورؐ زندہ موجود نہ تھے اور میں اُن تک کسی ذریعہ سے نہ پہنچ سکتا تھا۔ اگر کسی شخص کا انداز فکر یہ رخ اختیار کرنے لگے، تو میں تو ایسے فکر کو اپنانے کی بجائے۔ اللہ تعالےٰ کی مکمل پناہ تلاش کرونگا کیونکہ سرکشی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ شاید کسی ایسے ہی موقع کے مطابق علامہ اقبال نے کہا تھا۔

عشق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب۔ میرا قیام بھی حجاب

پیشتر اس کے کہ ان صاحب کے دوسرے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کروں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس ضمن میں ان کی تسلی کے لئے ایک نہایت اہم واقعہ بیان کروں۔ جو تفصیل کے ساتھ ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" کے نومبر ۱۹۷۰ء کے شمارہ میں مندرجہ ذیل الفاظ میں جناب مشتاق احمد خان صاحب کے حوالہ سے درج ہے۔ ضروری و مناسب تعارف کی خاطر صرف اتنا بتانا کافی سمجھتا ہوں کہ مشتاق احمد صاحب میرے لئے ایک واجب الاحترام ہستی ہیں۔ آپ کے والدِ محترم خان بہادر فخر الدین احمد خان نظام حیدر آباد (دکن) کے وزیر مالیات تھے اور مشتاق احمد صاحب پاکستان میں حیدر آباد کے ایجنٹ جنرل مقرر ہوئے تھے اور اس سفارتی حیثیت سے آپ نے متعدد بار قائد اعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان مرحوم سے ملاقاتیں کی تھیں۔ جو کہ حیدر آباد کے ہندوستان کے ساتھ غیر معمولی حالات کی وجہ سے نہایت اہم نوعیت کی تھیں۔ آپ نے ایک موقع پر خان لیاقت علی خان کی وساطت سے حیدر آباد (دکن) کا کم و بیش دو کروڑ روپیہ حکومتِ پاکستان کے پاس بطورِ امانت جمع کروایا تھا۔ تاکہ وہ حیدر آباد پر ہندوستان کا جبری تسلط قائم ہو جانے کے بعد ہندوستان کے ہتھے نہ چڑھ جائے (بحوالہ "کاروانِ حیات") مشتاق صاحب اس اہم واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "عقل حیراں ہے تماشائی۔ کیونکہ لاشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ بالکل نہیں ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال پہلے کی نعشیں ہیں، بلکہ یوں لگتا تھا۔ جیسے انہیں رحلت فرمائے دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوئے۔

مجھے ٹھیک یاد نہیں، مگر غالباً سولہ سترہ برس ہوئے۔ میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی جس میں دو صحابہ کرامؓ کی دوبارہ تدفین کا ذکر تھا۔ جس حالت میں ان کی میتیں پائی گئی تھیں، اسے ایک زندہ معجزے سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اس خبر کو پڑھ کر اس وقت میرا تاثر وہی تھا۔ جو عام حالات میں مجھ جیسے عامی کو ہو سکتا ہے، یعنی اس خبر میں ضرورت سے

زیادہ مبالغے سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ اسی تاثر کے تحت یہ خبر حافظے سے اتر گئی کئی برس بعد ۱۹۶۵ء میں حج بیت اللہ کے ارادے سے کراچی روانہ ہوا۔ وہاں مختصر قیام کے دوران میں حسب عادت نئی پرانی کتابوں کا کھوج لگانے نکلا۔ ایک کتب فروش کی دکان پر ورق گردانی کرتے ہوئے ایک خاتون محترمہ محمودہ عثمان صاحبہ کا لکھا ہوا مشرق وسطیٰ کا سفرنامہ نظر پڑا۔ میرے مجوزہ سفر میں چونکہ اس سرزمین کے دوسرے مقدس مقامات بھی شامل تھے، میں نے اپنی معلومات میں اضافے اور رہبری کے لئے اس سفرنامے کو خرید لیا۔ گھر پہنچ کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ میری نظر اس کی فہرست مضامین کی ایک سرخی پر ٹھہر گئی۔ جب اس مضمون کو پڑھا، تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جو خبر میں نے کئی برس پہلے شہ سرخی کے تحت ایک اخبار میں پڑھی تھی، اس کا تفصیلی ذکر تھا۔ اور یہ واضح کیا گیا تھا کہ یہ ان کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔ بنابریں یہ دلچسپ روداد میرے لئے انتہائی دلچسپی کا موجب بن گئی۔ میں نے اور میری اہلیہ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ حج سے فراغت پانے کے بعد اس واقعے کی موقع پر جا کر تحقیق کریں گے، چنانچہ جو کچھ میں بیان کرنے لگا ہوں، وہ صرف اخباری خبر اور سفری یادداشت ہی پر مبنی نہیں ہے، بلکہ میں نے ذاتی تحقیق سے حتی الامکان اس کی تصدیق کر لی ہے۔

بغداد سے کوئی ۳۰ - ۳۵ میل کے فاصلے پر سلمان پاک نامی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اسے بہت سے صحابہ کرامؓ کے مستقر ہونے کا بھی شرف حاصل تھا۔ وہاں پہنچ کر جب میں نے تاریخی آثار دیکھنے کی خواہش کی، تو مجھے گائڈ (Guide) اپنی عام عادت کے مطابق کسریٰ کے محل کے کھنڈروں میں لے گیا۔ ان کھنڈروں کو دیکھ کر جہاں سیاح دنیا اور اس کے جاہ و حشم کی بے ثباتی سے عبرت پکڑتے ہیں، وہاں دوسری طرف اسلام کے غازیوں اور مجاہدوں کے کارناموں کی عظمت دل

پر نقش ہو جاتی ہے۔ جنہوں نے محض اپنی قوت ایمانی اور اللہ تعالیٰ کی نصرت کے سہارے بڑے سے بڑے جابر حکمرانوں کو زیر کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ اس سرزمین پر ایک زبردست معرکہ کفر و اسلام برپا ہوا تھا۔ جس میں حضرت سلمان فارسیؓ بھی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ہمراہ تھے اور وہیں مدفون ہیں۔ شاید اسی وجہ سے مدائن کا نام بدل کر سلمان پاک بن گیا۔ ان کے مزار پر حاضری دی۔ میں فاتحہ پڑھ کر ہٹا، تو گائڈ نے کہا۔

"اب میں آپ کو ایک ایسی زیارت کراؤں گا۔ جو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی۔"

یہ کہہ کر وہ مجھے حضرت سلمان فارسیؓ کے مقبرے سے ملحق جدید طرز کے بنے ہوئے حجروں میں لے گیا۔ جس میں علیحدہ علیحدہ دو قبریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی کہ وہ ابھی حال ہی میں تعمیر ہوئے ہیں۔ پوچھنے پر گائڈ نے بتایا کہ یہ مزارات حضرت حذیفہ بن الیمانؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کے ہیں اور شاہ فیصل اول کے دورِ حکومت میں دوبارہ تعمیر کئے گئے ہیں۔ گائڈ کی زبانی یہ سن کر میرے ذہن میں وہ سارا واقعہ تازہ ہو گیا جسے میں دوبارہ پڑھ چکا تھا اور جس کی تصدیق کے لئے میں نے سلمان پاک کا سفر اختیار کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے گائڈ سے پوری داستان دلچسپی سے سنی معلوم ہوا کہ ان صحابہ کرامؓ کے مزارات پہلے موجودہ مقام سے دریائے دجلہ کی طرف کوئی آدھ میل کے فاصلے پر تھے، لیکن بعد میں ان کی میتوں کو اس نئی جگہ منتقل کر دیا گیا۔

کہتے ہیں ایک دن عراق کے شاہ فیصل نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا۔ جس نے اپنے آپ کو حذیفتہ الیمانیؓ بتایا اور کہا کہ ان کے مزار میں دریا کا پانی آ گیا ہے اور ان کے ساتھی حضرت جابر بن عبداللہ کے مزار میں بھی نمی آ گئی ہے، اس لئے ان

دونوں کو وہاں سے منتقل کر دیا جائے۔ یہ خواب شاہ فیصل نے متواتر دو تین رات دیکھا وہ شش و پنج میں پڑ گئے کہ اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے۔ ادھر عراق کے مفتی اعظم نے بھی یہی خواب لگاتار دو تین رات دیکھا۔ اس میں ایک شکایت کا اضافہ بھی تھا۔ کہ بادشاہ نے ان کی بات پر توجہ کیوں نہیں دی؟ یہ نوری السعید کی وزارت کا دور تھا۔ مفتی اعظم نے اس سے ذکر کیا، اس کے توسط سے شاہ فیصل سے رابطہ قائم کیا اور ساری بات سنائی۔ ملک فیصل نے اعتراف کیا کہ اس نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے، مگر اس کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ اگر وہ اس میں دی ہوئی ہدایت کے مطابق کوئی عملی اقدام کرے، تو دنیا اس پر ہنسے گی۔ یہ سائنس کا زمانہ ہے، ایسے توہمات کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ پھر مفتی اعظم سے پوچھا۔

"آپ ہی بتایئے، میں آخر کیا کروں؟"

"یہ خواب اتنا صاف اور واضح ہے کہ اس پر عمل کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیئے،" مفتی اعظم نے جواب دیا۔

"یہ معاملہ دو جلیل القدر صحابہ کرام رض کا ہے اور بہت بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ میں محض ایک خواب کی بنا پر اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے لئے اپنے آپ کو آمادہ نہیں پاتا۔"

مفتی اعظم نے اصرار کیا، تو باہمی صلاح مشورے سے یہ طے پایا کہ دریا کی طرف سے کچھ فاصلہ پر ایک گہری خندق کھود کر دیکھا جائے وہاں دریا کا پانی رس رس کر تو نہیں آ رہا، چنانچہ اس تجویز پر فوراً عمل ہوا، لیکن خندق میں کسی قسم کی نمی نہ پائی گئی۔ اس کے بعد بادشاہ کے نزدیک کسی اقدام کا سوال ہی نہ تھا۔ لیکن اس سائنسی تجربے کے بعد وہ بزرگ بادشاہ اور مفتی اعظم دونوں کو پھر خواب میں نظر آئے۔ اپنی خواہش کا اظہار کیا اور اس پر عمل درآمد کرنے کے لئے توجہ دلائی۔ بادشاہ نے مفتی اعظم سے کہا۔

"محکمہ تعمیرات کی رپورٹ کے بعد میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ان بزرگوں کے مزارات میں پانی آگیا ہے۔ اب کسی مزید کارروائی کی ضرورت نہیں، لیکن اگر آپ کو اصرار ہے اور ان خوابوں کی صداقت پر یقین ہے، تو فتویٰ دے دیجیئے، میں احکام جاری کر دوں گا۔"

مفتی اعظم نے بلا پس وپیش فتویٰ دے دیا جسے اس شاہی فرمان کے ساتھ شائع کر دیا گیا کہ دونوں مزار منتقل کرنے کے لئے عیدالاضحیٰ کے دن کھولے جائیں گے۔

وہ حج کا زمانہ تھا۔ جونہی یہ خبر شائع ہوئی۔ دنیائے اسلام میں جوش و خروش پھیل گیا۔ شاہ سے دنیائے اسلام کے ہر کونے سے درخواست کی گئی کہ یہ اقدام عیدالاضحیٰ کے چند روز بعد کیا جائے تاکہ حجاج اور دوسرے مسلمان بھی اس موقع پر حاضری دے سکیں، چنانچہ دنیائے اسلام کی خواہش کے احترام میں یہ تقریب دس دن کے لئے ملتوی کر دی گئی۔

ان دس دنوں میں یہ چھوٹی سی بستی حج کے ایام میں منیٰ کی طرح چھوٹے چھوٹے خیموں کے ایک بڑے شہر میں تبدیل ہو گئی۔ دنیا کے کونے کونے سے اسلام کے نام لیوا کھچ کھچ کر یہاں پہنچ گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس طرح ۵ - ۶ لاکھ مسلمان اکٹھے ہو گئے۔ اس کے علاوہ غیر مسلم بھی خاصی تعداد میں پہنچ گئے۔ آخر کار وہ دن آگیا جس کی آرزو میں لاکھوں بندگانِ خدا جمع ہوئے تھے۔ جب اس جم غفیر کی موجودگی میں مزارات کھولے گئے، تو دیکھنے والوں کی آنکھیں یہ دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ حضرت حذیفہ الیمانی رض کے مزار میں واقعی پانی آچکا تھا اور خواب ہی کے عین مطابق حضرت جابر بن عبداللہ رض کے مزار میں نمی کے اثرات پائے جاتے تھے۔

اس کے بعد کیا ہوا، آپ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والی ایک خوش قسمت

خاتون کے الفاظ میں سنئے۔

"اعلیٰ حضرت شاہ فیصل، مفتی اعظم عراق، وزیر خارجہ جمہوریہ ترکیہ، پرنس فاروق ولی عہد مصر اور عراق پارلیمنٹ کے تمام ارکان نے حضرت حذیفہ الیمانی کی نعش مبارک کو کندھا دیا اور بڑے احترام سے ایک شیشے کے تابوت میں رکھ دیا۔ اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی نعش مبارک کو مزار سے باہر نکالا گیا۔ دونوں بزرگوں کے کفن حتیٰ کہ ڈاڑھیوں کے بال تک بالکل صحیح حالت میں تھے۔ لاشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہرگز نہیں ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال قبل کی نعشیں ہیں۔ بلکہ گمان یہ ہوتا تھا کہ انہیں رحلت فرمائے دو تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ دونوں کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں اتنی پراسرار چمک تھی کہ بہتوں نے چاہا ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں، لیکن ان کی نظریں اس چمک کے سامنے نہ ٹھہر سکیں۔ ٹھہر بھی کیسے سکتی تھیں؟"

ایک حیرت انگیز اور روح پرور منظر تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹر اور یورپ کے فاضل جو بطور خاص اس تقریب میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے، اس منظر کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ اس کے بعد یہ تابوت پوری عقیدت و احترام کے ساتھ سلمان پاک لائے گئے اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مقبرے میں دوبارہ دفن کر دیئے گئے۔ سلمان پاک کے بوڑھے بتاتے ہیں کہ وہ روح پرور منظر اب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہے جس نے اسلام کی حقانیت کا ایک زندہ اور ناقابلِ تردید ثبوت بہم پہنچایا تھا۔ میں نے یہ بھی سنا کہ اس واقعہ سے متاثر ہو کر بہت سے نصرانی اور یہودی مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس واقعے کو میں نے پڑھا بھی ہے اور نئے مزارات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔ جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان کی بنا پر اسے ایک زندہ معجزہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ میری یہ خوش

قسمتی ہے کہ مجھے ان جلیل القدر صحابیوں کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔،،

قدرت نے مشاہدہ کروایا کہ اللہ کے مومن بندے مر جانے کے بعد اسکے نزدیک زندہ ہوتے ہیں تیرہ چودہ سو برس کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ان کے جسم مبارک تر و تازہ ہوتے ہیں۔ پھر ہمیں یہ بھی مشاہدہ کروایا گیا ہے کہ ان بزرگ ہستیوں کو یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ان کی قبروں کو کب اور کیوں منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کہ اس سلسلہ میں انہیں خواب میں کس سے اس منتقلی کا تقاضا کرنا چاہیئے۔ یعنی یہ کہ شاہِ عراق کون ہے اور مفتیٔ اعظم عراق کون اور پھر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ شاہ عراق کیلئے ان کی قبروں کو منتقل کرنے کی راہ میں کونسی علمی روکاوٹ ہے اور اس روکاوٹ کو کس طرح مفتیٔ اعظم کے ذریعہ سے دُور کیا جاسکتا ہے تا کہ ان کی دنیاوی ضرورت خوش اسلوبی سے سرانجام پا سکے۔ پھر ہمیں یہ مشاہدہ بھی کروایا گیا ہے کہ اس منتقلیٔ قبور کے کام کو ایک ایسے وقت سرانجام دیا جائے جسوقت کہ دنیا کے تمام ملکوں سے لاکھوں کی تعداد میں حجاج حضرات موجود ہوں تا کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے تمام واقعہ کا مشاہدہ کرلیں۔

بالکل ایسا ہی لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ اہم معاملہ بادشاہ نورالدین زنگی سے پیش آیا تھا۔ جبکہ دو یہودی ایک ناپاک عالمگیر سازش کے تحت اپنے حجرے سے ایک زیر زمین سرنگ کھود کر جناب رسول پاکؐ کے جسدِ خاکی کو ان کی قبر مبارک سے نکال کر اُڑا لے جانا چاہتے تھے، لیکن جب بادشاہِ وقت نورالدین کو خواب میں بار بار اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا تو وہ فوراً مدینہ منورہ میں روضۂ مبارک پر پہنچا۔ دونوں سازشی یہودیوں کو آخر کار پہچان کر اُن کو جہنم رسید کیا اور حضور علیہ السلام کی قبر کو آئندہ کے لئے ایسے خطرات سے محفوظ کرنے کے لئے قبر کے چاروں طرف گہرائی تک سیسہ پلائی دیوار اٹھوا دی گئی۔ جو اب بھی موجود ہے اور اس واقعہ کی گواہی

اب بھی دے رہی ہے۔ یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر جسم مٹی میں مل کر مٹی ہی ہو جاتا ہے تو پھر اس خواب کے ذریعہ حضورؐ کے جسم مبارک کی حفاظت کس نے کروائی اور کیوں کروائی۔ اس کا کیا فائدہ یا ضرورت تھی۔

تیسرا اعتراض جو انھوں نے کیا ہے کہ " قرآن سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ نبی کا بیٹا نبی ہے" تو یہ بات بھی حتمی طور پر درست نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ سلام کا بیٹا نبی نہیں تھا۔ بلکہ وہ تو کافر تھا اور پھر آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ انبیاء علیہ سلام چونکہ صرف اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اسلئے ہر حال میں صرف اللہ کے سوا کسی اور کو پکارنا جائز نہیں۔ اس بات کا جواب وضاحت سے اوپر دیا جا چکا ہے کہ اللہ کو تو ہر حال میں پکارنا لازم ہے اور انبیاء علیہ سلام اپنے جس اعلےٰ ترین منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ وہاں تو اللہ اور ان کے درمیان اور کوئی وسیلہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ لازمی طور پر صرف اللہ ہی کو پکاریں گے۔ لیکن اللہ اور اس کے عام بندوں کے درمیان نبی کا وسیلہ ہونا ہے اس لئے نبی کے وسیلہ سے اللہ اور بندوں کے درمیان تعلقات استوار ہوتے ہیں اور نبی کا وسیلہ (واسطہ یا سبب) اختیار کرنا اللہ کی سنت ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی جان پر ظلم کرلے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ رسولِ پاک کی خدمت میں حاضر ہو اور ان سے بھی اپنی بخشش کے لئے دعا منگوائے۔ قرآنِ حکیم کے اس حکم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ جسوقت اللہ اپنے کسی بندے کی دعا کو اس کی کسی خطا کی وجہ سے شرفِ قبولیت نہیں بخشتا تو اس وقت حضورؐ کی اس شخص کے حق میں دعا اللہ تعالےٰ قبول کر لیتا ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ سے دعا کروانے کیلئے ان کی خدمت میں حاضر ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ آپ نے درست لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ سلام نے نمرود کی آگ کے وقت اللہ ہی کو پکارا تھا۔ لیکن آپ کو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن نشین رکھنا چاہیئے تھا کہ اسوقت جب جبرائیل علیہ سلام پہلے حضرت ابراہیم علیہ سلام کے پاس آئے

تھے. تو اللہ کے حکم ہی سے آئے تھے اور جس منصب پر اللہ نے جبرائیلؑ کو فائز کیا ہوا ہے. اس کے مطابق وہ حضرت ابراہیمؑ کو گمراہ نہیں کر سکتے تھے اور جو حضرت یونس علیہ السّلام نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ تعالےٰ ہی کو پکارا تھا. وہ بھی درست ہے. لیکن جب حضرت یونس علیہ سلام اللہ کی اجازت کے بغیر اپنی قوم سے بدظن اور غصے ہو کر اسے چھوڑ کر چلے گئے تو اللہ ہی کے حکم سے مچھلی کے پیٹ میں بھی گئے تھے. اسی طرح تاریخ میں آیا ہے کہ جب حضرت ذکریا علیہ سلام کو مار ڈالنے کے لئے دشمن ان کا پیچھا کر رہے تھے تو انہوں نے پناہ لینے کیلئے اللہ کی بجائے ایک درخت کو پکارا تھا اور اس سے پناہ لی تھی اور اسی طرح تاریخ میں ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ سلام نے حضرت یوسف علیہ سلام کے فراق میں اللہ تعالےٰ سے دعا کی تو ان کو الہام ہوا کہ چونکہ حضرت یعقوب علیہ سلام نے حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے سپرد کیا تھا. اس لئے یوسفؑ کا حال ان کے بھائیوں سے پوچھیں. یہ ایسی باتیں ہیں جو آپ کے اعتراضات کی وضاحت میں مجبوراً لکھنی پڑ رہی ہیں.

حاضر و ناظر کا مسئلہ

جو مسلمان اس نقطۂ نظر کے حامی ہیں کہ چونکہ حضور رسول کریم محفلِ میلاد میں بظاہر حاضر و ناظر نہیں ہوتے. اس لئے ان کو درود وسلام میں حاضر سمجھتے ہوئے ندا نہیں دینی چاہیے اور نہ ہی آپؐ کو مخاطب کر کے پکارنا چاہیے. کیونکہ حاضر و ناظر تو صرف اللہ ہی کی ذات ہے اس لئے اللہ کے سوا کسی غیر اللہ کو پکارنا شرک کے مترادف ہے. لیکن شاہ ولی اللہ جیسے اللہ کے نیک بندے تو اپنے عقیدت مندوں کی راہنمائی کیلئے یہ بتا رہے ہیں کہ انبیاءؑ زندہ ہیں قبروں میں اپنی نمازیں پڑھتے ہیں. حج ادا کرتے ہیں اور جب سرکار دو جہاںؐ پر درود و سلام بھیجا جاتا ہے. وہ اس کو سنتے ہیں. سن کر خوش ہوتے ہیں اور بعض خوش نصیبوں کو شرفِ ملاقات بھی بخشتے ہیں. اندریں حالات جو لوگ اب بھی یہی موقف رکھتے ہوں

کہ جو حاضر و ناظر نہ ہو۔ اسے پکارنا یا مخاطب کرنا ان کے نزدیک شرک سے کسی طرح کم نہیں۔ تو پھر ایسے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ جب اپنے کسی صاحب سے ملنے جایا کریں تو ان کے دروازے پر جا کر دستک نہ دیا کریں، انہیں پکارا نہ کریں، کیونکہ اکثر اوقات جس کو کہ وہ جا کر پکارتے ہیں، وہ عین پکارنے کے لمحات کے دوران پکارنے والے کو نظر نہیں آرہا ہوتا اور بعض اوقات تو پکارے جانے پر ملتا بھی نہیں کیونکہ وہ پکارے جانے کے وقت گھر یا دفتر میں حاضر نہیں ہوتا، بلکہ اس وقت کسی دوسرے شہر یا ملک میں گیا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ان حالات میں اپنے صاحب کو جبکہ وہ حاضر و ناظر نہیں جا کر ملنے کی غرض سے پکارنا اگر شرک نہیں ہو سکتا اور اسی طرح کسی دوسرے شہر یا ملک میں مقیم اپنے کسی عزیز کو خط میں اسلام علیک لکھنے سے اور خط میں اسے حاضر کے صیغہ میں خطاب کرنے سے شرک نہیں ہوتا تو آپ یقین رکھیں کہ حضورؐ کو مخاطب کرنے اور درود وسلام بھیجنے سے بھی شرک نہیں ہوتا۔ کیونکہ یاد رکھیں کہ شرک صرف اسی صورت میں ہوتا ہے کہ کسی غیر اللہ کو اللہ جان کر پکارا جائے یا اس کی عبادت کی جائے ورنہ نہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ کسی شخص کے صرف عمل کو دیکھ کر اپنے فہم کے مطابق اپنے تئیں غلط نتیجہ اخذ کر کے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دینا مناسب نہیں ہے، بلکہ جس شخص کے عمل سے وسوسہ پیدا ہو رہا ہو اس کی نیت کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ صرف صحیح صورت حال سے آگاہی ہو سکے۔ کیونکہ اگر کسی عمل کرنے والے کی نیت میں شرک کرنے کی قطعاً ذرہ بھر گنجائش نہیں تو ایسے شخص کے متعلق مشرک کا فتویٰ دینے والا خود شرک کرنے کی زد میں آئے گا۔ اور نیتوں کا حال تو صرف اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔

مُردوں کو ہدایت دینے کیلئے پکارنا کفر نہیں

اور اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مُردوں کو پکارنا شرک ہوتا ہے تو یہاں بھی پکارنے پکارنے میں بڑا فرق ہے۔ غور

کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ اور رسولِ پاکؐ کافروں کو مردہ قرار دیتے ہوئے انہیں پکارتے ہیں اور اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتے ہیں، انہیں اللہ کے عذاب سے ڈراتے ہیں، اور رسولِ مقبولؐ حق کی دعوت کی غرض کی خاطر ان کافر مُردوں سے مخاطب بھی ہوتے ہیں اور ان سے ہمکلامی بھی کرتے ہیں جو کسی پہلو سے شرک نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مردوں کو پکارنا اور ان سے ہمکلامی کرنا بھی شرک نہیں ہے۔ البتہ جو مردوں کو اللہ جان کر یا اللہ کی خصوصی صفات کا حامل مان کر ان کو پکارتے ہیں اور یہ مردے بت بھی ہو سکتے ہیں اور چلتے پھرتے کافر لوگ بھی تو ایسے پکارنے والے لوگ یقیناً مشرک ہیں کافر ہیں، مردہ ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ مردے مردوں کو ہی اپنی مدد کیلئے پکارتے ہیں۔

زندہ کرنے والا خود کبھی مردہ نہیں ہوتا

قرآن مجید میں بار بار ارشاد ہوتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو اس کی نشانیوں پر مناسب غور و فکر کر کے پہچانیں۔ ہم جو دن رات حضورؐ پر درود وسلام بھیجتے رہتے ہیں اور اللہ اور اُن کے فرشتے بھی اُنؐ پر درود وسلام بھیجتے ہیں۔ تو اس درود وسلام کا ان کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اگر وہؐ مردہ ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے مردہ کے عام تصور کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام کے کسی قسم کے اثرات مرتب ہونا بے معنی سی بات ہے اور مردہ پر جو درود وسلام بھیجا جائے تو وہ معلق ہو کر رہ جائے گا۔ چاہے اسے اللہ اور اس کے فرشتوں ہی نے کیوں نہ حضورؐ کی ذات اقدس پر بھیجا ہو۔ وہ تو اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ان تک پہنچنے سے عاجز و قاصر رہے گا۔ اس لئے جو لوگ اس انداز میں سوچنے کی جسارت کرتے ہیں۔ انہیں ہوش کے ناخن لینے چاہیئں کیونکہ وہ اپنی بھٹکی ہوئی عقل کی بساط پر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی فکر کے مطابق اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) حضور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا درود وسلام بھیجنے سے عاجز و قاصر قرار دے رہے ہیں۔ لیکن اگر وہ لوگ یہ ایمان رکھتے

ہیں کہ اللہ تعالٰے اور اس کے فرشتے حضورؐ پر درود بھیجتے ہیں تو پھر انہیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ حضورؐ زندہ ہیں اور اللہ کے اور اس کے فرشتوں کے اور اس کے مومن بندوں کے درود وسلام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مستفید بھی ہوتے ہیں اور جیسے کہ سورہ انفال میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ اور اسکا رسول ان لوگوں کو پکار کر زندہ کرتے ہیں جو ان کی پکار کو قبول کرتے ہیں۔ اس آیت مبارکہ کی رو سے ہمارے لئے یہ سوچنے کا مقام پیدا ہوتا ہے کہ جو مردوں کو زندہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی موت کے بعد بھی ہم مردوں کو زندہ کر رہا ہو، ہمیں مومن بنا رہا ہو۔ وہ خود کیسے مردہ ہو سکتا ہے۔

رحمتہ اللعالمین سے زندہ ہونے کا ثبوت

پھر رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ربّ العزت نے جو رحمتہ اللعالمین کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز کیا ہے تو اس خصوصی فضل وعنایت کے معنی یہ ہیں کہ آپ سب جہانوں کیلئے ہمیشہ تک رحمت ہیں اور آپ کی رحمت سے سب جہانوں کی ہر شے کو مستفید ہونے کا حق ہے بشرطیکہ وہ اسے حاصل کرنے کے لیے ضروری بصیرت رکھتے ہوئے آپ کی رحمت کے طلب گار اور متمنی ہوں اور آپ بھی اس پر اپنی رحمت کرنا منظور فرمالیں۔ اگر آپ کی رحمت سے سب جہاں فیضیاب نہ ہو سکتے ہوں تو پھر آپ کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے رحمت اللعالمین قرار پانا بے مقصد بے معنی قرار پائے گا آپ محض لفظی طور پر تکلفاً تو رحمت اللعالمین نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لئے کوئی ایسا لقب تو نہیں کہ جس کا کوئی مقصد اور کوئی افادیت نہ ہو۔ آپ کا رحمت اللعالمین ہونا تو اس بات کا بیّن ثبوت فراہم کر رہا ہے کہ تمام عالم کی مستحق اشیاء آپ کی رحمت سے فیضیاب ہو رہی ہیں اور یہ بھی آپ کے زندہ ہونے کی ایک کھلی نشانی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں اس معاملہ میں بھی کوئی کجی پیدا ہو۔ اور وہ کہے کہ رحمت کرنا تو صرف اللہ تعالےٰ ہی کا خاصا ہے۔ اس میں تو کسی کو شک نہیں کہ اللہ اپنے بندوں پر رحمت بھیجتا ہے لیکن وہ یہ بھی تو خود ہی کہتا ہے کہ

اس کے فرشتے بھی رحمت بھیجتے ہیں۔ جیسے کہ سورۂ احزاب میں ارشاد ہے کہ ہوالذی یصلی علیکم وملائکتہ لیخرجکم من الظلمت الی النورہ ترجمہ۔ وہی (اللہ) ہے جو رحمت بھیجتا ہے، تم پر اور اس کے فرشتے، کہ نکالے تم کو اندھیروں سے اجالے میں"۔ اور حضورؐ کو رحمت اللعالمین بنانے والا بھی خود اللہ تعالٰے ہی ہے اور کون جانے کہ جو رحمت رسولؐ پاک کی جانب سے تمام جہانوں پر ہو رہی ہے اللہ کے نزدیک یہ رحمت بھی اللہ ہی کی طرف سے رحمت قرار پا رہی ہو۔ جیسے کہ وہ قرآن پاک میں فرماتا ہے کہ جس نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اس نے اللہ ہی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

میثاق سے زندہ ہونیکا روشن ثبوت

اس وقت تک زندہ اور مردہ کے مسئلہ پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ جو ایک مخلص حق کے متلاشی کی ضرورت کو پورا کرنے کیلئے کافی ہونا چاہیئے لہٰذا اب اس موضوع پر صرف ایک اور روشن مثال دے کر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ اللہ جلشانہٗ میثاق کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ جس وقت اللہ تعالٰے نے حضرت آدمؑ کی پیدائش سے کہیں پہلے عالم ارواح میں تمام انبیاء کو اکٹھا کیا اور ان سب سے یہ عہد لیا کہ جب ان سب انبیاءؑ کے بعد ایک پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں آئے۔ جو کہ اللہ کی ان کتابوں کو سچا کرے، جو انبیاءؑ کو اس کے آنے سے پہلے دی گئی ہوں گی تو اس وقت تمام انبیاءؑ اس (حضورؐ) پر ایمان لائیں اور اس کی تمام مدد بھی کریں اور میثاق کے اس تمام واقعہ پر انبیاءؑ کو گواہ ٹھہرا کر اللہ تعالٰی بذاتِ خود بھی اس پر گواہ بن بیٹھا تاکہ کسی کو اس واقعہ کے کسی پہلو سے راہ فرار اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نظر نہ آئے۔ لہٰذا اس مقام پر ہم سب کو اپنے ہوش وحواس کو پوری طرح قائم رکھتے ہوئے اور اس بارے میں اپنی طبیعت کے مختلف رجحانات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس مسئلہ پر اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ پاک میثاق کے واقعہ کو قرآن مجید میں بیان کرنے پر ہی اکتفا کیوں

نہیں کرتا، جو کچھ کہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ کیا وہ اللہ کے کلام ہونے کی خاطر خواہ گواہی نہیں ہے تو پھر اس واضح گواہی کی موجودگی میں اللہ کا خود گواہ بن بیٹھنا کس بات کی نشاندہی کر رہا ہے۔

میری دانست و بصیرت میں اللہ پاک یثاق کے واقعہ کو انتہائی اہمیت کا حامل قرار دے رہا ہے، تاکہ کسی شخص کے لئے اس پر کسی قسم کا شک وشبہ کرتے ہوئے اپنے لئے کوئی فرار کی راہ نکالنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور اگر کوئی خدانخواستہ ایسی کوشش کرنے کا مرتکب ہو تو پھر وہ اللہ تعالےٰ سے اپنا محاسبہ کرانے کیلئے پوری طرح تیار ہو جائے۔ کیونکہ قادرِ مطلق بڑے سادے اور واضح الفاظ میں فرما رہا ہے کہ جب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سب انبیاءؑ کے بعد اس دنیا میں تشریف فرما ہوں گے یا دوسرے لفظوں میں حضورؐ کی بعثت ہو گی تو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے تمام انبیاءؑ جو آپ کی بعثت سے پہلے دنیا میں تشریف لا چکے ہوں گے اور جو اس مادی دنیا میں ہمارے بعضوں کے نزدیک مر جانے کے بعد اب صرف مردہ ہیں، وہ سب انبیاءؑ اپنے یثاق کے تحت حضور نبی کریم پر نہ صرف ایمان لائیں گے، بلکہ حضورؐ کی مدد بھی فرمائیں گے۔ اب جو لوگ انبیاءؑ علیہ السلام کو مردہ مانتے ہیں، ان کے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ کوئی شخص جو کہ ان کے تصورِ مردہ کے مطابق مردہ ہو تو وہ کیسے کسی پر ایمان لا سکتا ہے اور کیسے کسی کی مدد کرنے کیلئے سرگرم عمل ہو سکتا ہے کیونکہ ایمان لانے والے کیلئے بھی اس کا زندہ ہونا ضروری ہے اور مدد کرنے والے کے لئے بھی زندہ ہونا ضروری ہے۔ اس مقام پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ایمان لانے والا شخص زندہ ہی نہیں ہونا چاہیے، بلکہ وہ شخص اپنے اللہ اور رسول پر پورے ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے ایمان لائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ قدرے نشے یا غنودگی کی حالت میں ایمان لا رہا ہو۔ ایسی حالت میں ایمان کا لانا نشے یا غنودگی کی حد تک ناقص تصور ہو گا، چہ جائیکہ کہ کوئی مردہ ہو۔ جو شخص جتنا زیادہ بیداری کی حالت میں ہو گا، اتنا

ہی بہتر اس کا ایمان لانا ہوگا. یہ معاملہ تو صرف ہم عام مسلمانوں کے لئے شرط ہے. لیکن جس وقت ایمان لانے والے خود انبیأ کی ذات قدس ہو تو ان کی بیداری اور شعور کا کیا عالم ہوگا. جبکہ وہ جناب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر بطور اللہ تعالےٰ کے گواہ وہاں موجود ہونے کے ایمان لا رہے ہوں گے. اب اگر یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی کوئی شخص انبیأؑ کو مردہ ہی تصور کرنے پر اصرار کرے تو اس جیسا بدنصیب پھر اور کون ہوگا. ایسے گمراہ کو تو پھر اللہ تبارک تعالےٰ ہی ہدایت دے تو دے. یہ عاجز و ناتواں بندہ تو اس کے لئے اپنے رب العزت سے دعا ہی کر سکتا ہے.

شیعہ سنی حضرات کیلئے دعوتِ فکر

شیعہ اور سنی حضرات کو دشمنانِ اسلام کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنا چاہیئے جو کہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ انہیں کسی نہ کسی طرح اشتعال دلا کر آپس میں الجھا دیا جائے. حالانکہ کوئی سنی ایسا نہیں ہے جو حضرت امام حسینؑ کا دل و جان سے ادب و احترام نہ کرتا ہو. سب جانتے ہیں کہ آپ حضور رسول پاکؐ کے پیارے نواسے ہیں اور آپ نے کربلا کے میدان میں اپنے اللہ کی راہ میں ایسی عظیم الشان قربانی دے کر اسلام کو دوبارہ زندہ کیا. جس کی کہ مثال نوع انسانی کی تاریخ میں نہیں مل سکتی. اس قربانی نے آپ کو سید الشہدا کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز کیا ہے. اس فقید المثال قربانی کے دو پہلو ہیں. ایک دنیاوی اور دوسرا روحانی. دنیاوی لحاظ سے دیکھا جائے تو کربلا کا میدان سامنے آتا ہے. یزید کی بربریت، درندگی سامنے آتی ہے جسے دیکھ کر انسانیت خون کے آنسو روتی ہے اور دنیا ماتم کدہ بن جاتی ہے. دوسرا پہلو روحانی ہے جسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قادرِ مطلق نے فیصلہ کیا کہ وہ کائنات کو مشاہدہ کرائے کہ اس کا بندہ خود کو کس طرح اس کی راہ میں قربان کرتا ہے. اس امتحان کے لئے رب العزت نے اپنے [illegible] کو چنا. اس نے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنے رب کا امتحان [illegible]

وہ زندگی کی کوئی قدر و قیمت نہیں لگاتا۔ وہ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ موت تو بہر حال سب کو آتی ہے۔ وہ اس کٹھن امتحان کو اپنے تئیں غنیمت جانتا ہے اور اسے نہایت خوش اسلوبی سے پاس کر کے اب نہایت خوش و مطمئن ہے۔ اس کا رب بھی اس پر بے حد خوش ہے۔ اس کے نانا اس پر خوش ہیں، باپ خوش ہیں اور والدہ محترمہ بھی خوش ہیں، یہ سب اپنے لاڈلے پر جتنا بھی فخر و ناز کریں بجا ہے۔ کیونکہ اس نے کربلا میں اسلام کو دوبارہ زندہ کر کے اُمتِ مسلمہ پر بڑا احسان کیا ہے۔

ہم مسلمان کتنے خوش قسمت ہیں کہ اللہ تعالٰے نے ہمیں حضورؐ کی امت میں پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ حالانکہ چودہ سو برس گزر چکے ہیں اور ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا اللہ کے ہاں جواب دہ بھی ہے۔ لیکن ہم حضورؐ کی امت سے پیدا ہونے پر کس قدر خوشی اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس کو تمام تر اللہ کا احسان و عنایت مانتے ہیں۔ اسی ہی کا فیصلہ اور انتخاب مانتے ہیں۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ حضور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابہ کرام کا ہے، جن کا کہ صحابیت کے لئے انتخاب فرما کر اللہ نے انہیں وہ بزرگی و مقام عطا کیا ہے کہ جس کا جتنا بھی احساس و احترام کیا جائے کم ہے۔ اس طرح ہمارے لئے نہایت واجب الاحترام و عقیدت حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ ہیں اور جو کوئی ان کی بزرگی پر شک کرے یا اعتراض کرے تو وہ سوائے اپنی گمراہی کا ثبوت دینے کے اور کچھ نہیں کرتا۔ اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسا کرنا اللہ تعالٰے کے فیصلہ پر تنقید کر کے دین سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ ہم سب کو ایسے شر سے بچائے اور اپنے ہر فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس مقام پر اب میں اپنا قلم روکتا ہوں۔ مضمون کتاب ختم کرنے سے ایک بار پہلے پھر اپنے اللہ سے دعا گو ہوں کہ اے اللہ میری دین کی خدمت کے لئے اس ادنٰے و حقیر کوشش کو شرفِ قبولیت بخش اور اس کو پیارے دین کی مناسب تبلیغ اور مسلمانوں کی دینی ترقی کا

سبب بنا اور اگر اس کتاب کے لکھنے اور بیان میں مجھ سے کہیں ذرہ بھر بھی غلطی یا کوتاہی تیرے حساب سے سرزد ہوئی ہے تو اے اللہ تو مجھے معاف فرما کیونکہ تیری ذات تو غفور الرحیم ہے اور میری نیت کو تیرے سوا اور کون بہتر جانتا ہے اور میں اپنے ان دینی بھائیوں سے بھی معافی کا خواستگار ہوں جنہیں اس کتاب کے لکھے جانے کی وجہ سے کوئی رنج یا تکلیف پہنچی ہو۔
میں نے تو اپنے طور پر ہرچند کوشش کی ہے کہ میں اپنے سب بھائیوں کے دینی جذبات کا پورا پورا خیال و احترام رکھتے ہوئے اپنی بات ان سے آگے بڑھاؤں تاکہ ہم سب خلوص دل سے اپنے دین کی بدولت بھائی بھائی بن جائیں۔ ہم میں دینی اتحاد ہو۔ اخوت ہو اور دین کے دشمنوں کے لئے ہم واقعی سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوں۔

ایک ضروری گذارش

کتاب "دین کے آئینے میں" شائع کر کے مفت تقسیم کرنے کا واحد مقصد اسلام کی تبلیغ ہے ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے اپیل کرتے ہیں کہ کتاب ہذا کو حاصل کر کے خود پڑھیں اور دوسرے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھائیں تاکہ لوگوں کے ذہن نظام مصطفےٰ کی طرف راغب ہوں۔

ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ اسلام دشمن افراد اس کتاب کو حاصل کر کے قیمتاً دے رہے ہیں یہ سراسر زیادتی ہے اس کتاب کی کوئی قیمت نہیں ہے اور نہ ہی اس کو قیمتاً حاصل کریں۔ اس کتاب کی قیمت وصول کرنا اخلاقی جرم ہے۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالےٰ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

محمد ارشاد اختر مرکزی صدر

اسلام میں پردہ کی حقیقت

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور مورخہ ۲۶ اپریل کی اشاعت میں جناب جسٹس ایس۔اے۔رحمان صاحب۔ ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان۔ کا ایک اہم مضمون بعنوان "پردہ کی حقیقت۔ ایک وضاحت" شائع ہوا ہے۔ جو آپ نے ۱۴ اپریل کی شام کو پاکستان ٹیلیویژن لاہور کے پروگرام میں ایک سوال کے جواب پر ہونے والے ایک اعتراض پر سپرد قلم کیا ہے جس کا راقم نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ اور دینِ اسلام سے دلچسپی رکھنے والے تمام اصحاب خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کی خدمت میں مندرجہ ذیل سطور گوش گزار کرنا ضروری و مناسب سمجھا ہے۔

یہ بات واقعی خوش آئند ہے کہ پاکستان ٹیلیویژن کے حضرات پچھلے چند ہفتوں سے دین اسلام کو اپنے پروگراموں میں پہلے کی نسبت اب زیادہ وقت اور اہمیت دے رہے ہیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ اور دانشور طبقوں کی دین سے دلچسپی خاطر خواہ طور پر بڑھے گی۔ اور اس طرح اسلام کے صحیح خد و خال اور روح کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں مسلمانوں کو ضروری مدد ملے گی۔ اور میرے نزدیک یہ وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔

مجھے جسٹس ایس۔اے رحمان صاحب سے پورا پورا اتفاق ہوگا۔ اگر آپ یہ فرمائیں

کہ مسلمانوں کو اپنے دینی معاملات میں تحقیق کو نہ ذاتی وقار کا مسئلہ بنانا چاہیئے۔ اور نہ ہی تند و تیز تنقید کا لہجہ اختیار کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کے برعکس ہمیں اپنے دوسرے دینی بھائی کی بات کو تحمل مزاجی اور بردباری سے سننا چاہیئے۔ اور اگر کسی دینی مسئلہ پر اختلافِ رائے ظہور پذیر ہو جائے۔ تو اسے اپنے بھائی یا بہن کی خدمت میں مدلل مگر پیارے انداز میں پیش کرنا چاہیئے۔ جیسے کہ میں اس وقت جناب ایس۔ اے رحمان صاحب اور پاکستان ٹیلیویژن اسلام آباد سے منسلک جناب لئیق احمد صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیونکہ لئیق صاحب کے ٹیلیویژن پروگرام کا موضوع بھی کچھ "اسلام اور پردہ نسواں" ہی تھا۔ اور اس پروگرام میں میرے دینی بھائی نے مجھے عورتوں کے موجودہ اندازِ پردہ کی حمایت کرنے کا تاثر دیا تھا۔ اور یہ پروگرام ٹیلیویژن لاہور پر ۱۳ اپریل والے مذکورہ پروگرام سے کچھ دن پہلے پیش ہوا تھا۔

جناب ایس۔ اے۔ رحمان صاحب اپنے مذکورہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میں نے قرآنی الفاظ" اِلَّا مَا ظَہَرَ مِنْہَا" اور حدیث رسولِ اکرمؐ کے حوالہ سے کہا تھا کہ عورت کا چہرہ اور ہاتھ اگر مستور نہ ہوں۔ تو یہ خلافِ شرع نہ ہوگا۔ اس بیان پر ان عزیز بہنوں نے (رفیقات اسلامی جمعیتِ طالبات) نے تند و تیز تنقید کی ہے"۔ چنانچہ جناب رحمان صاحب نے جواباً چند ایسے شواہد پیش کیے ہیں۔ جو بقول ان کے شاید بعض دیگر حضرات کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہوں۔ آپ نے سب سے پہلے خصوصیت سے سورۃ نور کی آیات نمبر ۳۰ اور ۳۱ کا حوالہ دیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنا نقطۂ نگاہ بیان کرنے کے لیے حدیث نبویؐ اور دیگر بزرگانِ دین کے حوالہ جات کا سہارا لیا ہے۔ جو بظاہر مدلل اور قابلِ توجہ ہیں۔ لیکن جن عزیز طالبات نے آپ سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا اپنا ایک واضح اندازِ فکر ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے اس معاملہ میں صحیح صورتِ حال تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کچھ مزید تحقیق کی

سعی کی جائے۔ لہذا سورۂ نور کی متذکرہ آیات مبارکہ کا قدرے تفصیلی جائزہ لینا مناسب رہے گا۔

ان آیات میں حکم خداوندی ہوا ہے کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں اپنی نگاہوں کو پست۔ یا کم۔ یا نیچی یا بند رکھا کریں۔ اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت بھی کیا کریں۔ نیز مسلمان عورتیں اپنی خوبصورتی یا زینت یا بناؤ سنگھار کو بھی ہرگز ظاہر نہ ہونے دیا کریں۔ ماسوائے اس زینت کے جو کہ ظاہر ہو ان عورتوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے گریبانوں پر اوڑھنیاں بھی ڈالا کریں۔ اور اپنی زینت یا خوبصورتی کو ظاہر نہ کیا کریں سوائے اپنے خاوندوں کے۔ باپوں کے۔ اپنے بیٹوں کے۔ اپنے بھائیوں کے۔ اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے۔ اپنی بہنوں کے بیٹوں کے۔ اپنی بی بیوں (یعنی اپنی میل جول کی مسلمان عورتیں) کے۔ جن کے مالک ان کے داہنے ہاتھ ہوئے۔ ایسے (ملازم) مردوں کے جو جنسی خواہش رکھنے والے نہ ہوں۔ ایسے کم سن لڑکے جو عورتوں کی چھپی باتوں سے ابھی لاعلم ہوں۔

مزید حکم ربانی ہے کہ عورتیں (چلتے وقت) اپنے پاؤں کو زمین پر زور سے نہ ماریں کہ اس سے ان کی چھپی ہوئی زینت یا خوبصورتی ظاہر ہو۔ اور مسلمان مرد اور عورتیں سب اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں تاکہ فلاح پائیں۔

آیات کے مندرجہ بالا معانی پر غور کرنے سے سمجھ آتا ہے کہ نگاہوں کو پست یا کم صرف اس وقت یا صرف اُس حد تک ہی کیا جا سکتا ہے۔ جس حد تک کہ وہ بند رکھی جائیں۔ اور جس وقت نگاہیں نیچی کی جاتی ہیں۔ تو نگاہ کا رخ بھی اُن کے ساتھ ہی بدل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان مرد کی نگاہ جب کسی عورت (مسلم یا غیر مسلم) اور مسلمان عورت کی نگاہ جب کسی مرد (مسلم یا غیر مسلم) پر پہلی مرتبہ پڑ جاتی ہے اور اس کے بعد پلٹ جاتی ہے تو بحالی اس وقت تک بھی پیدا ہو جاتی ہے جس وقت نگاہوں کو نیچا کر لیا جاتا ہے یا ان پر [illegible]

دیا جائے۔ قرآنی آیات مذکورہ میں مسلمان مردوں کے لیے لفظ "یَغُضُّوا" اور مسلمان عورتوں کے لیے "یَغْضُضْنَ" کو انہی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں مزید یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نگاہوں کو پست یا نیچی رکھنے کا حکم خداوندی صرف مسلمان عورتوں کو ہی نہیں ہے۔ بلکہ مسلمان مردوں کو بھی اسی شدت سے دیا گیا ہے۔ اب اگر ہم اس مقام پر بغیر کسی شعوری یا غیر شعوری تعصب کے غور کریں۔ تو صاف عیاں ہوتا ہے کہ قادرِ مطلق نے دونوں مرد اور عورت کے لیے نگاہوں کا پردہ کرنے کی پابندی عائد فرمائی ہے تاکہ یہ دونوں نہ تو ایک دوسرے کو دیکھیں۔ اور نہ ہی اس طرح ایک دوسرے کے لیے شہوت کا رجحان پیدا کرنے کا موجب بنیں۔ اور شہوت و بدکاری کے رجحان کا قلع قمع کرنے کے لیے مسلمان عورتوں پر مزید یہ پابندی بھی عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنی زینت و خوبصورتی کو نہ صرف ان تمام مردوں سے چھپائیں۔ جن کے بارے میں یہ مذکورہ حکم دیا گیا ہے بلکہ اپنی ہم جنس ان عورتوں سے بھی اپنی زینت کو چھپائیں۔ جو غیر مسلم ہوں تاکہ یہ غیر مسلم عورتیں ان کی زینت کو اپنے غیر مسلم مردوں میں جاکر بیان نہ کرسکیں۔ مزید پابندی یہ بھی عائد کی گئی ہے کہ مسلمان عورتیں زمین پر زور سے پاؤں مار کر بھی نہ چلا کریں تاکہ اس وجہ سے کہیں ان کی چھپائی ہوئی زینت ظاہر نہ ہو جائے۔ اور یہ چھپی ہوئی مذکورہ زینت عورت کے پاؤں۔ پاؤں کے زیور یا اس کی پنڈلی ہو سکتے ہیں۔ اگر عورت کے پاؤں بھی زینت ہیں۔ اور انہیں بھی مردوں سے چھپانے کا حکم الٰہی صادر ہے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عورت کا چہرہ۔ اس کی آنکھیں۔ سر کے بال۔ چہرے کے نقش و نگار اور چہرے کا بناؤ سنگار پاؤں کی زینت کے مقابلہ میں کم زینت کے حامل ہیں؟

چونکہ احکامِ الٰہی کا اس دنیا میں لوگوں کی عملی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ اس لیے عورت کی زینت کے بارے میں ایک تقریباً تیس سال پرانا واقعہ تحریر کرنا چاہتا ہوں تقریباً دوپہر کا وقت تھا۔ لاہور میں ایک محترمہ کالا برقعہ اوڑھے اکیلی تانگے پر سوار کہیں جا رہی

تھیں کہ ایک نوجوان سائیکل سوار کا تانگے کے قریب سے گزر ہوا۔ تو اس نے محترمہ کے گورے گورے ہاتھوں اور پاؤں کا جائزہ لیا۔ اس وقت سڑکوں پر ٹریفک خالی خالی تھی پھر کیا تھا۔ وہ نوجوان اپنا راستہ چھوڑ محترمہ کے تانگے کا پیچھا کرنے لگا۔ آخر جب محترمہ کو احساس ہوا کہ یہ کم بخت کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ تو انہوں نے اپنا نقاب اٹھا کر جھنجھلاتے ہوئے کہا کہ بے حیا، مجھے دیکھ لے۔ میں تو عمر میں تیری ماں کے برابر ہوں۔ جواب میں وہ یہ کہتا ہوا سائیکل پر بھاگ گیا کہ "میں بھی تو اپنے والد کے لیے ہی تلاش کر رہا ہوں"۔

چونکہ ایس۔ اے۔ رحمان صاحب ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ اور شاعروں اور ان کے کلام سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اپنے علم کی مدد سے کیا وہ قوم کی مناسب راہنمائی کے لیے یہ بتائیں گے کہ ہماری اردو شاعری اور ادب میں عورت کے حسن و زینت کا مرکز جسم کا کون سا حصہ مانا گیا ہے۔ اس کے چہرہ۔ آنکھوں اور بالوں کو سینہ کو یا عورت کے پاؤں کو۔ اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ عورت کی اصل خوبصورتی یا زینت اس کے صرف چہرے اور آنکھوں ہی سے سب سے زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ اور اسی بنا پر عورت اپنے چہرے کے بناؤ سنگار پر سب سے زیادہ توجہ دیتی ہے۔ تو پھر ہمیں چار و ناچار اس نتیجہ پر بھی پہنچنا پڑے گا کہ مندرجہ بالا آیات میں حکم الٰہی کی رو سے مسلمان عورتوں کو اپنے جسم کے سب سے زیادہ زینت والے حصوں کو ضرور چھپانا ہوگا۔ اس وجہ سے میری دانست میں حکم خداوندی کے تحت "اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا" کا اطلاق چہرہ پر نہیں ہے۔ چونکہ عورت کے لباس سے بھی اس کی زینت کے نمایاں ہونے کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لیے آیت کے ان مذکورہ الفاظ کا اطلاق عورت کے لباس پر ہوتا ہے۔ جس میں چہرہ کو ڈھانپنے والا کپڑا بھی شامل ہے جس کی وضاحت سورۃ نور پر تفسیر ابن کثیر میں ابو داؤد اور ترمذی کے حوالہ سے صفحہ نمبر ۵

پر یوں درج ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت ام سلمہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیٹھی تھیں کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں تشریف لے آئے یہ واقعہ پردے کی آیتیں (جن میں "الا ما ظہر منہا" بھی شامل ہے) اُترنے کے بعد کا ہے۔ حضورؐ نے ان بزرگ خواتین سے فرمایا کہ آپ پردہ کرلیں لیکن انہوں نے جواباً عرض کیا کہ یا رسول اللہ حضرت عبداللہ بن مکتومؓ تو نابینا ہیں نہ ہمیں وہ دیکھیں گے اور نہ ہی پہچانیں گے۔ اس پر رسول پاکؐ نے فرمایا کہ تم تو نابینا نہیں ہو کہ انہیں نہ دیکھو۔ اس حدیثِ مبارکہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ عورتوں کے لیے لازم ہے کہ وہ نگاہوں کا بھی پردہ کریں۔ تفسیر ابن کثیر جس کا حوالہ خود جناب ایس۔ اے۔ رحمان صاحب نے اپنے متذکرہ مضمون میں دیا ہے۔ اس میں مزید یہ بھی درج ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ عورتیں اپنی زینت ظاہر نہ کریں یعنی بالیاں ہار۔ پاؤں کا زیور وغیرہ۔ آپ فرماتے ہیں کہ زینت دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہ ہے، جسے خاوند ہی دیکھے جیسے انگوٹھی کنگن وغیرہ اور دوسری زینت وہ ہے، جسے غیر بھی دیکھیں، جیسے اوپر اوڑھنے کا کپڑا۔

اگرچہ کہ پردہ کی حیثیت اسلامی نقطہ نگاہ سے اب تک کافی واضح ہو چکی ہے لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ پر مزید روشنی حاصل کرنے کے لیے کچھ دوسرے پہلوؤں سے بھی کچھ اور تحقیق کر لی جائے۔ اللہ تعالیٰ سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۳۳ میں مسلمان عورتوں (جن میں ازواج مطہرات بھی شامل ہیں) سے ارشاد فرماتا ہے۔ کہ تم اپنے گھروں میں ٹکی رہو، اور پہلی جاہل عورتوں کی طرح بناؤ سنگار مت کرو۔ بلکہ تم نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو۔ کیونکہ اللہ نے ارادہ کیا ہے کہ تم سب گھر (میں رہنے) والوں کی پلیدی دور کرے۔ اور تمہیں خوب پاک و صاف کرے اس آیتِ مبارکہ کا مطلب کچھ یوں لگتا ہے کہ جو عورتیں اپنے گھروں میں نہیں ٹکتیں۔ بلکہ کسی نہ کسی

بہانے گھر سے باہر رہتی ہیں۔ اور بناؤ سنگار بھی خوب کرتی ہیں۔ وہ جاہل ہیں۔ اور جو مسلمان عورتیں گھر پہ رہتی ہیں۔ اللہ ان کی نماز زکواۃ اور گھر پہ رہنے کی وجہ سے ان کی پلیدی کو دور کرنے اور انہیں بہت پاک وصاف کرنے کا ارادہ فرماتا ہے۔ اور یہ سب اللہ کے مہربان اور خوش ہونے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔ اس آیت سے جو دوسرا پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ جو عورتیں گھر پہ نہیں رہیں گی اور اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر مختلف تقریبات میں شرکت اور دیگر کم اہم مصروفیات میں گزار دیں گی وہ پلید رہیں گی اور پاک وصاف نہ ہو سکیں گی اگر اس لحاظ سے اپنے موجودہ معاشرے کا جائزہ لیا جائے تو کیا یہ مشاہدہ نہیں ہوتا کہ گھر سے باہر دنیا میں مرد کو عورت کے قریب آنے کے جتنے زیادہ مواقع ملتے ہیں سگمنڈ فرائڈ کی جنسی نفسیات کے مطابق اتنا ہی زیادہ جنسی تعلقات کو قائم کرنے کا رجحان ان میں بڑھتا جاتا ہے۔ ہم نے مرد کو عورت سے اپنی رسوائی و درگت کرواتے بار بار دیکھا ہے۔ وہ طمانچے کھاتا ہے اور جوتے بھی۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ ان باتوں سے کوئی نیک سبق سیکھے، وہ گھات میں رہتا ہے اور جب اس کا داؤ لگتا ہے۔ تو وہ نہایت کم عمر بچیوں کو بھی اپنی ہوس کا شکار بنانے سے گریز نہیں کرتا۔ اور بعد میں کئی ایک معصوم بچیوں کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیتا ہے۔ آج کل ایسے متعدد واقعات پاکستان میں رونما ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب بھی عورت مرد کے قریب آئے گی اور اس کے ہتھے چڑھے گی تو پلیدگی ضرور پیدا ہوگی۔ اگر ہم واقعی تعلیم یافتہ۔ مہذب اور ترقی پسند بننا چاہتے ہیں تو ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری تہذیب و ترقی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ ہم حقیقتاً" نیک مسلمان بن جائیں۔ اور ہماری سوچ کی سمت صحیح ہو تاکہ ہم یہ سمجھ سکیں کہ اللہ جس پلیدگی کو ہمارے گھروں سے دور کر کے ہمیں پاک وصاف بنانا چاہتا ہے اس کی ضرورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی عورتوں کو اتنی نہ تھی، جتنی کہ موجودہ پلیدگی کے دور کی عورتوں کو ہے۔ اس لیے نہایت ضروری ہے کہ ہماری مسلمان عورتیں اپنا زیادہ سے

زیادہ وقت اپنے گھروں میں گزاریں۔

اللہ تعالیٰ کو بے حیائی قطعاً ناگوار ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر عورت کی بے حیائی ثابت ہو جائے تو اس کو گھر میں بند رکھو۔ اور آئندہ اسے کبھی گھر سے باہر نہ جانے دو۔ اس سے بھی واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو حکیم و بصیر ہے کے نزدیک عورت کو بے حیائی سے روکنے اور اسے مرد کی زد سے دور پاکباز رکھنے کا موثر ترین طریقہ یہی ہے کہ عورت اپنے گھر میں ٹکی رہے۔ بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ انہیں مناسب تربیت دے۔ اور گھر کے معاملات میں ضروری دلچسپی لے۔ مرد کے بارے میں اسی آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ اگر مرد کی بے حیائی ثابت ہو جائے تو اس کو اتنی ایذا دی جائے کہ وہ توبہ کر لے۔ اور نیکی پر آ جائے اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ عورتوں کو ایذا دینے کے حق میں نہیں ہے۔ انہیں ایذا سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ مزید سورۃ نور کی آیت نمبر ۲۳ میں مسلمان مردوں کو سخت تنبیہ فرماتا ہے کہ جو لوگ نیک پاک دامن اور بھولی بھالی عورتوں پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں۔ وہ دنیا اور آخرت میں ملعون ہیں۔ اور ان کے لیے آخرت کا بھاری عذاب ہے۔ اسی طرح سورۃ النساء کی آیت ۱۲۸ میں اللہ حکم دیتا ہے کہ اگر عورت اپنے خاوند سے ڈرے اور اس سے لڑنا جھگڑنا پسند نہ کرے تو دونوں صلح کر لیا کریں۔ کیونکہ صلح ہی ان کے لیے بہتر ہے۔

دراصل ہمارا دین مسلمان عورت کو اپنے معاشرہ میں ایک نہایت پاک و صاف اور بلند مقام عطا کرتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ ارشادِ نبویؐ ہوتا ہے کہ مسلمان مرد کی جنت اس کی ماں کے پاؤں تلے ہے۔ اور ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جنت عرش معلیٰ کے نیچے ہے۔ کیا اس طرح ماں کا تقدس و احترام عرش الٰہی کی بلندیوں کو جا چھوتا ہے؟ عورت نے ماں بن کر ہزاروں پیغمبروں۔ لاکھوں اور کروڑوں

صدیقوں۔ شہیدوں اور صالح لوگوں کو جنم دیا ہے۔ اور ان کی اپنے اپنے گھروں میں پرورش کی ہے اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کرنے کا شرف حاصل کیا ہے عورت پر ربِ ذوالجلال کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ عورت اپنے مہربان خالق کا جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم ہے۔ اور اس وجہ سے اس کی جتنی بھی اطاعت و بندگی کرے۔ وہ بھی کم ہے۔ اصل بات درحقیقت کچھ یوں لگتی ہے کہ اشرف المخلوقات کی حیثیت سے انسان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک عظیم ظہور ہے جس میں یہ عورت اس اہم ترین تخلیق میں ایک نہایت نمایاں کردار ادا کرنے کے لیے اس مادی دنیا میں سب کے مقام پر منتخب ہوئی ہے۔ لہذا ماں کے پیٹ میں بچہ اپنی تخلیق کے تمام مراحل طے کرتا ہے۔ اور بچے کے جسم کا ہر حصہ عورت کے خون سے نشوونما پاتا اور تکمیل کو پہنچتا ہے اور پھر بچہ جونہی جنم لیتا ہے۔ تو وہی سرخ خون اب ماں کے سفید دودھ میں تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے ذرا ہی پہلے اسی سرخ خون سے بچے کے سر کے کالے یا سنہری بال بنے تھے۔ اور چمکتے ہوئے سفید دانت اور کالی نیلی یا سبز مائل آنکھیں بھی اسی کا کرشمہ ہیں۔ جدید طبی سائنس یہ تسلیم کرتی ہے کہ بچہ کی اوائل عمر میں ماں کا دودھ بچے کے لیے بہترین مکمل غذا ہے لیکن کہنا پڑتا ہے کہ قدرت کے اس تخلیقی کرشمے کو سمجھنے سے انسانی عقل عاجز ہے۔

انسانی جسم کی ساخت کو سمجھنے اور صحت کو برقرار رکھنے کے لیے جدید طبی سائنس بہت کوشش کر رہی ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے متعدد طبی ماہرین پیدا کر لیے ہیں۔

مثلاً ماہرِ امراضِ چشم۔ ماہرِ امراضِ ناک و کان۔ ماہرِ امراضِ دانت، ماہرِ امراضِ دل۔ ماہرِ امراضِ سینہ۔ ماہرِ امراضِ جلد۔ ماہرِ امراضِ بچگان۔ ماہرِ نفسیات وغیرہ وغیرہ چنانچہ اب جدید علمی رجحان کے تحت انسانی جسم بے شمار حصوں میں بظاہر تقسیم ہو کر

ان ماہرین میں بانٹ دیا گیا ہے۔ لہٰذا جہاں اتنے ماہرین نے جدید علوم کے تقاضے کی بنا پر جنم لیا ہے۔ وہاں اگر ماہرین کی مزید ایک اور قسم اسی تقاضے کے تحت پیدا کر دی جائے۔ تو کیا حرج ہے کم از کم یہ نئے ماہرین اپنے معاشرہ کو تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ رکھنے کی غرض سے ضرور آگاہ کریں گے کہ کیا ہمارے معاشرہ میں "گھر" بچوں کی ضروری نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لیے ایک اہم ابتدائی ادارہ کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں اور اگر رکھتا ہے تو اس میں عورت کا بطور بچوں کی ماں کے اور بحیثیت بیوی کے کیا کردار ادا کرنا متعین ہوتا ہے۔ کیونکہ جس روش پر مغربی و اشتراکی نظریات انسان کو چلنے پر اکساتے ہیں۔ وہاں خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ جہاں عورتوں کے لیے مردوں کے مساوی حقوق طلب کئے جاتے ہیں تاکہ عورتیں گھر چھوڑ کر آزادی سے دفتروں اور فیکٹریوں میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر سکیں۔ وہاں اگر کل اسی ضمن میں یہ مطالبہ بھی سر اٹھائے کہ آئندہ سے مساوی عرصہ کے لیے مرد عورتوں کی مانند گھر کی دیکھ بھال کیا کریں گے بچے جنا کریں گے۔ اور اپنے دودھ پر ان کی پرورش بھی کیا کریں گے اور اس عرصہ میں عورت روزی کما کر گھر کے اخراجات کا ذمہ لے گی۔ ایسی صورت حال یقیناً سنجیدہ لوگوں کے لیے بظاہر بے معنی و مضحکہ خیز ہوگی۔ لیکن اگر غور کریں تو ایسی فکر رکھنے والے حضرات اسی مضحکہ خیز مطالبے سے صرف ایک آدھ قدم ہی دور ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ سائنس اور ترقی کے نام پر عورت مرد بن جائے۔ اور مرد عورت شاید ظاہرہ شکل صورت اور لباس کی حد تک وہ اس کوشش میں کچھ کامیاب ہو جائیں لیکن اس طرح وہ قانونِ قدرت ہرگز نہ بدل سکیں گے۔

دراصل یہ تمام گڑبڑ اس وقت پیدا ہوئی جس وقت کہ سگمنڈ فرائڈ نے مغربی دنیا کو اپنا نفسیاتی نظریہ یہ دیا۔ کہ انسان میں سب سے غالب خواہش جنسی تعلقات کی ہے اور اگر یہ دب جانے کی بجائے آسانی سے پوری ہوتی رہے تو مرد اور عورت

کی زندگی میں توازن۔ اطمینان اور سکون پیدا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغرب نے اپنی تمام اخلاقی قدروں کو پامال کیا۔ اور عورت کی تمام انسانی اور اخلاقی قدروں سے آزادی کا ڈنکا نام نہاد مغربی تہذیب و تعلیم اور ترقی کے نام پر بجایا۔ اس طرح مکار مرد نے عورت کے ارد گرد اپنی چکنی چپڑی باتوں اور خوشامد پرستی کا ایسا جال بچھایا کہ وہ بیچاری اس میں جکڑ کر رہ گئی۔ اور وہ تقدس کے بلند مقام سے گناہ کی گہرائیوں میں گرا دی گئی۔ جگہ جگہ نائٹ کلب کھل گئے۔ اور زنا اور شراب خوری ایک وسیع پیمانے پر روزمرہ کا معمول بن گئے یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ انسان خدا کو بھول چکا تھا۔ اور اپنی جاہلیت کی بنا پر وہ آج بھی ضروری اطمینان و سکون حاصل کرنے کے لیے بھٹکتا پھر رہا ہے۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ سکونِ قلب فدرت کی پابندیاں توڑنے سے نہیں بلکہ اللہ سے لگاؤ لگانے اور سجدہ ریز ہونے سے ملتا ہے۔ اس لیے مسلمان مغرب کی اندھی تقلید کس طرح کر سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سو سال پہلے جب ہم انگریز کے محکوم تھے۔ ہم نفسیاتی طور پر احساس کمتری کا شکار ہو گئے۔ ہم اپنی اسلامی اقدار کو خیر باد کہتے ہوئے اپنے انگریز حاکموں کے نقشِ قدم پر چلنا چاہتے تھے ہم چاہتے تھے کہ چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کرتے ہوئے ہم اپنے حکمرانوں کی طرح مہذب، تعلیم و ترقی یافتہ سمجھے جائیں۔ اور اس وقت کی سوسائٹی میں کچھ مقام حاصل کر سکیں۔ لیکن آج صورت حال بدل چکی ہے۔ ہم آزاد ہیں، سنبھل چکے ہیں تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے بخوبی جانتے ہیں کہ دین کی رو سے کیا برا ہے اور کیا بھلا۔ اب ہم اپنی عملی زندگی سے تمام تضاد ختم کر دیں گے تاکہ ہم احکام الٰہی کے مطابق زندگی گزار سکیں۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان پر اس کے ماحول کا اثر ضرور ہو کر رہتا ہے۔ اس لیے نفسیاتی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ایک مرد اگر عورت کے چہرہ کو قریب سے کچھ دیر دیکھے اور وہ کسی انداز میں اس کی زینت سے متاثر نہ ہو۔ لوگ تو شخص عورت

کی تصویر کو دیکھ کر ہی اچھے خاصے متاثر ہو جاتے ہیں۔ جو شخص جتنا زیادہ پڑھا لکھا ہو گا۔ اتنا ہی زیادہ وہ ذہین اور حساس ضرور ہو گا۔ عام حالات میں وہ عورت کے حسن و جمال کا ضرور جائزہ لے گا۔ اسے "چاند سا مکھڑا" بھی نظر آئے گا۔ اور وہ پہلی نظر کے تیر سے گھائل ہونا بھی ضرور پسند کرے گا۔ وہ عورت کو اپنے ذہن کے شیشہ میں اتاریگا۔ چاہے اس طرح وہ محض ذہنی عیاشی تک ہی خود کو محدود رکھے۔ یا پھر اسے اپنے جال میں پھنسانے کے لیے وہ کوئی واضح لائحہ عمل تیار کرے۔ چونکہ ہم مسلمان ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو قادرِ مطلق مانتے ہوئے اس کے آگے سجدہ ریز بھی ہونا چاہتے ہیں۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ ہم مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے ہدایت حاصل کرنے کی سعادت حاصل کریں۔

سورۃ بقرہ کی آیت ۲۸۱ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ (لوگو) ڈرو اس دن سے جب تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اس آیتِ مبارکہ میں ہمیں یہ ذہن نشین کرایا جا رہا ہے کہ ہم یہ بات ہرگز نہ بھولیں کہ ہمیں ایک دن ضرور اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ اور اپنے اس دنیا کے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس لیے ہمیں تمام کوششیں جو کہ ہم دین کو اپنی خواہشات کے تابع کرنے کے لیے کریں گے۔ رائیگاں جائیں گی۔ اس کے بعد سورۃ بقرہ کی آیت ۲۸۴ میں ارشاد ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر شے، اللہ کی ملکیت ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے تم ظاہر کرو یا چھپاؤ۔ اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے سزا دے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے اسی انداز میں ایک اور مقام پر ارشادِ ربانی ہے کہ اللہ ہر شخص کو اس کے دل کی کمائی پر پکڑے گا۔

ان مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ اللہ لوگوں سے شدت سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے ساتھ ساتھ اپنے افکار میں بھی پاکباز ہوں۔ ان کی سوچ نیک

اور تعمیری ہو، کیونکہ ہر عمل کے ظہور پذیر ہونے کے لیے ذہنی سطح پر ویسی ہی سوچ کا پہلے سے موجود ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے جو سوچ اچھی و صالح ہوگی۔ تو اس سے جو عمل پیدا ہوگا۔ وہ بھی نیک اور صالح ہوگا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کے ظاہری اعمال سے زیادہ اہمیت اس کی سوچ۔ نیت اور اس کے باطن کی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہئیے کہ عورتوں کے پردہ کے متعلق ہمارا فیصلہ دین کے تقاضوں کے عین مطابق ہو اور ہم اپنے لیے ایسا اسلامی ماحول پیدا کریں جس میں مسلمان ذہنی اور عملی سطح پر پاکباز رہ سکیں۔ اس لحاظ سے اگر سوچا جائے۔ تو صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مرد اور مسلمان عورتوں کو ایک دوسرے سے جتنا زیادہ دور اور جتنا زیادہ علیحدہ رکھا جائے گا۔ اتنا ہی ہمارے لیے بہتر اور خیر کا باعث ہوگا۔ اور ایسا ماحول پیدا کرنا جاہل طبقہ کی نسبت تعلیم یافتہ طبقہ کی زیادہ ذمہ داری ہے۔

حدیث پاک

بروز قیامت جب اللہ تعالیٰ بے پردہ عورت کو دوزخ میں پھینکنے کا حکم دیں گے تو وہ عورت فریاد کرے گی یا اللہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے یہ قصور میرے باپ کا ہے جس نے اپنی بیٹی کو غلط راستے پہ چلنے سے منع نہیں کیا یہ قصور میرے بھائی کا ہے جس نے اپنی بہن کو بے پردہ پھرنے سے منع نہیں کیا یہ غلطی میرے خاوند کی ہے جس نے اپنی بیوی کو ننگے سر بازار پھرایا اور یہ غلطی میرے بیٹے کی ہے جس نے اپنی والدہ کو بے حیائی سے منع نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ان کو دوزخ میں لے جاؤ۔ مطلب یہ کہ ایک بے پردہ عورت اپنے ساتھ چار آدمیوں کو دوزخ میں لے جائے گی۔

جیسا کہ حدیث پاک میں ہے جو عورت پردہ نہیں کرتی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو بہت سخت سزا دیں گے اور اس کے ساتھ چار آدمیوں کو برابر کی سزا ملے گی بے پردگی عظیم گناہ ہے بے پردگی ہی عورت کو بے حیائی اور کئی گناہوں کی طرف کھینچتی ہے اس لئے ہر مسلمان عورت کا فرض ہے کہ وہ پردہ میں رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پردہ دار عورت پر خوش ہیں۔ جیسا کہ "اسلام میں پردہ کی حقیقت" میں جناب ڈاکٹر ارشد اللہ صاحب نے بے پردگی کے جو نقصانات بتلائے ہیں اس سے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ماں بہن بیٹی اور بیوی کو پردہ کرنے کی تلقین کرے۔ اور روز قیامت کو عذاب الٰہی سے بچنے کی کوشش کرے اور ہر عورت کا فرض ہے کہ وہ پردے میں رہے اور اپنی آخرت سنوار لے۔

محمد ارشاد اختر
مرکزی صدر جماعت غوثیہ
فاروق آباد۔ فیصل آباد

فرمانِ الٰہی

زمانہ گواہ ہے کہ انسان یقیناً خسارے میں ہے ماسوا اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے بھلے کام کئے۔ اور حق کی تلقین کی اور صبر کی تلقین کی۔

(سورۃ والعصر)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور اُن کے مال خرید لئے ہیں۔ اور اُس کے عوض میں ان کے لئے بہشت (تیار کی) ہے۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور مارتے بھی ہیں اور مارے جاتے ہیں (توبہ - ۱۱۱)

اے رسول! کہہ دیجئے کہ مجھے اللہ کی بندگی کا حکم ملا ہے اور یہ کہ اُس کا ساجھی نہ بناؤں۔ اُسی کی طرف میں بلاتا ہوں۔ اور اُسی کی طرف میرا ٹھکانا ہے

(رعد - ۳۶)

❀❀❀❀❀❀

ارشادِ نبوی

منصف حکمران کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ (طبرانی)

منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

۱. جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲. وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے۔

۳. اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو اُس میں خیانت کرے۔

قارئین حضرات کی خدمت میں گذارش

۱۔ اس کتاب کو دین کی خدمت کی سعی میں مسلمان بھائیوں میں مفت تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ اللہ تعالےٰ اس خدمت کو شرفِ قبولیت بخشے۔

۲۔ جو بھائی اس کتاب کو پڑھنے کے لئے بذریعہ ڈاک حاصل کرنا چاہیں۔ وہ رجسٹرڈ بک پوسٹ کیلئے موجودہ شرح کے مطابق دو روپے کا ڈاک کا ٹکٹ بمعہ اپنے مکمل پتہ کے بھیجیں۔

۳۔ جو بھائی اس کتاب کو پڑھ کر اس کی افادیت محسوس کریں۔ وہ اپنے تاثرات مصنف کو تحریر کر کے بھیجیں اور اپنے دینی و اخلاقی تقاضے کے تحت اپنے تمام خواندہ ملنے والوں کو بھی اس کتاب کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیں۔

۴۔ جو بھائی دین کی اس خدمت کو آگے بڑھانے کے لئے تعاون فرمانا چاہیں ان کا خیر مقدم کیا جائیگا اگر وہ چاہیں تو اپنے حصہ کی کتاب کی جلدیں خود اپنے حلقہ میں مفت تقسیم کریں۔ ناشران پابند ہوں گے کہ وہ کتاب کی جلدیں صرف قیمت تیاری پر فراہم کریں اور کسی قسم کا کوئی منافع حاصل نہ کریں۔

۵۔ اگر کوئی دینی بھائی کتاب کی کوالٹی برقرار رکھتے ہوئے اسے نسبتاً کم لاگت پر کسی دوسرے پریس سے تیار کروانا چاہے تو اس کی تجویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ایسا کرنے سے کتاب کے مسودہ میں قطعاً کوئی تبدیلی واقع نہ ہو اور کتاب مفت تقسیم کی جائے۔

۶۔ اگر کوئی بھائی اس کتاب کا انگریزی، فارسی یا عربی میں مستند ترجمہ کروا کر اُسے شائع کروانا چاہیں تو ان کی تجویز پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ ہم سب دینی بھائیوں کا فرض ہے کہ ہم مل جل کر اپنے پیارے دین کی صحیح خدمت خلوصِ دل سے کریں۔

ڈاکٹر ارشد اللہ (ہومیو)
۱۰۔ حسین شاہ سٹریٹ، پارک لین، ٹمپل روڈ۔ لاہور

۶۱ ۵۴۴

"اسلام، سوشلزم، جمہوریت اور پاکستان"

اگرچہ مندرجہ بالا مضمون ۱۹۶۸ء میں پہلے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا اور اب اس کو کتاب کے موجودہ پانچویں ایڈیشن میں اس کی اہمیت کی بنا پر شامل کیا گیا ہے۔ اس میں پاکستانی سیاستدانوں کی عمومی سوچ و فکر اور عمل کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ پاکستانی سیاست کس طرح اپنی گری ہوئی سطح سے اُبھرنے کا نام نہیں لیتی اور اپنے عمل میں شائستگی، افہام و تفہیم اور جذبۂ قومی و دینی اتحاد پیدا نہیں کرتی۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حالیہ بیانات کے تجزیہ سے بخوبی فراہم ہوتا ہے۔

مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۸۲ء کے "نوائے وقت" لاہور کے مطابق میاں طفیل محمد، امیر جماعت اسلامی پاکستان نے ملک کو موجودہ بحران سے نکالنے اور جمہوریت کی بحالی کے لئے قوم میں مکمل اتحاد پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر ہنگامہ آرائی اور تصادم کی فضا جاری رہی اور مختلف سیاسی جماعتوں اور گروہوں نے اپنا رویہ تبدیل نہ کیا تو خدشہ ہے کہ ہم جمہوریت حاصل کرتے کرتے اپنی قومی آزادی کھو دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم ایجی ٹیشن کی سیاست اور آپس میں تصادم سے گزشتہ ۳۵ سال میں نہ تو جمہوریت ہی حاصل کر سکیں ہیں اور نہ ہی بنیادی حقوق اور اسی شمارہ میں میر رسول بخش تالپور جو کہ آجکل سندھ میں سینیئر وزیر ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ تمام سیاستدان، جمہوریت کے قاتل ہیں۔ جن میں میں خود بھی شامل ہوں۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک برسرِ اقتدار حکومت نے جمہوری قدروں کو پامال کیا اور ۱۹۷۷ء میں جب موجودہ مارشل لا نافذ ہوا، تو انہی سیاستدانوں نے جنہوں نے نظامِ مصطفیٰؐ اور جمہوریت کی بحالی کے لئے تحریک چلائی تھی۔ مارشل لا کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے الزام عائد کیا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے باعث ملکِ عزیز دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

۲۵ اپریل ۱۹۸۲ء کے "نوائے وقت" لاہور میں مولانا عبدالستار خاں نیازی صاحب جنرل سیکرٹری ورلڈ اسلامک مشن کا بیان ہے۔ انھوں نے اخبارات کے دفاتر پر مسلح طلبا کے گروہ کے حملہ کی مذمت کرتے ہوئے حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا ہے کہ سارے ملک میں طلبا کی سرگرمیوں اور انتخابات پر پابندی عائد کر دی جائے اور اس بارے میں انھوں نے صدرِ مملکت اور گورنر پنجاب کو خط بھی ارسال کیا [illegible] ظاہر ہو رہی ہے کہ [illegible] آزادی کے [illegible] نے

مولانا نیازی صاحب کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اَب اصولی طور پر انتخابات کے بھی مخالف ہو جائیں حالانکہ جب ریٹائرڈ جسٹس کیکاؤس صاحب ۱۹۸۰ء میں اپنا کیس شریعت بنچ میں لے گئے تاکہ اسلامی نظام میں انتخابات کو کالعدم قرار دِلوا سکیں تو اُس وقت مولانا نیازی صاحب نے اُن کے مُوقف کی پوری پوری مخالفت کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انتخابات ضرور ہونے چاہییں۔ ۱۴ مئی ۱۹۸۲ء کے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے مطابق اُنھوں نے مزید فرمایا کہ غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ذاتی اثر و رسوخ، مکر و فریب، مکاری و عیاری، جعلسازی اور فریب دہی کے ناپاک ہتھکنڈوں سے کامیاب ہو کر اقتدار کے حصول کے لئے پارٹی بنا لے۔

مندرجہ بالا بیانات جو انتخابات کے بارے میں شامل کئے گئے ہیں۔ اس موضوع کو میں اپنے مضمون بعنوان "اسلامی نظام میں انتخابات، اُن کی گنجائش و شرائط" میں قرآن پاک کے حوالہ جات سے زیرِ بحث لایا ہوں۔ یہ مضمون کتاب کے صفحہ ۲۸۱ پر ہے۔ اس میں رقم شدہ خدشات کی ان مذکورہ بیانات سے بہت حد تک تائید تو ہوتی ہے، لیکن افسوس ان کی نفی نہیں ہوتی "نوائے وقت" لاہور کے ۲۴ اپریل ۸۲ء کے شمارہ میں ایک اور عالمِ دین ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بیان ہے کہ اگرچہ بظاہر جماعتِ اسلامی، جمعیت العلماء اسلام اور جمعیت العلمائے پاکستان سیاسی طور پر اسلامی نظام کے لئے کام کر رہی ہیں، لیکن ان کی ماضی کی سیاست سے ملک کو فائدہ کی بجائے نقصان ہوا ہے۔

تاہم اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن علامہ سید محمود احمد رضوی صاحب نے ۲۴ اپریل کے مذکورہ شمارہ میں حکومت کے کتاب "تاریخ تصوّف" کو ضبط کرنے کے فیصلہ پر اظہارِ اطمینان کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام علماء، مشائخ اور اہلِ سنت عوام اپنا مذہبی و ملّی فریضہ سمجھتے ہیں کہ تمام طبقات آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کریں۔ پاکستان کو اسلامی نظام کا گہوارہ بنانے میں حکومت سے تعاون کریں اور معاشرہ کی اصلاح کریں۔ کالعدم جمعیت العلماء اسلام کے امیر مولانا درخواستی صاحب نے "نوائے وقت" لاہور کے ۳ مئی ۱۹۸۲ء کے شمارہ کے مطابق مزید یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "غیر ملکی نظریات کے پرچار اور لادین عناصر علماء کو آپس میں لڑانے اور اسلامی نظام کو ناکام بنانے کے لئے مسلسل کوشش کر رہے ہیں۔ انتظامیہ کے بدعنوان افسر ہر سطح پر ایسے عناصر کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ اسلئے تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو اس صورتِ حال کا احساس کرنا چاہیئے"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام، سوشلزم، جمہوریت اور پاکستان

آج کل پاکستان میں اسلامی اشتراکی اور جمہوری نظامِ زندگی پر ایک اچھی خاصی بحث ہو رہی ہے
کیونکہ پاکستان اس بارے میں اپنے پچھلے تیس سالہ نظامِ زندگی کے دور کے ناکام و ناخوشگوار تجربات
کی روشنی میں اپنے لئے نظامِ زندگی کی نئی راہ متعین کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ غالباً سب
باشعور حضرات اتفاق کرینگے کہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد سب سے
پہلے مغربی جمہوریت کو بطور نظامِ حکومت اپنایا گیا۔ لیکن شومئی قسمت کہ قائدِ اعظم کی وفات کے
بعد ہماری مجموعی سیاسی ریشہ دوانیوں نے پاکستان میں جمہوریت کا جنازہ نکال دیا اور اسکی جگہ آمریت
نے لے کر ہماری سیاسی سوجھ بوجھ کا بھرم خاک میں ملا دیا اور جب آمریت میں بھی ہمیں ناکامی ہوئی
تو ان بگڑے ہوئے حالات کا فائدہ اٹھا کر ملک میں سوشلزم کو آزمانے اور کامیابی سے ہمکنار کرنیکی کوشش
کی گئی۔ مگر یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔

اس تمام تر بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ عوام الناس اور ان کے نام نہاد سیاسی
راہنماؤں کی اکثریت کے مزاج اور اندازِ فکر میں کبھی ہم آہنگی [illegible] نہ تھی۔ عوام بجا طور پر یہ توقع رکھتے
تھے کہ قائدِ اعظم کی بے مثال قیادت میں جو پاکستان اسلام
لازماً اسلام کی حکمرانی ہوگی۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ "قائدِ اعظم"
سبق دیے تھے ایک سیاست میں اپنے عوام سے
کی خلوصِ نیت سے خدمت کا حقیقی جذبہ۔ وہ
نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنے عوام سے ضرور الیفا۔
بلا تاخیر اور بلا روک ٹوک رائج ہوگا اور یہ بات جمہ
افسوس کہ ایسا قطعاً نہ ہوا۔ ہمارے بیشتر سیاسی لیڈ

سیاسی انتشار کا شکار ہونے لگے اور پاکستان کا اسلامی نصب العین ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ انہوں نے عوام سے اپنا لازمی رابطہ توڑ دیا اور اس کی جگہ ان لیڈروں نے ڈرائنگ روم کی سیاست کو اپنا لیا۔ یہ لیڈر شاید یہ سمجھتے تھے کہ عوام سوائے بھیڑ بکریوں کے ایک بے شعور ریوڑ کے زیادہ اہمیت و وقعت نہیں رکھتے جنہیں اپنے حصولِ مقصد کی خاطر جس طرف ضروری ہو، ہانکا جاسکتا ہے۔ لیکن تاریخ نے ہمیں ہماری ان سیاسی کوتاہیوں کا وہ بھیانک سبق دیا۔ جو ان حالات میں وہ عموماً دیا کرتی ہے۔

مشاہدہ ہے کہ جو سیاسی راہنما اپنے عوام کو کسی مقام یا مرحلہ پر دھوکہ نہیں دیتے۔ ان کے مطالبات اور امنگوں کی خاطر خواہ عکاسی کرتے ہیں، ان کی منزل اور اس کی سیدھی اور آسان راہیں بھی متعین کرتے ہیں۔ وہ اپنے عوام میں ضرور مقبول رہتے ہیں اور ان کا مکمل اعتماد اور بھرپور تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اگر اب ہم اپنی گزشتہ تیس سالہ زندگی پر مجموعی نظر ڈالیں تو مجبوراً ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو پاکستانی قوم ان لیڈروں کو قائداعظم سے ورثہ میں ملی تھی۔ وہ اسوقت جذبۂ اسلامی سے سرشار تھی۔ وہ اپنے نصب العین میں فردِ واحد کی طرح متحد تھی۔ اس میں اخوت تھی۔ محبت تھی۔ ایثار و قربانی کا مایۂ ناز اسلامی جذبہ رکھتی تھی۔ لیکن ہمارے سیاسی لیڈر قوم کی ان انمول خوبیوں سے فائدہ اٹھانے کی غالباً کوئی صلاحیت اپنے اندر نہ رکھتے تھے۔ ورنہ وہ ملک و قوم کی بے حد خدمت کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی لیڈری کو وہ چار چاند لگا کر دائمی بھی بنا سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس وقت کوئی سیاسی لیڈر عوام سے اپنا منہ موڑ لیگا اور ان سے اور ان کی ضروریاتِ زندگی سے بے نیاز ہو جائے گا۔ انہیں کہیگا کچھ اور عملی طور پر کریگا کچھ۔ تو ایسا لیڈر چاہے وہ بظاہر جمہوریت کا دم بھرے۔ آمریت کا یا سوشلزم کا۔ وہ کبھی زیادہ دیر کامیاب نہیں رہ سکتا۔ اُسے جلد یا بدیر مسندِ اقتدار سے ہٹنا ہی پڑیگا۔ کیونکہ جمہوریت یا سوشلزم کوئی ایسا الہ دین کا چراغ تو نہیں جو عوام کی تائید و حمایت اور عملی تعاون کے بغیر کوئی جادو کا کام کرسکے۔

میری سادگی کو یہ نادان سمجھا بھی تو کیا سمجھا

نظام نے اس کی جگہ لی۔ جمہوریت بظاہر انسان کی سیاسی زندگی کی عکاسی کرتی ہے اور سرمایہ داری معاشی زندگی کی۔ جمہوریت بظاہر انسان کو انفرادی آزادیٔ فکر، عمل اور تحریر و تقریر کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ اس کے بقول عوام پر عوام کی حکمرانی عوام ہی کی خدمت کے لئے ہوتی ہے۔ بظاہر یہ عوام میں طبقاتی تفریق کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔ بلکہ اکثریت عوام کے ہر فیصلہ کو خندہ پیشانی اور بلا کسی مزاحمت کے قبول کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا معاشی نظام سرمایہ دارانہ ہے۔ جس میں ہر فرد کو اپنی ذاتی قابلیت اور صلاحیتوں کے مطابق پھلنے پھولنے ترقی کرنے اور اپنی محنت سے دنیا کے مادی وسائل حاصل اور جمع کرنے کی اجازت ہے۔ بظاہر یہ نظام خاصا اچھا ہے اور لوگوں میں انفرادی طور پر صحت مند باہمی مقابلہ کے رجحان کو فروغ دیتا ہے اور ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ بشرطیکہ اس نظام میں ضروری توازن قائم رہے اور اس نظام کی بدولت جو سرمایہ دار طبقہ معرضِ وجود میں آئے۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کے نچلے غریب طبقے پر خود کو مسلط نہ کرے ان کو اپنا غلام نہ بنا لے اور ان کا کسی انداز میں استحصال نہ کرے۔ بلکہ از خود اپنی رضا و محبت سے ان کو بھی ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرے چونکہ یہ مذکورہ بالا توازن پیدا کرنے کے لئے عوام کا نہایت باشعور۔ بااخلاق اور اپنی اس بارے میں اہم ذمہ داریوں سے شناسا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس لئے عام طور پر جمہوری نظام میں اس توازن کا حصول عملی طور پر بے حد مشکل یا تقریباً ناممکن ہے۔ لہٰذا اکثر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ اس نظام میں امیر غریب کو اپنا آلۂ کار بنا کر خود امیر تر ہو جاتے ہیں اور بے چارہ غریب روٹی، کپڑا اور مکان کے حصول کے چکر میں ہی مبتلا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظام کی بعض واضح خامیوں نے سوشلزم کو کارل مارکس کے زمانہ میں جنم دیا اور اس نئے نظریئے نے غریب مزدوروں اور کسانوں کو منظم کر کے سرمایہ دار کے خلاف شروع میں صف آرا کر دیا۔

جمہوری نظامِ حکومت میں چونکہ اکثریت رائے عامہ ہی درحقیقت سب معنی اور

اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے عوام الناس کی اس رائے کو معلوم کرنے کیلئے عام انتخابات خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جس ملک کے عوام نہایت باشعور۔ بااخلاق اور حب الوطن۔ ذمے دار اور باصلاحیت ہوں۔ وہاں انتخابات کی یہ نہایت مشکل اور اہم ذمہ داری خوش اسلوبی سے سرانجام پا جاتی ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں اور اس کی بدولت ملک و قوم کو ترقی و استحکام نصیب ہوتا ہے۔ لیکن جہاں عوام و خواص ان مذکورہ مگر ضروری اوصاف کے پوری طرح مالک نہ ہوں اور انہیں ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر پورا عبور حاصل نہ ہو۔ وہ ملک کو درپیش اندرونی یا بیرونی خطرات کا احاطہ کرنے سے قاصر یا بے نیاز ہوں۔ وہاں عام انتخابات بعض دفعہ نہایت بھیانک و مضر نتائج سے ملک کو دوچار کر دیتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے جب عام انتخابات منعقد ہوئے تو اس جمہوری عمل کے ظہور پذیر ہونے کی بدولت ملک کو استحکام ملنے کی بجائے ملک کا آدھا حصہ پاکستان سے علیحدہ ہو گیا اور اس کے بعد جب ۱۹۷۷ء میں دوبارہ عام انتخابات ہوئے۔ جنہیں اگر انتخابات کم اور دھاندلی زیادہ کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا تو اس کے نتیجے میں ملک کو وسیع پیمانے پر ہونے والی متوقع خون ریزی اور معاشی تباہی سے بچانے کے لیے مارشل لاء لگانا پڑا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مذکورہ بالا پچھلے دونوں عام انتخابات میں پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ ایسی صورتِ حال کی موجودگی میں سانپ کا ڈسا ہوا اگر بے ضرر رسی سے ڈرنا شروع نہ کرے تو اور کیا کرے؟ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ ہمارے ملک کا اعلٰے تعلیم یافتہ طبقہ۔ ہمارے ادیب اور دانشور ہمیں آج تک صرف یہی باور کراتے رہے ہیں کہ انتخابات ایک ضروری جمہوری عمل ہے۔ جس کے ظہور پذیر ہونے سے ملک و قوم دونوں کو لازماً استقامت و تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کیا کہیں بات ایسے تو نہیں ہے کہ ان عام جمہوری انتخابات کے کچھ ضروری لوازمات

بھی ہوتے ہیں اور ان لوازمات کے اپنے ملک کے عوام و خواص سے کچھ ضروری تقاضے بھی ہوتے ہیں، جنہیں اگر مناسب طور پر پورا نہ کیا جائے تو فائدہ ہونے کی بجائے سنگین قسم کے نقصانات سے پالا پڑتا ہے۔ میری دانست میں ملک کا باشعور تعلیم یافتہ طبقہ اگر محب وطن اور اعلیٰ اخلاقی اور دینی قدروں کا حامل نہ ہو اور وہ قوم کی صحیح اسلامی خطوط پر تعمیری راہنمائی نہ کرے۔ تو عوام اکثر و بیشتر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ ملکی معاملات میں مناسب شعور نہ رکھنے کے باعث مختلف اور ایک دوسرے سے متصادم نظریات اور نعروں کو اپنا کر ان میں بُری طرح اُلجھ جاتے ہیں۔ انہیں ملک کے تمام اہم امور پر شاذ و نادر ہی خاطر خواہ عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہ اکثر یہ احساس بھی نہیں کرتے کہ انتخابات کی مقدس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے عوام کا محب وطن اور انصاف پسند ہونا کتنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ انتخابات میں کسی طرح کی دھاندلی ہرگز نہ کریں۔ انتخابی قوانین کا پورا پورا احترام کریں اور اکثریت کے فیصلے کو خندہ پیشانی سے قبول کریں۔ ایک دوسرے کا احترام ملحوظ خاطر رکھیں۔ اور آپس میں بھائیوں کی مانند باہمی راہ و رسم کو قائم رکھیں۔ اگرچہ جمہوری معاشرہ میں ملک کے متعلق اہم ترین بنیادی فیصلے کرنے کی ذمہ داری تو بچارے عوام پر ڈال دی جاتی ہے تاکہ ان میں اہم ملکی معاملات پر عبور حاصل کرنے کی نہ کوئی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے اور نہ ہی ان میں باہمی اعتماد۔ اتحاد۔ تعاون اور حبُ الوطنی کے جذبات کو پروان چڑھانے کیلئے کوئی تعلیم یافتہ طبقہ ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ لہٰذا جس معاشرہ میں یہ صفات جتنی زیادہ مفقود ہوں گی۔ اتنا ہی زیادہ ووٹ کا تقدس مجروح ہونے کا خطرہ موجود رہے گا! اور انتخابات کے بظاہر ایک اچھے عمل سے اتنا ہی زیادہ ملک و قوم کو نقصان پہنچے گا اور پاکستان کے پچھلے دونوں عام انتخابات میں بظاہر کچھ ایسا ہی ہوا۔

جمہوریت کے علمبردار ممالک اپنے عوام کو اخلاقی سطح پر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرانے کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لئے قطعاً کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اس کے

علاوہ وہ اپنے معاشی نظام میں بھی غریب عوام سے پورا انصاف کرنے سے حتی الوسع گریز کرتے ہیں۔ اس لیئے وہ ہمیشہ سوشلزم کے چیلنج سے دوچار رہتے ہیں۔ اس لیئے اگر وہ چاہتے ہیں کہ جمہوریت توانا رہے اور سوشلزم پر غلبہ حاصل کرے تو ان کے لیئے اپنے جمہوری نظام سے تمام ممکنہ خامیوں کو بمعہ واٹر گیٹ سکینڈل جیسی خامی کو دُور کرنا ناگزیر ہوگا۔ ورنہ پاکستان جیسے ترقی پذیر و پسماندہ ممالک کو انتخابات میں ہونے والی اَن گنت گھناؤنی دھاندلیوں کو بے نقاب کرنے کے لیئے حکومتی سطح پر ضخیم قرطاس ابیض بھی بعض اوقات شائع کرنا پڑینگے۔ اس میں چنداں شک نہیں کہ موجودہ غیر سیاسی عارضی فوجی حکومت نے قرطاسِ ابیض شائع کرکے اپنی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اس کی اشاعت سے بیرونی دنیا کو یہ بھی معلوم ہوگیا ہوگا کہ مملکتِ اسلامیہ پاکستان کے بعض لوگ مسلمان ہونیکا دعویٰ کرتے ہوئے کس قدر ڈھٹائی اور بیباکی سے ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اخلاقی اور اسلامی قدروں کو پامال کرتے ہوئے ذرا بھی تامل نہیں کرتے۔ بات بات پر جھوٹ بولنے سے ان کے ضمیر پر ظاہرہ کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔ اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ انہیں یہ سب جھوٹی اقدار مادہ پرست مغربی تہذیب و فکر سے وافر ملی ہیں دراصل سوشلزم بھی تو جمہوریت کی ان خامیوں اور کمزوریوں کے باعث ہی معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہ دونوں نظریات جمہوریت اور سوشلزم انسانی فکر کی پیداوار ہیں اور ان میں انسان کے مشاہدہ اور تجربہ دونوں کا دخل ہے۔ انسانی فکر اور سوچ کا دار و مدار تمام تر عقل و فہم پر ہے۔ جو انسان کی طرح محدود ہے۔ اس لیئے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں نظاموں میں جہاں بظاہر اپنی اپنی کچھ خوبیاں ہیں۔ وہاں ان میں خامیاں بھی ہیں۔ اگر یہ بات حقیقت نہ ہوتی۔ تو جس طرح سوشلزم کو جمہوریت کی خامیوں نے جنم دیا تھا یہ اول الذکر نظام اپنے بہتر نظریہ کی بدولت تمام دنیا پر شاید غالب آگیا ہوتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور جمہوریت بھی بدستور موجود ہے۔ بلکہ روس۔ چین۔ ویٹ نام۔ کمپوچیا

رومانیہ۔ البانیہ جیسے سوشلسٹ ممالک کے مابین کشیدگی. کھچاؤ اور کشمکش نہ صرف حیران کن ہے، بلکہ اس سے باہمی امن بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

سوشلزم نے تقریباً ایک صدی قبل کارل مارکس کے ہاتھوں جنم لیا اور موجودہ صدی کے آغاز میں لینن نے اس تحریک کو کیمونزم کے نام سے آگے بڑھایا۔ کیمونزم اور سوشلزم میں چنداں فرق نہیں ہے۔ جب سوشلزم کٹر صورت اختیار کر لے اور اس پر سختی سے عمل شروع کر دیا جائے تو یہ کیمونزم کہلانا شروع کر دیتا ہے۔ کیمونزم کا فلسفہ بظاہر امیر اور غریب۔ چھوٹے اور بڑے۔ مالک اور ملازم۔ آقا اور غلام کی تفریق کو مٹاتا ہے اس میں ملک کے تمام وسائل، مال و دولت، صنعتی اور زرعی پیداوار کی عوام کے نام پر مالک خود حکومت ہوتی ہے۔ یعنی کسی فرد کو یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی اپنی ذاتی یا نجی جائیداد۔ کاروبار یا کوئی اپنا کارخانہ لگائے۔ ہر مرد اور عورت کو اس نظام میں حکومت کے تمام احکامات کا سختی سے پابند ہونا پڑتا ہے اور ان کے مطابق کام بھی کرنا پڑتا ہے اور حکومت خود ہی تعین کر کے سب کی ضروریات کو فراہم کرتی ہے۔ بعض اوقات اس نظام میں یوں بھی لگتا ہے کہ ملک کے تمام باشندے بھی حکومت کی ملکیت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی خواہش و جذبات کے مطابق کوئی ایسا کام سرانجام نہیں دے سکتے۔ جس سے حکومت نے انہیں منع کیا ہو۔ وہ انفرادی طور پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر قدرتی اطمینان وسکون حاصل نہیں کر سکتے۔ جو شخصیت کے اجاگر ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ کیمونسٹ ملک میں آپ کسی چیز کے مالک نہیں بن سکتے۔ ویسے آپ چاہیں تو خود کو یہ تسکین دے سکتے ہیں کہ یہ سارا ملک میرا ہے۔ اس کی ہر چیز میری ہے۔ اس کی عالیشان عمارتیں میری ہیں، چاہے اپنے لئے رہنے کو ایک سے زیادہ کمرہ بھی نہ ملا ہوا ہو۔ آپ ہر سڑک کو اپنا سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اپنی ملکیت جتانے کے لئے اُسے اٹھا کر اپنے ساتھ نہ لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی سڑک کے درمیان میں خود مسلط ہو سکتے ہیں۔ اسی

طرح سڑک کا ہر کھمبا آپ کا ہے. آپ چاہیں تو پیار کے ساتھ اس سے لپٹ سکتے ہیں. لیکن جیب میں ڈال کر اپنے گھر نہیں لیجا سکتے. وہاں ہر شخص اپنی خواہشات اور جذبات سے عاری ہو کر ایک مشین کی مانند کی طرح کام سرانجام دیتا ہے. وہاں خاندان اور گھریلو زندگی کا تصور مفقود ہو چکا ہے. جونہی بچے ذرا بڑے ہوتے ہیں، والدین سے جُدا کر کے حکومت کی تحویل میں چلے جاتے ہیں. وہیں رہتے، پرورش پاتے اور تعلیم پاتے ہیں، ہفتہ میں صرف ایک دن جاکر والدین سے مل سکتے ہیں. میاں بیوی دونوں کو کسی نہ کسی جگہ ضرور جاکر کام کرنا پڑتا ہے. اگر خاوند کسی دفتر میں کام کرتا ہے تو بیوی کسی دور دراز جگہ پر کسی فیکٹری یا فارم میں جاکر کام کرتی ہے اور جب وہ کام سے واپس گھر لوٹتے ہیں تو اچھے خاصے تھکے ہوتے ہیں. بچوں کی تعلیم و تربیت. ان کی پرورش، نگہداشت اور ان کا اپنی مرضی و پسند کے معالج سے علاج معالجہ میں والدین کا قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا. اسلام میں طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کو مانا گیا ہے. لیکن سوشلزم میں طاقت کا سرچشمہ عوام کو بتایا گیا ہے. لیکن سوشلسٹ نظام میں اگر کوئی شخص چھوٹے سے بھی حکومت کے خلاف ذرا سی انگلی اٹھا دے یا اپنی خفیف سی ناپسندیدگی کا اظہار کر دے تو اس کو اس بات کی ایسی سخت سزا دی جاتی ہے کہ اس کی سات پشتیں بھی اس سے عبرت حاصل کریں تاکہ آئندہ کوئی دوسرا شخص ایسی حرکت کرنے کی جرأت نہ کرے. سوشلسٹ معاشرہ میں تحریر و تقریر کی انفرادی آزادی نہ ہونے کے باعث وہاں جمہوریت کے نظریہ کے پرچار کی قطعاً گنجائش نہیں. اس لئے اگر کسی ملک کے عوام سوشلزم کے چنگل میں ایک دفعہ مکمل طور پر پھنس جائیں تو پھر ان کا اس نظام سے نجات حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل معلوم ہوتا ہے. جیسا کہ مشرقی یورپ کے بعض چھوٹے اشتراکی ممالک کی صورتِ حال سے لگتا ہے.

جمہوری نظام میں سوشلزم کا پراپیگنڈہ کھلے عام ہوتا ہے. اس لئے وہاں سوشلزم

پھیلنے کا کچھ نہ کچھ امکان ضرور موجود ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات سوشلزم اندرونی تخریب کاری اور تشدد کے ذریعہ پھیلنے کو بظاہر ترجیح دیتا ہے اور اپنے نظریہ کے غلبہ و حفاظت کیلئے انسانی زندگی سے کھیلنے سے گریز نہیں کرتا۔ چونکہ سوشلزم نچلے طبقے میں درمیانی اور اونچے کے طبقوں کے خلاف نفرت و بیزاری کے بیج بوتا ہے۔ اس طرح یہ عوام میں اپنی اکثریت کی بنا پر ان مذکورہ طبقوں کے استحصال کا سبب بنتا ہے۔ بعض اوقات تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ نظریہ انسانوں کو بالکل بے حس بنا دیتا ہے۔ ان میں نہ تو جذبات جھلکتے دکھائی دیتے ہیں اور نہ انسانی ہمدردی۔ ان کی اگر کوئی بظاہر لگن ہوتی ہے تو وہ صرف اپنے نظریہ کی کلی اطاعت سے۔ اور اس کی غالباً وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس مذکورہ لگن میں ہی انہیں اپنی سلامتی اور جان کے تحفظ کا پہلو نظر آتا ہے۔ البتہ سوشلسٹ نظام کو جمہوری نظام پر ایک برتری ضرور حاصل ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جمہوری نظام میں ایک قوم کی مجموعی توانائی کا ایک بہت بڑا حصہ عوام کی آپس کی روزمرہ کی اختلافی کشمکش اور ایک دوسرے کے خلاف سرد جنگ میں ضائع ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ مثال دی جا سکتی ہے کہ امریکہ کے صدر جمی کارٹر کو امریکی کانگرس سے یہ بات منوانی کتنی مشکل ہوگئی تھی کہ وہ ترکی کو امریکی اسلحہ کی فراہمی پر پابندی کو ختم کر سکیں۔ وہ کئی ماہ سے مسلسل اس کوشش میں مصروف تھے۔ لیکن امریکی کانگرس ان کی بات آسانی سے مانتی نظر نہ آتی تھی۔ امریکی صدر اگر اپنی توانائی ایک سمت میں خرچ کرتے تھے تو امریکی کانگرس اس کے برعکس دوسری سمت میں اپنی توانائی استعمال کرتی تھی لیکن سوشلسٹ ممالک میں ایسی صورت حال پیدا نہیں ہونے دی جاتی۔ وہاں حکومت جو بھی فیصلہ کرتی ہے۔ صحیح یا غلط۔ ساری قوم اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے میں یکدم مصروف ہو جاتی ہے اور اس طرح وہاں قومی توانائی صرف ایک ہی متعین سمت میں ایک ہی مقصد کو حاصل کرنے کیلئے استعمال ہوتی ہے اور ذرا بھر بھی ضائع ہونے نہیں دی جاتی۔ اس لئے سوشلسٹ ممالک اپنی صنعتی زرعی اور دفاعی سامان کی پیداوار کے

بڑھانے میں بہت کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ اکثر سوشلسٹ ممالک کے عوام اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر، بے نیاز رہنے کے لئے یا پھر خود کو ہی بھول جانے کے لئے سب ممالک کے لوگوں سے زیادہ شراب کے نشے میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اس بات کا انکشاف ایک پولش ماہر عمرانیات نے وارسا (پولینڈ) کی ایک حالیہ خبر کے مطابق اپنی ایک تقریر میں کیا۔ یہ تقریر اس ماہر نے ادویات اور منشیات کے عادی لوگوں کے بارے میں پولینڈ میں منعقدہ بتیسویں بین الاقوامی کانگرس میں کی۔ اس نے کہا کہ ۱۹۷۲ء کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں جہاں تک شراب کی کھپت کا تعلق ہے۔ پولینڈ پہلے نمبر پر ہے روس دوسرے نمبر پر اور ہنگری تیسرے نمبر پر اور یہ تینوں ممالک سوشلسٹ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرے میں لادینیت ہو۔ جہاں سزا و جزا اور آخرت کا تصور سرے سے ہی نہ ہو اور شراب کے استعمال کو اخلاقی یا معاشرتی طور پر برا نہ مانا جاتا ہو تو وہاں اگر سارے ملک کے بوڑھے، بچے اور جوان، مرد اور عورت اگر شرابی نہ ہوں گے تو اور کیا ہوں گے اور تھک جانے پر تھوڑی سی شراب تو وہاں ہر کوئی ضرور ہی پی لیتا ہوگا۔

گزشتہ پانچ چھ برسوں میں بعض نام نہاد تعلیم یافتہ ترقی پسندوں نے پاکستان میں ہر حربہ کے ذریعہ سے سوشلزم لانے کی کوشش کی۔ اسے عوام میں مقبول کروانے کے لئے اسلامی نام سے سجا کر بطور "اسلامی سوشلزم" کے پیش کیا گیا۔ لیکن اسلامی ذہن رکھنے والے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے نہ صرف اسلامی سوشلزم کو یکسر رد کر دیا۔ بلکہ انہوں نے پاکستان میں نظام مصطفٰے کے قیام کے لیے بیش بہا قربانیاں دیں۔ حالات کا بغور جائزہ لینے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان نام نہاد تعلیم یافتہ ترقی پسندوں کا یہ ایک سوچا سمجھا طریق کار ہے کہ اگر وہ کسی بات کو اپنے لیئے فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ سمجھیں یا اپنے حصولِ مقصد کی راہ کی رکاوٹ سمجھیں۔ تو وہ جوان ترقی پسند اور تعلیم یافتہ

ہونے کا سہارا لیکر سخت نکتہ چینی پر اتر آتے ہیں۔ ان کا آج کل ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ چودہ سو برس پرانا اسلامی نظام جدید سائنسی دور کے تقاضوں کو ہرگز پورا نہیں کر سکتا اور اگر یہ نظام واقعی ان تمام ضروری خوبیوں کا مالک ہے جس کا تمام اسلام پسند دعوٰے کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ نظام آج تک کسی اسلامی ملک میں رائج کیوں نہیں ہوا ان لوگوں کے اس مذکورہ اعتراض کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب نکلتا ہے کہ چونکہ اب دنیا پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند ہے۔ اس لئے وہ ہر اچھی اور فائدہ مند چیز کو فوراً جانچ کر بلا کسی تعصب اور ذہنی تحفظ کے خود بخود قبول کر لیتی ہے۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو یہ نام نہاد تعلیم یافتہ و ترقی پسند دنیا اسلامی نظام کی برتری کو کب کی قبول کر چکی ہوتی لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس بظاہر ترقی پسند دنیا کی صورتِ حال کچھ اس کے برعکس ہے۔ اس کے اپنے اپنے مفادات ہیں، طبقاتی اور معاشی تعصبات ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ بظاہر امریکا اور روس آج کل دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اتنے زیادہ تعلیم و ترقی یافتہ ہونے کے باوجود یہ دونوں ممالک کم و بیش پچھلے بیس سال سے محض یہ سمجھوتہ کرنے کی بظاہر ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ ایٹمی اسلحہ کی تیاری پر پابندی لگائی جا سکے۔ سالہا سال سے یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان ہی برسوں میں ان مہلک ایٹمی ہتھیاروں کے ذریعہ انسان کی وسیع و لامحدود پیمانے پر ہلاکت کا سامان نہ صرف ان ترقی یافتہ ممالک نے تیار کیا ہے۔ بلکہ اس صف میں متعدد ترقی یافتہ ممالک بھی اب شامل ہو گئے ہیں۔ اس طرح اس تعلیم یافتہ انسان نے بظاہر ہتھیاروں پر پابندی لگانے کی کوشش میں اپنے ہی ہاتھوں خود کو نیست و نابود کرنے اور کرۂ ارض پر زندگی کے تمام آثار ختم کرنے کا سامان تیار کر لیا ہے اور کسی تعلیم یافتہ کو بظاہر یہ علم بھی میسر نہیں ہوا کہ انسانیت و زندگی کی بقا باہمی امن و تعاون میں مضمر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات کی رائے یہ ہو کہ

اس بھیانک ایٹمی جنگ کے خطرے کے پیشِ نظر جس کی طرف کہ آج کا نام نہاد تعلیم و ترقی یافتہ انسان ہر لحظہ بڑھ رہا ہے۔ اب آئندہ کبھی جنگ نہ ہو۔ میرے نزدیک ایسی سوچ دنیا کی آج تک کی رقم شدہ تاریخ کا منہ چڑانے اور انسانی فطرت کو جھٹلانے کے مترادف ہے دنیا میں جس وقت نظریاتی، معاشی اور اخلاقی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچتی ہے اور کسی انداز میں باہمی مفاہمت اور بقائے باہمی کا کوئی ظاہرہ امکان باقی نہیں رہتا۔ تو جس انسان کو اپنی طاقت کا زعم ہوتا ہے۔ اکثر اپنے حریف پر پہلا وار کر کے جنگ یا تصادم کا آغاز کر دیتا ہے۔ اگر یہ بات یوں نہ ہوتی تو ہٹلر دوسری عالمگیر جنگ شاید کبھی شروع نہ کرتا۔ اس کا اور اس کے حواریوں کا تعلیم یافتہ ہونا انہیں واضح طور پر بتا رہا تھا کہ ان کی شروع کردہ جنگ دنیا میں تباہی مچا دیگی اور لاکھوں بے گناہ بوڑھے جوان اور معصوم بچے اس کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اور اس کے عمیق معاشی، اقتصادی و نفسیاتی اثرات رہتی دنیا تک باقی رہینگے۔ لیکن اس کے باوجود ہٹلر تمام دنیا کو آگ کی بھٹی میں جھونکنے سے باز نہ آیا۔ لہٰذا صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انسان چاہے تعلیم و ترقی یافتہ ہو یا نہ ہو۔ وہ ایک دفعہ جو بات اپنے دل میں ٹھان لیتا ہے۔ وہ اسے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنا تمام علم اور صلاحیتوں کو صرف کر دیتا ہے۔ چاہے بعد میں اسے ناکامی کا منہ ہی کیوں نہ دیکھنا پڑے۔ آپ دنیا کے موجودہ حالات کا اگر جائزہ لیں تو آپ کو مذکورہ بالا نتیجہ ہی اخذ کرنا پڑیگا۔ کون نہیں جانتا کہ امریکہ اور روس دنیا کے آج سب سے زیادہ تعلیم و ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ لہٰذا ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ ان کی آپسمیں دنیا کے باقی تمام ممالک سے زیادہ افہام و تفہیم ہوتی۔ کیونکہ تعلیم و ترقی یافتہ ہونے کا بظاہر یہی تقاضا ہے کہ صحیح اور اچھی بات کو فوراً تسلیم کر لیا جائے اور اسے اپنا کر دنیا میں امن و اتحاد کو فروغ دیا جائے۔ لیکن دنیا کی آج صورتِ حال بالکل اس کے برعکس دکھائی دیتی ہے۔ ویت نام میں امریکہ اور روس کی کشمکش اور جنگ میں امریکہ کی ہزیمت۔ مشرقِ وسطے میں عربوں اور اسرائیل کی جنگوں کا سلسلہ اور ان میں امریکہ اور روس

کا ایک دوسرے کے خلاف کردار اور برِ اعظم افریقہ میں اپنا تسلط جمانے کے لئے امریکہ اور روس میں محاذ آرائی وغیرہ وغیرہ۔ لہٰذا اگر اس لحاظ سے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ آج دنیا میں امن کے لئے عدمِ استحکام۔ استحصال کے بین الاقوامی سطح پر بڑھتے ہوئے رجحانات اور اخلاقی اور روحانی قدروں کے فقدان کی وجہ سے نہ کوئی صحیح تعلیم یافتہ ہے اور نہ ہی ترقی یافتہ۔ آج بھی دنیا کا سب سے بڑا اور اہم ترین مسئلہ انسانی حقوق کی پامالی کا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے منظور شدہ حق خود ارادیت سے انحراف کا بھی ہے۔ پسماندہ ممالک کے کروڑوں انسان کی اقتصادی اور معاشی بدحالی اور غلامی سے نجات کا بھی ہے۔ ہر طرف توپوں اور طیاروں کی گھن گرج سے ایک دوسرے کو ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ اگر یہی سب کچھ ہماری تعلیم و ترقی ہے۔ جس پر ہم اتنا اتراتے اور تکبر کرتے ہیں تو اللہ ہی ہمیں ایسی تعلیم و ترقی سے محفوظ رکھے۔ جو ہمیں امن کی راہ پر ڈالنے کی بجائے مکمل تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہی ہے۔

اس "تعلیم و ترقی یافتہ ہونے کا" ایک اور اہم پہلو سے بھی جائزہ لیا جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس بات میں شک نہیں ہونا چاہیئے کہ ہر حقیقی تعلیم یافتہ شخص ترقی پسند بھی ضرور ہوتا ہے۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ بات مزید آگے بڑھے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے یہ تعین کیا جائے کہ حقیقی طور پر تعلیم یافتہ کسے سمجھنا چاہیئے۔ چونکہ تعلیم انسان کو متعلقہ چیزوں کے علم سے بہرہ ور کرتی ہے۔ اس لئے جس شخص نے کسی متعلقہ امر یا موضوع کا خاطر خواہ علم حاصل کر لیا ہو تا کہ وہ اس کے بارے میں اپنی کسی واضح یا مستند رائے کا اظہار کر سکے تو بلا خوفِ تردید یا پس و پیش یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص فلاں امر یا فلاں مضمون میں تعلیم یافتہ ہے۔ لہٰذا آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ایک پی۔ ایچ۔ ڈی ایگریکلچر زراعت کے شعبہ میں تعلیم یافتہ ہے۔ بلکہ اپنے شعبہ کا ماہر بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہی شخص قانون یا طب کا بھی علم رکھتا ہے۔

جہاں تک ان دونوں علوم کا تعلق ہے۔ وہ ان کی حد تک نہ تو تعلیم یافتہ ہے اور نہ ہی کوئی حتمی رائے کے اظہار کا مجاز ہے۔ انگریز کے ماضی کے صد سالہ دورِ حکومت اور مغربی نظریات کے غلبہ نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ نفسیاتی تاثر پیدا کیا ہے کہ اگر وہ سوسائٹی میں اپنا کوئی مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنی مجلسوں اور محفلوں میں ہر موضوع پر بلا تکلف و جھجک اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر کسی موضوع سے بچنا یا ڈرنا چاہیئے تو وہ صرف دین کا موضوع ہے۔ لہٰذا اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ دین کے معاملے میں احساسِ کمتری کا شکار ہو گیا ...... اور اس وجہ سے اس نے دین کی ضروری تعلیم حاصل کرنے سے ہر ممکن گریز کیا۔ اب اگر کوئی شخص کسی علم کی تعلیم حاصل کرنے سے گریز کرے تو ایسے شخص کو کس طرح اور کس انداز سے تعلیم یافتہ سمجھا جائے۔ چونکہ دین کے علم کے بارے میں تو اس کی حیثیت و مقام ایک جاہل کی ہے۔ اس لئے اگر ایسا کوئی نام نہاد تعلیم یافتہ شخص دین کے بارے میں کسی حتمی رائے کا اظہار کرتا ہے تو ایسی رائے کی کیا حقیقت و وقعت ہو سکتی ہے۔ خاص کر جبکہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کی عینک کے ذریعہ ہر چیز کو دیکھتا ہو۔ پھر ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیئے کہ سائنس کے علم کی مانند دین کے علم کو بھی دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سائنس کا مکمل یا صحیح علم سائنس کی متعلقہ کتابوں کے ذریعہ اور سائنس کی متعلقہ لیبارٹری میں عملی تجربات و مشاہدات کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دینِ اسلام کا علم بھی اسلامی کتب کے ذریعہ اور احکامِ خداوندی پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ خود اپنے عمل سے ہی ایک مسلمان تزکیۂ نفس کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار بن سکتا ہے اور اپنے عمل ہی سے اللہ کی راہ میں اپنا مال و دولت خرچ کر سکتا ہے اور نماز کے عمل کی بدولت اپنے اللہ سے روحانی رابطہ قائم کرتا ہے اور یوں دنیاوی حجابات بتدریج اُٹھتے جاتے ہیں۔ غیب کی حقیقتیں منکشف ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور بندہ کے دینی علم میں اپنے عمل کی وجہ سے اضافہ ہوتا

جاتا ہے۔ جس وقت اللہ تبارک تعالیٰ قرآن حکیم میں اپنے بندے کو ارشاد فرماتا ہے۔ کہ "سجدہ کر اور قریب ہو جا" تو اس کا مطلب بھی یہی ہے۔ یہاں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر کس وناکس کا سجدہ ایک جیسا نہیں ہوتا۔ سجدے سجدے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک شرفِ قبولیت حاصل کردہ سجدہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کروڑوں میل کے بظاہر فاصلے کو سمیٹ کر تمام دوری کو دور کر دیتا ہے یہ سب دین کے علم کی دقیق باتیں ہیں۔ جو ایک مخلص تعلیم یافتہ مسلمان کو ضرور معلوم ہونی چاہیئں۔

مشاہدہ میں آتا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ شخص ایک کم تعلیم یافتہ شخص کی نسبت اپنے معمولاتِ زندگی میں عموماً جھوٹ۔ مکر و فریب اور دھوکہ دہی کا زیادہ سہارا لیتا ہے اور اسی طرح یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک عام شہری ایک دیہاتی کی نسبت زیادہ ہوشیار چالاک، جھوٹا اور فریبی ہوتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے۔ تعلیم یافتہ ہونیکے دعویدار شخص کی شان کے یہ سراسر خلاف ہے کہ وہ تعلیم سے آراستہ ہوتے ہوئے بھی اپنی زندگی میں جھوٹ اور مکر و فریب کا کسی انداز میں سہارا لے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا اولین تقاضا تو یہ تھا کہ علم کی روشنی سے جہالت کے اندھیرے چھٹ جاتے۔ زندگی میں اس کی بدولت ایک حسین ربط و توازن پیدا ہوتا۔ امن وسکون کی فضا پیدا ہوتی۔ آپس میں اخوت، اعتماد، اتحاد اور تعاون کو ضروری فروغ حاصل ہوتا۔ کیونکہ علم جہاں دوسروں کے جائز تقاضوں کے متعلق اطلاع فراہم کرتا ہے۔ وہاں انسان میں خود اپنے متعلق اپنے مؤقف اور مقصد کے جائز ہونے کی ضروری اطلاع دیتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے لازمی خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ کسی بھی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے تشکیک وشبہات کی بجائے راست بازی سے ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا اور انہیں توانائی بخشتا ہے تو پھر تعلیم یافتہ مسلمان اپنا مخصوص مقصد حاصل کرنے کے لئے ایک ذہنی طور پر اپاہج مفلوج اور ناکارہ شخص کی مانند جھوٹ۔ مکر و فریب اور دھوکہ دہی کی بیساکھیوں کا سہارا آخر کیوں لیتا ہے۔ اگر ان بیساکھیوں کی کسی کو ضرورت ہی تھی تو وہ

بیچارے سیدھے سادھے ایک کم علم دیہاتی کو تھی تاکہ ان کی خارجی مدد سے وہ کسی طرح اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا۔ لیکن جو دیہاتی اپنے مقصد کے حصول کے لئے مکر و فریب کو اپنانے سے اس لئے گریز کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ مسلمان ہے تو ایسا بظاہر جاہل دیہاتی دین کے اس معاملہ کی حد تک واقعی تعلیم یافتہ ہے اور وہ نام نہاد مگر تعلیم یافتہ مسلمان جو بات بات پر جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ دین کے اس متعلقہ معاملہ میں جاہل دکھائی دیتا ہے اور اپنے مذکورہ اعمال کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں دین کے تقدس و تخیل کو مجروح کرنے کا ذمہ دار بھی ہے۔ اس ضمن میں یہاں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ جس شخص کا اللہ اور اس کے رسولؐ پر پکا اور سچا ایمان ہے تو اس کے ایمان کو عملی طور پر پرکھنے کی ایک واضح کسوٹی یہ بھی ہونی چاہیئے کہ اس مذکورہ شخص کی اپنی عملی زندگی میں اس بات کا مظاہرہ ہو کہ وہ اپنی زندگی میں نہ صرف راست باز اور پاک باز ہے۔ بلکہ وہ اپنے بارے میں معاشرہ میں یہ تاثر بھی عملی طور پر پیدا کرلے۔ کہ وہ جھوٹ، مکر و فریب۔ دھوکہ دہی۔ رشوت۔ شراب۔ جوا۔ ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ جیسی تمام لعنتوں سے بیزار ہے اور ان سے نفرت کرتا ہے۔ تاکہ اس طرح عام مسلمانوں میں اپنی دینی قدروں کو اپنانے کا مناسب شعور اور رغبت پیدا ہو اور یہ تمام مختلف پہلوؤں سے دینی علم کی باتیں ہیں۔ جو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جو اپنے دین سے حقیقی لگاؤ پیدا کرنے کے متمنی ہیں کو بخوبی معلوم ہونی چاہیئں۔ ہمارا یہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہر طرح کی دنیاوی مصلحتوں سے پاک و بے نیاز ہے اور ملک میں صحیح اسلامی ماحول پیدا کرنے کے لئے ہر وقت ہمہ تن تیار ہے۔ امید ہے کہ معاشرہ کی اس بگڑی ہوئی صورتِ حال کی طرف یہ نوجوان طبقہ بفضلِ تعالیٰ فوراً رجوع کریگا اور اس کی اصلاح کے لئے مناسب توجہ دیگا۔ کیونکہ وہ تعلیم یافتہ ہے اور اپنے دینی علم کی مدد سے اپنی عملی زندگی کے اس بہت بڑے تضاد کو اپنے پورے عزم کے ساتھ ہمیشہ کے لئے ختم

کر دیگا اور مغربی معاشرہ کی جھوٹی قدروں کو ٹھکرا دیگا۔

تعلیم یافتہ طبقے کے مذکورہ بالا اعتراض کہ "نظام اسلام اگر واقعی جدید سائنسی دور کے تقاضوں کو احسن طور پر پورا کر سکتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج تک کسی اسلامی ملک میں رائج نہیں ہوا۔" کو جنرل ضیاء الحق صاحب نے بھی ۶ جولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی میں رابطہ عالم اسلامی کی ہونے والی ایشیائی کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں بڑے دکھ سے دہرایا تاکہ عالم اسلام کا تعلیم یافتہ طبقہ اس چیلنج کو قبول کرکے اس کا مخالفین اسلام کو مثبت جواب دے مسلمان ماضی میں مغلوب و محکوم رہے ہیں۔ اغیار نے ان کے اسلامی تشخص کو ہر ممکن طریق سے ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں کہ مسلمان پھر سے بیدار ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی نشاۃ ثانیہ کا عمل شروع کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا اعتراض کرنے والوں کو یہ علم ہونا چاہیئے کہ آج دنیا کی کل آبادی کا تقریباً چوتھا حصہ بحمد اللہ مسلمانوں پر مشتمل ہے اور اسلام پھیلنے کا تبلیغی عمل آج بھی تیزی سے جاری ہے۔ اگرچہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا پیغام دیئے ہوئے چودہ سو برس گزر چکے ہیں۔ لیکن اسلام آج بھی اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ مہکتے ہوئے گلاب کے پرکشش پھول کی مانند ہر دم تر و تازہ اور شگفتہ ہے اور اس کی خوشبو سے دنیا کا ہر کونہ مہک رہا ہے۔ اسی بات کو دوسرے الفاظ میں مشہورِ عالم امریکی ہفت روزہ "نیوز ویک" نے اپنی حال ہی کی ایک اشاعت میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک غیر پیشہ ور غیر مسلم مورخ مگر ماہر فلکیات میکائیل ایچ ہارٹ کے مطابق آج تک دنیا میں جتنے کھربوں کی تعداد میں انسان پیدا ہوئے ہیں۔ ان سب میں سے جس انسان نے دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ سردار الانبیاء جناب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مسٹر ہارٹ نے اپنی کتاب میں بڑے وثوق و اعتماد سے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کسی شخص کو مصنف کے اس انتخاب کے سلسلہ میں کوئی اعتراض ہو تو وہ ایچ ہارٹ کو چیلنج کر سکتا ہے [illegible] جدید دور کا

یہ غیر مسلم محقق بلا جھجھک و تعصب کہتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بنی نوع انسان کی ساری تاریخ میں واحد ایسی شخصیت تھے۔ جو دینی اور دنیاوی دونوں لحاظ سے انتہائی کامیاب تھے۔ لہٰذا وہ نام نہاد تعلیم یافتہ افراد جو اسلام پر نکتہ چین ہونے کی جسارت کرتے ہیں۔ انہیں مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اپنے علم میں ضروری اضافہ کرنا چاہیئے۔ کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ کیا یہ ایک کھلی حقیقت نہیں ہے کہ آج عالم اسلام میں جدید علوم سے بہرہ ور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں حکمران ہیں، سائنسدان ہیں، ڈاکٹر ہیں۔ ماہرینِ قانون و نفسیات ہیں۔ انجنیئر ہیں، دانشور ہیں ادیب ہیں اور صحافی بھی ہیں۔

مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا عمل صرف اسلام پر کاربند رہ کر ہی پورا ہو سکتا ہے۔ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر کے معاملہ سے بات ہرگز نہ بنے گی۔ اسلام کے ہر داعی و دلدادہ مسلمان کو اسلام کی رُو سے اپنا ذاتی اور اپنے گردوپیش کا بھی محاسبہ کرنا ہوگا اور معاشرہ کی اصلاح کرنی ہوگی تاکہ ہمارے قول و فعل میں جو موجودہ تضاد پایا جاتا ہے۔ دین کے مطابق دور ہو جائے اور مسلمان اللہ کے دین پر سختی سے کاربند ہو جائیں اور آپس میں کسی بات پر تفرقہ نہ کریں آپس میں اتحاد قائم رکھیں۔ ایک دوسرے سے تعاون کریں اور لڑائی جھگڑا ہرگز نہ کریں۔ بلکہ حکم خداوندی کے تحت ایک دوسرے کے حقیقی معنوں میں عملی طور پر بھائی بنیں اور اسی بھائی چارے کے مطابق ایک دوسرے سے حسنِ سلوک اور کشادہ دلی سے پیش آئیں۔ مزید حکمِ الٰہی یہ بھی ہے کہ مسلمان اپنے دین کے تحفظ کے لئے سیسہ پلائی دیوار کی مانند متحد ہو جائیں۔ سچ پوچھیں تو کسی بھی مسلمان کیلئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی دانستہ طور پر خلاف ورزی کرنے کا تصور بھی کر سکے۔ لیکن کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہم میں سے بعض مسلمان اپنے فروعی اختلافات کو بہت اہمیت و ہوا دیتے ہوئے ایک دوسرے سے تفرقہ کرنے سے نہیں ٹلتے۔ اللہ کی رسی کو سب کے ساتھ مل کر مضبوطی سے نہیں پکڑتے اور

سب مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھنے اور اس کے مطابق حسن سلوک سے پیش آنے کی بجائے آپس میں بات بات پر الجھتے ہیں۔ اس طرح وہ اسلامی معاشرہ پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہونے کی بجائے عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مفادات جماعتی رجحانات یا اپنے خود ساختہ اصولوں یا ضابطوں کو احکامات خداوندی کی نسبت نعوذ باللہ شاید زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اگر حقیقت حال بھی اس معاملہ کی ایسی ہی ہو، جیسی کہ بظاہر دکھائی دیتی ہے تو پھر ان مسلمانوں کو ضرور معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان کے اپنے دنیاوی تقاضوں کے تحت بنائے ہوئے اعلیٰ سے اعلیٰ اصول ضابطے۔ قوانین۔ آئین یا دیگر متفقہ فیصلے احکامات الٰہیہ کے مقابلہ میں بالکل ہیچ اور پست ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی اسلام کی نظر میں کوئی اہمیت و وقعت نہیں ہوتی۔ ہم سب کو اپنے دنیاوی اعمال کا حساب دینے کے لئے ایک دن ضرور اپنے اللہ کے روبرو پیش ہونا ہے۔ اس لئے ہمیں یوم حساب کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے بلکہ اس سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیئے۔

اللہ جلشانہ' نے ہمیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیکر ہم مسلمانوں پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے اور اپنی ایک بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ ورنہ اس سے پیشتر ہم سب آگ کے گڑھے پر اپنی تباہ و بربادی کے کنارے پر کھڑے تھے۔ ان حالات میں ہم اللہ تعالےٰ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ لیکن اگر ہم نے اپنی کسی کجی کے باعث اللہ کی اس نعمت کی ناشکری کی تو کہیں ہمارا حال موسیٰ علیہ سلام کی قوم بنی اسرائیل جیسا نہ ہو، جس نے کہ رب العزت کی من و سلویٰ کی نعمت کی ناشکری کی اور اس کے باعث رد کر کے عذاب الٰہی میں مبتلا کر دی گئی۔ اللہ ہم پر اپنا رحم کرے اور ہم سب کو اپنی سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

اگر مسلمان پاکستان میں ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کا تجزیہ کریں تو یہ بات کھل کر سامنے آئے گی کہ اگرچہ مسلمانوں کی ۶۶ فی صد بھاری اکثریت نے اسلام کے حق میں

ووٹ دیے۔ لیکن اسلامی جماعتوں اور اسلام پسند جماعتوں میں لازمی دینی اتحاد و تعاون نہ ہونیکی وجہ سے یہ سب آپس میں بری طرح تفریق و انتشار کا شکار رہے اور محض ۳۴ فی صد ووٹ حاصل کرنے والی سوشلسٹوں کی حامی جماعت ۹۵ فی صد نشستیں جیت کر برسرِ اقتدار آگئی۔ آخر مسلمان عوام اس صورتِ حال کا ذمہ دار کس کو سمجھیں اور اس سے کیا سبق حاصل کریں۔ سب اسلامی جماعتیں خود کو بری از ذمہ قرار دیتے ہوئے دوسری مخالف جماعت کو موردِ الزام ٹھہراتی ہیں اور اس طرح آپس میں تفرقہ و انتشار کو جائز قرار دینے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر اختلاف کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے اور اس وجہ کے ذمہ دار اکثر دونوں فریق ہی ہوتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ایک فریق کی ذمہ داری زیادہ ہو اور دوسرے کی کم۔ لیکن اگر ایک لمحہ کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ صرف ایک فریق ہی اختلافات پیدا کرنے کا تمام تر ذمہ دار ہے۔ تو پھر بھی احکاماتِ الٰہی کی کسی پہلو سے خلاف ورزی کرنے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا کہ وہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے نہ پکڑیں۔ آپس میں تفرقہ کریں اتحاد اور تعاون نہ کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو بھائی نہ سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کا ہم سب مسلمانوں پر یکساں طور پر اطلاق ہوتا ہے۔ اور ہم سب پر لازم ہے کہ ان احکامات کی روشنی میں اپنے فروعی اختلافات کو ختم کر دیں اور بھائی بھائی بن کر آپس میں مثالی اتحاد اور تعاون پیدا کریں۔

امام کعبہ جناب شیخ محمد عبداللہ ابن السبیل صاحب نے جب ۷، جولائی ۱۹۷۸ء کو کراچی میں لاکھوں افراد کے عظیم الشان اجتماع میں نماز جمعہ کا خطبہ پیش کیا تو انہوں نے بھی ہمارے موجودہ اختلافات کو بھانپتے ہوئے ہمیں تلقین فرمائی کہ مسلمانوں کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام کر بنی نوع انسان کی ہدایت و راہنمائی کا منصب پھر سے سنبھالنا ہوگا۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان اپنے دلوں میں خلوص و محبت پیدا کریں اور متحد ہو جائیں۔ انہوں نے مزید نصیحت فرماتے ہوئے متنبہ کیا کہ مسلمان اندرونی خلفشار اور بیرونی یلغار سے چوکنا رہیں۔

اسی طرح ایشیائی اسلامی کانفرنس کے نائب صدر اور رابطہ اسلام کے نامور عالم دین مولانا ابوالحسن ندوی صاحب نے حال ہی میں شاہ چراغ چیمبرز لاہور میں پاکستان کے علمائے دین خطباء، آئمہ مساجد اور دانشوروں پر زور دیا کہ وہ اپنے فروعی اختلافات کو صرف علمی اختلافات اور آپس کے مباحث تک محدود رکھیں اور ان اختلافات کو سیاسی اور جماعتی مقاصد کے لئے نعرہ بنا کر عوام کے حوالے کرنے کی بجائے معاشرہ کی اصلاح اور اخلاقی انحطاط سے بچانے کیلئے مشترکہ جدوجہد کریں۔ انہوں نے بڑے دکھ سے کہا کہ یہ امر تشویشناک ہے کہ اب یہ اختلافات علماء اور خطباء سے نکل کر عوام میں آگئے ہیں، اور یہی بات جناب جسٹس شمیم حسین قادری صاحب نے اپنے الفاظ میں شام ہمدرد لاہور کے ایک حالیہ جلسہ میں یوں کہی کہ ہم قول و فعل کے تضادات دور کر کے ہی ایک صحیح اسلامی معاشرہ کا قیام عمل میں لا سکتے ہیں، کردار کی مضبوطی سے ہی باوقار قومیں تشکیل پاتی ہیں۔ قادری صاحب نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا یہ بڑا المیہ ہے کہ جب وہ اپنے بے مثال کردار کے بعد اپنی جدوجہد کا ثمر حاصل کرنے والے ہوتے ہیں۔ تو وہ چھوٹی چھوٹی بات پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پیچھے کی طرف چلے جاتے ہیں۔

رابطہ عالم اسلامی کی کراچی میں منعقد ہونے والی حالیہ سہ روزہ ایشیائی کانفرنس کی روئیداد اور دیگر عوامل سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی نظریں اب پاکستان میں مکمل نظام اسلامی کے نفاذ کے لئے یہاں کے مسلمانوں کے کردار پر لگی ہوئی ہیں۔ عالم اسلام پاکستان کے مسلمانوں سے ساری امیدیں وابستہ کئے ہوئے ایک سوالی کی مانند ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور پر خلوص التجا کر رہا ہے کہ دین کے تقاضوں کے مطابق اے پاکستانیو! اپنے اندر خدارا اتحاد و تعاون پیدا کرو۔ اخوت کے جذبے سے سرشار ہو جاؤ اور اپنے قول و فعل کے تمام تضاد کو اب ہمیشہ کیلئے ختم کر دو۔ پاکستان کے مسلمانوں نے اگر وقت کی اس اہم ترین پکار کو سن لیا اور عالم اسلام کی مقدس توقعات و خواہشات پر پورے اترے تو

روشن امکانات ہیں کہ نظامِ اسلام نہ صرف پاکستان میں کامیابی کے ساتھ رائج ہو جائے گا۔ بلکہ پاکستان باقی اسلامی ممالک کو اس ضمن میں عملی طور پر راہ دکھا کر ان کی دینی تقویت و توانائی کا سبب بنے گا اور اس طرح دکھی و گمراہ کن انسانیت کی ضروری راہنمائی کے لئے دنیا کو ایک بار پھر اسلام کی دعوت دینے کا مؤثر جواز پیدا کر سکے گا۔ اور ایسی صورتِ حال کو معرضِ وجود میں آنا پاکستانی مسلمانوں کے لئے ایک نہایت فضیلت و خوشی کی بات ہوگی جس کے اثرات و ثمرات رہتی دنیا تک یعنی آخرت میں بھی قائم و دائم رہیں گے۔

جیسے کہ پہلے بیان کیا گیا ہے۔ جمہوریت اور سوشلزم دونوں ہی انسانی فکر و شعور کی پیداوار ہیں۔ لیکن ان کے برعکس دینِ اسلام اللہ تعالےٰ کی جانب سے عطا کردہ ایسا ضابطۂ حیات ہے جو مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی و معاشی زندگی کا احاطہ کرتا ہے، بلکہ ان کی دینی و روحانی زندگی پر بھی محیط ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو یہ بات آسانی سے سمجھ آجانی چاہیئے کہ اسلام کا نظامِ زندگی اسی انداز میں جمہوریت اور سوشلزم سے افضل و برتر ہے۔ جس طرح کہ اللہ کا نظامِ قدرت انسان کے سائنسی نظام سے اعلیٰ و برتر ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تمام سائنس نہ صرف قانونِ قدرت کے تابع ہے۔ بلکہ اپنی تمام تر تخلیق اور ترقی کے لئے اس پر انحصار کرتی ہے۔ اس لئے انسان اپنی تخلیق کردہ کسی چیز کا اللہ کی تخلیق سے کس طرح مقابلہ و موازنہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس انداز میں سوچنا ایک حقیقی مسلمان کے لئے قطعاً ناممکن ہے۔ کیونکہ اُسے بخوبی علم ہے کہ اللہ کے سامنے ایک مسلمان کا صحیح مقام تو صرف سجدہ ریز ہونے میں ہے اور اس حقیقت کا علم اسے تعلیم یافتہ بناتا ہے اور لاعلمی کی وجہ سے وہ کسی قسم کے شک و شبہ کا شکار نہیں ہوتا۔

دین کے تمام نظام کی بنیاد اس پختہ یقین اور عقیدہ پر قائم ہے کہ اللہ تعالےٰ واحد ہے۔ اس کا کوئی بھی کسی انداز میں شریک نہیں۔ وہ ہی کائنات کی ہر شے کا خالق و مالک ہے۔ وہ ہی سب جہانوں کا پالنے والا ہے اور ہر ایک کو جتنا رزق چاہتا ہے۔ عطا کرتا ہے

وہ قادرِ مطلق ہے اور کائنات کی ہر شے پر اس کی مکمل حکومت و کنٹرول ہے اور یہ صرف اسی کا حق ہے کہ وہ جس بات کا چاہے، حکم دے اور جس بات کے کرنے سے چاہے، منع فرمادے۔ مگر ہم پر لازم ہے کہ ہم اس کے ہر حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ صرف اسی کی عبادت کریں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوں۔ ہماری زندگی ہمارا جسم و جان اور جو اس مادی دنیا میں حاصل کرتے ہیں۔ اس کی عطاؤں کا مرہونِ منت ہے یہاں تک کہ نشو و نما اور تمام جسمانی و ذہنی صلاحیتیں بھی اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں۔ لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ ان تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر جو کام بھی کریں۔ وہ سب اللہ کے احکامات کے مطابق ہوں۔ قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ جو آیات کی صورت میں رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے نازل ہوا۔ قرآن پاک اللہ کی حکمتوں سے بھرپور ہے۔ قرآن کے معانی اور حکمتوں کو سمجھانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہترین استاد ہیں اور اس ضمن میں ان کا ہر فرمان مسلمانوں کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے اور جو مسلمان مندرجہ بالا باتوں کا ضروری علم رکھتا ہے وہ اپنے تئیں یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں کسی حد تک تعلیم یافتہ ہے۔

اسلام میں جمہوریت کا تصور مغربی جمہوریت سے بالکل جدا ہے۔ اس کی بنیاد اللہ نے چودہ سو برس قبل بذریعہ وحی رکھی اور یوں ارشاد فرمایا کہ "تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ ان سے اللہ وعدہ کرتا ہے کہ ان کو وہ زمین پر حکومت عطا کریگا۔ جیسے کہ (اس نے) ان سے پہلے لوگوں کو حکومت عطا کی تھی" اس آیت مبارکہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسلامی نظام میں حکومت (خلافت) کسی واحد فرد، طبقہ یا قوم کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ایمان والا اور نیک عمل کرنے والا بھی ہے۔ اللہ کا خلیفہ ہے۔ اس لحاظ سے ہر نیک مسلمان حکومت کے کاروبار میں برابر کا شریک ہے اور حکومت کی کارکردگی کا ذمہ دار بھی ہے۔ اسے قرآن د

سنت کے تابع رہتے ہوئے تحریر و تقریر کی مکمل آزادی حاصل ہے اگر وہ کسی وقت ضروری سمجھے تو خلیفۂ وقت کا سرِعام دامن پکڑ کر اس پر اعتراض کر سکتا ہے اور جب چاہے. خلیفہ کو مشورہ بھی دے سکتا ہے۔ اللہ کا حکم ہے کہ "ان سے خاص خاص باتوں کا مشورہ لیتے رہا کرو۔ ان کا ہر کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے" اس کے برعکس مغربی جمہوریت میں صرف منتخب شدہ شخص ہی حکومت کے کاروبار میں براہِ راست شریک ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ مذکورہ شخص اچھے کردار اور اخلاق کا مالک ہو۔

اسلام میں بنیادی حقوق بدرجۂ اتم موجود ہیں. سب مسلمان آپس میں نہ صرف برابر ہیں. بلکہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں. چاہے وہ کسی ملک کے رہنے والے ہوں. ان کی نسل کچھ ہو. زبان کچھ ہو. چاہے کوئی عربی ہو یا عجمی، چھوٹا ہو یا بڑا. امیر ہو یا غریب. البتہ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر اگر کوئی فضیلت حاصل ہے. تو حکمِ الٰہی کے مطابق تو وہ صرف اس کے ایمان اور پرہیزگاری کی بنا پر. اگر کسی دوسرے ملک کا کوئی مسلمان کسی اسلامی مملکت میں داخل ہوتا ہے. اس کو فوراً اس مملکت کے شہری حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں. اسلامی مملکت میں اقلیتوں کو بھی مکمل و مساوی شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں اور وہ آزادی سے اپنے مذہب پر کاربند رہ سکتے ہیں. اپنے عقیدے کے مطابق اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کر سکتے ہیں. انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ کی پوری آزادی ہے اور وہ قانونی حدود میں رہتے ہوئے اسلام پر جائز تنقید بھی کر سکتے ہیں. اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت، اور احترام بھی اسی طرح مکمل طور پر ہوتا ہے. جس طرح کے مسلمانوں کے جان و مال کا. اسلام میں انسانی زندگی کا بے حد احترام ہے. ہر شخص کو زندہ رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اور ہر شخص کی زندگی. عزت و آبرو کا تحفظ لازم ہے. اسلام میں عورت کا مقام بہت ہے. چاہے وہ عورت کسی ملک کی ہو. اپنے ملک کی ہو یا دشمن کے ملک کی. وہ چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہو. اسلامی مملکت میں کوئی شخص کسی غیر

عورت کو نظرِ بد سے نہیں دیکھ سکتا۔

اسلام میں ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ محنت کر کے جائز طریقوں سے حلال روزی کمائے اور مال و دولت جمع کر کے اپنا معیارِ زندگی بڑھائے۔ لیکن اسلام امیر کو غریب کا استحصال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ تقاضا کرتا ہے کہ مزدور کی اجرت اس کا پسینہ سوکھنے سے پہلے فوراً ادا کر دی جائے۔ مزید حکم ہے کہ صاحبِ حیثیت مسلمان نہ صرف یہ کہ زکوٰۃ ادا کریں۔ بلکہ اپنی ضرورت سے زائد آمدنی کو اللہ کی راہ میں مستحق عزیز و اقارب پر اور بیواؤں یتیموں۔ ناداروں، بیماروں، سوالیوں اور مسافروں کی مدد پر خرچ کریں۔ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور قاضی کی عدالت میں خلیفۂ وقت بھی اسی طرح با ادب کھڑا ہوتا ہے۔ جس طرح کے رعایا کا کوئی فرد اور سب کے ساتھ قانون کے عین مطابق پورا پورا انصاف کیا جاتا ہے اور ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اور جس کے خلاف چاہے۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور انصاف حاصل کرے۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ رحم دِل اور مہربان بھی ہو۔ تاکہ وہ لوگوں کی خطاؤں کو معاف بھی کر سکے کیونکہ اللہ تعالےٰ بھی اپنے بندے کی صدقِ دل سے توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ اللہ ظالم شخص کو قطعاً پسند نہیں فرماتا۔

اسلام تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان عورت اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت میں گزارے۔ سوشلسٹ ممالک میں جہاں عورتیں فیکٹریوں، دفتروں اور کھیتوں میں کام کرتی زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ روس جیسے بڑے ملک میں چونکہ مردوں کی تعداد عورتوں کی نسبت بہت کم ہے اس لئے وہاں افرادی قوت کی ضروریات کو زیادہ تر عورتوں سے مجبوراً پورا کیا جاتا ہے۔ وہاں عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ کہ اگر کسی عورت کی شادی چوبیس سال تک کی عمر تک کسی وجہ سے نہ ہو سکے تو اکثر اُسے باقی زندگی بغیر شادی شدہ ہونے کے ہی گزارنی

پڑتی ہے۔ وہاں عورت کو اپنی کفالت خود کرنا پڑتی ہے اور بعض دفعہ تو شادی کا حق مہر عورت اپنے خاوند کو ادا کرتی ہے۔ جیسے کہ کرسیٹنا اوناسس کی خبر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس عورت نے ایک روسی انجینئر سے شادی کی تھی۔ لیکن اسلام میں عورت کی کفالت کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا گیا ہے۔

اسلامی ملکوں کے لئے نظامِ اسلام کا نفاذ تو چودہ سو برس پہلے سے ہو چکا ہوا ہے۔ جبکہ اس ضمن میں احکاماتِ الٰہی نازل ہوئے تھے۔ اس لیے اگر کوئی اسلامی ملک نظامِ مصطفٰے کو اپنے ملک میں رائج کرنے سے کسی انداز میں پہلو تہی کرتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بات دین کی خلاف ورزی کے مترادف ہے۔ بعض اسلامی ممالک شاید مغربی نظریات کے حامل لوگوں کی تنقید و مخالفت کی وجہ سے اسلام کی تعزیری مگر اصلاح معاشرہ کے لئے نہایت ضروری سزاؤں کو رائج کرنے سے گریزاں دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کا ہر ملک چاہے وہ انسانیت کا بظاہر کتنا ہی ہمدرد کیوں نہ ہو۔ اپنے نظریے اور نظامِ حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے طاقت کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا ضروری و جائز سمجھتا ہے۔ اگر ہیروشیما اور ناگاساکی کے لاکھوں بے گناہ لوگوں اور معصوم بچوں کو آزادی کے تحفظ یا دشمن کو شکست دینے کی خاطر آنکھ جھپکنے کے اندر ایٹم بم چلا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ اور اگر رہوڈیشیا۔ جنوبی افریقہ اور فلسطین، وغیرہ میں حقِ خود ارادیت کا مطالبہ کرنے والے کروڑں عوام کے خون سے ہولی کھیلی جاسکتی ہے اور اگر مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل اپنے حواریوں کی مدد سے انسانی خون کی ندیاں بہا کر بعض عرب ملکوں کے علاقوں پر غاصبانہ قبضہ قائم رکھنے کی کوشش کر سکتا ہے اور اگر مغرب کے کسی بڑے شہر میں چند منٹوں کے لئے رات کے وقت برقی رو بند ہو جانے سے اندھیرے میں لوٹ مار۔ آتشزنی اور لاتعداد عورتوں کی آبروریزی کا بازار گرم ہو

سکتا ہے اور یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسانیت اور تہذیب و تمدن جوں کے توں محفوظ رہتے ہیں۔ تو یقین رکھیں کہ ایک سال کی مدت میں کچھ مجرموں کو اصلاح معاشرہ کی ضرورت کے تحت پھانسی دے دینے یا اُن کے ہاتھ کاٹنے سے بھی کوئی پہاڑ ٹوٹ نہیں پڑے گا۔ بلکہ حقیقت میں سارے ملک میں انسانیت اور تہذیب و تمدن نہ صرف محفوظ ہو جائے گا بلکہ مزید تقویت حاصل کرے گا۔

ہو سکتا ہے کہ اس مضمون میں جو تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے سیاستدانوں علمائے دین۔ دانشوروں یا دیگر پڑھے لکھے لوگوں میں سے بعض حضرات پوری طرح متفق نہ ہوں۔ لیکن راقم نے اپنے محدود مشاہدہ۔ تجربہ اور علم کی بنا پر جو محسوس کیا ہے۔ وہ تو کم و بیش یہی ہے کہ معاشرہ میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ بات بات پر اکثر بلا تامل جھوٹ بول جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو دھوکہ دینے اور بیوقوف بنانے کی حتی المقدور کوشش کرتے ہیں۔ ہر شخص اپنے تئیں اس "خود اعتمادی" کا بظاہر شکار دکھائی دیتا ہے کہ صرف وہی ہوشیار و چالاک اور ذہین ہے اور باقی وہ سب جنہیں وہ دھوکہ و فریب دینا چاہتا ہے۔ بیوقوف ہیں، نالائق اور جاہل ہیں۔ نفسیاتی طور پر عموماً ایک پاگل شخص کی ذہنی حالت بھی ایسی ہی ہوتی ہے کہ وہ خود کو دانا اور ذہین سمجھتا ہے۔ اپنی بات منوانے پر اصرار کرتا ہے اور جو لوگ اس سے اتفاق نہیں کرتے یا اس کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ان سب کو وہ پاگل یا بیوقوف سمجھتا ہے۔ معاشرہ کی اس بگڑی ہوئی صورتِ حال پر روزنامہ "نوائے وقت" لاہور نے مورخہ ۲۱ نومبر ۱۹۷۸ء کو ایک اداریہ لکھا تھا۔ مدیر نے جس طرح دنیاوی مصلحتوں اور مفادات کو جس طرح بالائے طاق رکھ کر جس اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ انہیں دل کھول کر مبارکباد دی جائے۔ کیونکہ میرے

نزدیک اصل مسئلہ صرف یہی ہے کہ مسلمانوں میں قول و فعل کے تضاد کے خلاف ضروری شعور اور نفرت پیدا کی جائے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مدیر لکھتا ہے۔

"جب برصغیر پر انگریز حکمران تھا، ہم نے اپنے اخلاق کو زندہ رکھا۔ دینی حمیت اور عصبیت کو کبھی فنا نہ ہونے دیا۔ لیکن جب اپنا ملک بنا لیا اور اپنی تقدیر کے آپ مالک بن گئے تو متذکرہ خصائل شریفہ کو ترک کرنے لگے۔ ہم نے اسلام کے تصور اخلاق کو بھلا دیا اور دینی حمیت سے تہی دامن ہو گئے اور آخر کار ہم میں احساس زیاں بھی باقی نہ رہا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم منافقت میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص دوسرے کو دھوکہ اور فریب دینے میں مصروف ہے۔ قوم کے کردار میں اس منفی تبدیلی کی بلاشبہ بڑی وجہ تو ہمارا لادین سیکولر اقتصادی سیاسی اور تعلیمی نظام رہا ہے۔ لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ عوام کو قائد اعظم کے بعد مسلمانوں کے مسلمہ اکابر کے سیرت کردار کی حامل بے لوث قیادت نصیب نہیں ہوئی۔ سیاست کے میدان میں، نہ مذہب کے میدان میں۔ سیاستدان مغربی فکر سے مغلوب رہے۔ مکر و فریب اور حیلہ جوئی ان کے فکر و عمل کا محور رہی۔ جہاں تک علمائے کرام کا تعلق ہے۔ باستثنائے چند ان میں سے ہر ایک نے قال کی حد تک ہی اخلاق اور خدا خوفی کو اپنایا۔ وہ مصلحتوں سے کام لیتے رہے اور قوم ان کے علم کو ان کے لئے حجاب بنتے دیکھتی رہی۔ [illegible] نہیں بلکہ قوم کا اخلاق سنوارنے کے ذمہ دار لوگ خود اغماض برتتے رہے۔ قوم اعلٰے خصائل سے کس طرح بہرہ ور ہو سکتی تھی۔؟"

اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ پہلے تک مسلمان سب جگہ زوال پذیر تھے کیونکہ وہ مادیت کے مغربی نظریات سے مغلوب ہو کر اپنی اسلامی اقدار کو تقریباً کھو بیٹھے تھے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے قادر مطلق سے اپنا ناطہ کسی نہ کسی انداز

میں ضرور قائم رکھا اور خود کو ہر حالت میں مسلمان سمجھنا اور کہلوانے پر ہر کس و ناکس نے اصرار کیا۔ لیکن اب جبکہ مغربی و اشتراکی نظریات کا طلسم ٹوٹ چکا ہے اور ہوا مسلمانوں کی موافق سمت میں چلنا شروع ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا ہمہ گیر عمل جاری ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ روس اور چین جیسے بڑے بڑے سوشلسٹ ممالک میں مسلمان زور پکڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق روس میں اس وقت بھی ساڑھے چار کروڑ سے پانچ کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ جو ملک کی کل آبادی کا تقریباً ایک تہائی ہیں اور یہ تناسب بتدریج بڑھ رہا ہے۔ چین نے بھی حالیہ دنوں اس بار پیکنگ ٹیلیویژن پر اپنے ملک میں اس سال نمازِ عید کا ایک اجتماع دکھانا موزوں تصور کیا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان ممالک کے مسلمان نہایت نیک اور صالح ہیں۔ ان میں نہ تصنع ہے نہ بناوٹ۔ وہ نہ دھوکہ باز اور نہ عیار ہیں اور نہ ہی رشوت خور یا سمگلر۔ وہ نہ تو چور بازاری کرتے ہیں اور نہ اشیاء میں ملاوٹ۔ پاکستان کے مسلمان اپنے ان متذکرہ مسلمان بھائیوں سے کسی طرح پیچھے رہ سکتے ہیں۔ انھوں نے تو تمام عالمِ اسلام کو اسلامی نظام کے نفاذ سے خاطر خواہ طور پر روشناس کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور ان کی اس معاملہ میں مناسب راہنمائی کرنی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم سب اپنے اندر صحیح دینی جذبہ پیدا کریں۔ ہر مقام پر اپنا ذاتی محاسبہ کریں تاکہ ہمارے قول و فعل میں جو بھی تضاد آجکل پایا جاتا ہے۔ وہ یکسر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ ہم دینی بھائی بھائی حقیقی معنوں میں بن جائیں۔ ہم میں باہمی اتحاد اور تعاون ہو ہم آپس میں صاف گوئی اور راست بازی کی عملی طور پر اپنی نجی اور اجتماعی زندگی میں ہر چند حمایت و حوصلہ افزائی کریں اور معاشرہ میں جھوٹ۔ مکر و فریب اور ہر قسم کی ریاکاری کے خلاف مسلمانوں میں ضروری شعور اور نفرت پیدا کریں اور جب ہم سیاست میں قدم رکھیں تو ہمیں پوری طرح یہ ذہن نشین ہو کہ ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں۔

دوسرے نمبر پر ہم محب وطن پاکستانی ہیں اور پھر بعد میں سیاستدان ہیں۔ ہم میں یہ شعور بدرجہ اتم ہونا چاہیئے کہ ایک صحیح و سچا مسلمان توحید پرست تو ضرور ہوتا ہے لیکن وہ کبھی شخص پرست نہیں ہوتا۔ وہ صرف اسی وقت تک کسی راہنما کا دم بھرتا ہے۔ جس وقت تک وہ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر دین کے تقاضوں کے تابع کام کرتا ہے۔ چاہے یہ راہنما ہمارا کوئی سیاستدان ہو یا کوئی عالم دین۔

اغراض ومقاصد

مرکزی جماعت غوثیہ فیصل آباد پاکستان

اسلام کے زریں اصولوں کا فروغ۔

نظریاتِ باطلہ کا مؤثر ردّ۔

سوشلزم، کمیونزم اور دیگر نظریات جاہلہ و باطلہ کی تردید اور اسلامی نظریات کا فروغ۔

تعلیمات سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی ترویج اور ان کی دینی و ملی خدمات سے اہل اسلام کو روشناس کرانا۔

تحفظ ناموس رسالت، تحفظ عظمت صحابہ، تحفظ عزت اہل بیت اور تحفظ مقامات اولیاء عظام کے لئے جدوجہد۔

مملکت خداداد پاکستان میں نظام مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کے لئے مؤثر تبلیغ۔

ایسی لائبریریوں کا انتظام کرنا جن میں اہل سنت و جماعت کی کتب موجود ہوں۔

آئیے!

ان مقاصد کے حصول کے لئے عملی جدوجہد کریں:

اسلامی نظام میں انتخابات — اُن کی گنجائش و شرائط

بظاہر ہم مسلمانوں کی اکثریت کی مشکل یہ ہے کہ ہم مشرق و مغرب کے مادیت کے نظریات کی یلغار سے مغلوب ہو کر اپنی عقل پر تمام تر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی سوچ و فکر میں ان نظریات کو ممکنہ حد تک اسلام میں اپنانا چاہتے ہیں اور اس کشمکش نے ہمارے اسلامی تشخص پر گہری ضرب لگائی ہے۔ ہم احساس کمتری کا شکار نظر آتے ہیں۔ ہماری اکائی اسوقت دو حصوں میں بٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایک طرف ہماری روح جو کہ ہمارے جسم سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہمارے قلب سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم تمام ذہنی تحفظات سے بالاتر ہو کر احکامِ خداوندی کے آگے جھک جائیں۔ دنیا پر آخرت کو ہر حالت میں ترجیح دیں۔ دوسری طرف ہمارا مادی جسم عقل کو مجبور کرتا ہے کہ ہماری سوچ و فکر کا محور صرف اور صرف مادی ترقی ہو۔ اس لئے اگر ہم نے بطور ایک مکمل انسان کے ترقی کرنا ہے تو ہمیں لامحالہ ان دونوں بظاہر متضاد تقاضوں میں ان کی اہمیت کے مطابق ضروری ہم آہنگی پیدا کرنا ہوگی۔

دنیا کے تمام دانشور اس بات پر بظاہر متفق ہیں کہ انسانی عقل محدود اور ناقص ہے [illegible] وجہ سے انسان کو خطا کا پتلا کہا گیا ہے۔ یعنی To[illegible] is human اسوقت دنیا میں افہام و تفہیم کا جو فقدان، نظریاتی کشمکش، [illegible] جھگڑا، جنگ و جدل اور ایٹمی جنگ کے منڈلاتے ہوئے [illegible] دنیا کی مکمل تباہی کا خدشہ یہ سب کچھ ہماری اسی سوچ و فکر کے کرشمے ہیں جو ہماری محدود عقل کی پیداوار ہیں۔ یہ درست ہے کہ عقل کی اپنی حدود میں افادیت ضرور ہے یہ ہمیں دنیاوی علوم کو سیکھنے، اپنے دنیاوی معاملات کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے میں مدد دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دنیا میں شر کا وجود۔ اس کا فروغ۔ جگہ جگہ فتنہ فساد کا رونما ہونا۔ اسی عقل کا مرہونِ منت ہے۔ یہ شر کے لئے منصوبہ بندی بھی کرتی ہے اور اسے پروان چڑھاتی ہے لیکن اس کے برعکس جس وقت یہ عقل قلب کی راہنمائی و غلبہ کو قبول کرتی ہے۔ ضمیر کی آواز پر کان دھرتی ہے تو یہ عقلِ سلیم کا درجہ پالیتی ہے اور شر کے مخالف ہو کر یہ خیر کی حامی و مددگار بن جاتی ہے لیکن قرآن کے مطابق جن لوگوں کے دلوں پر قفل لگ جاتے ہیں۔ وہ قرآن میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ (سورۃ محمد۔ آیت ۲۴) ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

یوں تو اللہ نے تمام انسانوں کو عقل دی ہے۔ [illegible] اقبال [illegible] پروفیسر یوسف [illegible]

کو بھی اور عقل کے بل بوتے پر "تاریخ تصوّف" جیسی کتاب شاید لکھی بھی جا سکتی ہے، لیکن محض اس کے سہارے اللہ کے تقاضے، حکمت اور رموز صحیح طور پر آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ شاید اسی وجہ سے جب علامہ اقبال پر سے عقل کے پردے اُٹھے، تو آپ برملا کہہ اُٹھے کہ

"صبح ازل مجھ سے کہا یہ جبرائیلؑ نے۔ جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول"

یہی بات امیر مینائی نے اللہ سے مخاطب ہو کر اپنے الفاظ میں یوں کہی ہے،

"تو دل میں تو آتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ بس جان گیا۔ میں تیری پہچان یہی ہے"

اور من کی اس بات کو حضرت سلطان باہوؒ نے یوں فرمایا ہے۔

"الف اللہ چنبے دی بوٹی، میرے مرشد من وچ لائی ہُو"

قرآن پاک میں ہے کہ جب اللہ نے پہاڑ سے پوچھا کہ کیا قرآن کو اس پر نازل کر دیا جائے تو اُس نے خوفزدہ ہو کر یہ بوجھ (ذمہ داری اُٹھانے) سے انکار کر دیا لیکن نادان (بے عقل) انسان اس بارے میں جلد راضی ہو گیا اور انسان کی اس نادانی و بے باکی کا ذکر سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۷۲ میں "امانت" پیش کرنے کے سلسلہ میں بھی آتا ہے۔ لہٰذا سمجھ یہی آتا ہے کہ اللہ نے شاید اسی وجہ سے قرآن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر اتارا۔ نہ کہ عقل پر اور اس غرض کے لئے اللہ نے حضورؐ کے سینہ مبارک کو کشادہ بھی کیا۔ پھر قرآن کو پڑھنے، سمجھنے، اس سے حکمت و دانائی حاصل کرنے اور اپنے ظاہر و باطن کا تزکیہ کرنے کی ابتدائی لازمی شرط یہ بتائی کہ اسے "اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ" کے ساتھ شروع کیا جائے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، برکت اور فضل کے اثرات قلب پر وارد ہوں۔

کہتے ہیں کہ اللہ سے توبہ دل سے کرنی چاہیئے اور دعا بھی دل سے مانگنی چاہیئے تاکہ انہیں شرف قبولیت حاصل ہو سکے، لیکن اگر کوئی شخص یہ تکرار کرے کہ میں تو دل سے نہیں بلکہ عقل سے توبہ کروں گا یا دعا مانگوں گا تو ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا خیال کریں گے۔ جب بندہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اُسے سجدہ کرتا ہے۔ اس کے حضور خوف یا پیار کے زیر اثر بے اختیار روتا ہے تو اس طرح نہ صرف اسکا صرف تزکیۂ نفس ہی ہوتا ہے، بلکہ بندہ اپنے اللہ کے قریب تر ہوتا جاتا ہے، اللہ اس سے راضی اور خوش ہو جاتا ہے اور سورۃ البقرہ کی آیت کے مطابق اللہ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ (میرے بندے) تو میرا ذکر کر میں تیرا ذکر کروں۔ [illegible] کے طور پر ہے کہ لقمان [illegible] اپنے بیٹے سے

اللہ کا ذکر کیا۔ اس کی بڑائی بیان کرتے ہوئے اپنے بیٹے کو اللہ کا شکر کرنے کی نصیحت کی اور شرک کرنے سے منع کیا تو اللہ نے لقمان اور ان کے بیٹے کا ذکر قرآن میں ہماری راہنمائی اور ہدایت کیلئے کر دیا میرے نزدیک یہ تمام مذکورہ عمل تصوف ہی ہے جسے چند لفظوں میں یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ "عشق تیرا اگر نہ ہو میری نماز کا امام ــــ میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب"۔

انسانی عقل اور قلب کے اپنے اپنے دائرہ کار کا بہتر طور پر تعین کرنیکے لئے ضروری ہے کہ انسان پہلے اپنے متعلق یہ جان سکے کہ وہ خود کیا ہے۔ کیوں ہے اور کیسے ہے۔ کیونکہ ایک مقولہ ہے کہ "میں اپنے متعلق صرف اتنا ہی جان سکا ہوں کہ میں اپنے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا" اس سلسلہ میں حضورؐ کی ایک حدیثِ مبارک بھی ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا۔ اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔ غالباً اسی بات کو علامہ اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی ــــ تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

مندرجہ بالا تمام باتیں دل میں اللہ کا ایمان اتر جانے کی ہیں، لیکن جو لوگ اللہ پر ایمان لانے کا صرف عقلی سطح پر دعویٰ یا تکرار کرتے ہیں۔ انہیں اللہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ کے مطابق عقلمند قرار دینے کی بجائے محض گنوار کہتا ہے اور منع فرماتا ہے کہ وہ خود کو 'ایمان والے' ہرگز نہ کہیں۔ بلکہ صرف مسلمان کہیں اور یہی کیفیت موجودہ ہے۔ جس وقت علامہ اقبال نے یہ صورتِ حال دیکھی تو پکار اٹھا۔

"یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے ــــ صنم کدہ ہے جہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ"

ہم نے اگر "ایمان والے" بننا ہے تو ہمیں ان بتوں کو پاش پاش کرنا ہوگا اور اس فانی دنیا کی مادہ پرستی پر آخرت کو ترجیح دینا ہوگی۔

ہمیں سورۃ المزمل کی آیات ۸ اور ۹ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تاکہ ہم اللہ کے حاسبہ کے دوران 'گنوار' نہ گردانے جائیں۔ ارشادِ باری ہے کہ "اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرو اور منقطع ہو جا۔ اُس (اللہ) کی طرف منقطع ہو جانے کے انداز میں پروردگار ہے (وہ) مشرق اور مغرب کا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس اُسی کو پکڑ (اپنا) کارساز"۔

اسلامی نظام میں انتخابات

انکی گنجائش و شرائط

کچھ عرصہ ہوا بندہ نے مندرجہ بالا عنوان کے تحت پہلے ہی ایک مفصل ۴۸ صفحات پر مشتمل خط صدر مملکت و چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں ارسال کیا ہے جس میں اس مسئلہ کے ہر ممکنہ اسلامی پہلو پر اپنی محدود بصیرت و دانست کے مطابق قرآن پاک کے متعدد حوالہ جات کی روشنی میں بحث کی ہے اور انتخابات و نامزدگی کے موضوعات پر اپنی گذارشات پیش کی ہیں۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر گذار ہوں کہ صدر پاکستان اور حکومت نے میری ان مذکورہ گذارشات کو قابل غور سمجھتے ہوئے انہیں سراہا ہے۔ اور توقع ظاہر کی ہے کہ تمام متعلقہ حضرات کی راہنمائی کے لیے مفید ہوں گی۔ چنانچہ مرکزی حکومت کی جانب سے اظہار اطمینان کے بعد اب میں اسی سلسلہ میں اپنی گذارشات اختصار کے ساتھ اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ وہ بھی ان پر مناسب غور و خوض کرنے کے بعد اپنی واضح رائے قائم کر سکیں۔

اور اسی ضمن میں میں مدیر روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کی جانب بھی خصوصی طور پر رجوع کرنا ضروری سمجھتا ہوں، وجہ اس کی یہ ہے کہ میں بھی اس قومی روزنامہ کے باقاعدہ قارئین میں سے ایک ہوں اور یہ اخبار فخریہ طور پر اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کرکے اپنی معلومات و علم میں ضروری اضافہ کیا جائے کیونکہ یہ اخبار ہر اہم قومی و بین الاقوامی موضوع پر قلم اٹھاتا اور اپنے فہم و ادراک کے مطابق روشنی ڈالتا ہے اس لیے مجھے یہ اعتراف

کرتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ خوشی ہوتی ہے کہ ان دنوں پاکستان میں نظامِ اسلام کے نفاذ کے حق میں اس اخبار نے بظاہر خاصا اپنا ہمخیال بنایا ہے لیکن اس بارے میں میں نے محسوس کیا ہے کہ "نوائے وقت" نے اپنے قارئین کی ضروری راہنمائی کے لیے نظامِ اسلام کا واضح خاکہ پیش نہیں کیا۔ لہٰذا میں "نوائے وقت" کے بحیثیت قاری کے یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ مدیر صاحب نظامِ اسلام میں مغربی طرزِ جمہوریت، سیاست اور اس کے انتخابات کے کس حد تک حامی ہیں، یا نہیں، یا وہ بعض لازمی پابندیوں کے ساتھ اسلامی مجلسِ شوریٰ کے ارکان اور اس کے رائے دہندگان یعنی ووٹرز پر کتنی اور کس قسم کی پابندیاں عائد کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ میری ناقص رائے میں آپ مجھ سے ضرور اتفاق کریں گے کہ ان تمام مذکورہ اسلامی پابندیوں سے اپنے قارئین کو آگاہ کر کے ان کی اس بارے میں مناسب راہنمائی کرنا مدیر صاحب کی عین اخلاقی ذمہ داری ہے جس سے انھیں کسی طرح بھی پہلوتہی کرنا ان کی شایانِ شان نہیں۔

البتہ اتنا ضرور کہنا پڑتا ہے کہ اس وقت تک انھوں نے بعض دفعہ یہ احساس ضرور دلوایا ہے، کہ وہ مجلسِ شوریٰ کے ارکان کی نامزدگی کے خلاف ہیں۔ انتخابات کے حق میں ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ انتخابات جلد سے جلد کرائے جائیں کیونکہ ان کے خیال کے مطابق شاید انتخابات کی عدم موجودگی کے باعث قوم کو انتخابی عمل میں حصہ لینے سے محرومی کا جو احساس پیدا ہوتا ہے بقول اُن کے وہ ضروری قومی استحکام کے منافی ہے اور پاکستان میں اسلام دشمن عناصر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے جس سے ملک کی سلامتی کو کسی وقت بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے اور ایسی صورتِ حال کو ہرگز پیدا نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

چنانچہ مندرجہ بالا حالات میں ذہن اس بات کو اخذ کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے کہ مدیر صاحب جو رائے عامہ کو اپنے اخبار "نوائے وقت" کی وساطت سے بہت حد تک متاثر کرتے اور اپنا ہم خیال بناتے ہیں۔ ایک طرف وہ جہاں بحیثیت ایک نیک مسلمان اپنے اللہ کی طرف جھکتے ہیں وہاں وہ دوسری جانب دُنیا کے خارجی حالات پر بھی کڑی نظر رکھتے ہوئے

ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے اور اس کیفیت کی وجہ سے اُن کے ذہن میں جو کشمکش یا اُلجھن قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے اس کے پیش نظر وہ اللہ پر مکمل بھروسہ کرنے کی بجائے دینِ اسلام اور سائنسی دنیا کے مادی و متضاد تقاضوں کے مابین کوئی متبادل راہ ڈھونڈنے کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں اور غالباً سعی یہ کرتے ہیں کہ وہ دین و دُنیا دونوں کو احسن طریقے سے پورا کرنے کی غرض سے اسلام کو جمہوری بھی ثابت کر سکیں۔

اِس معاملے میں قران پاک میں سورۃ شوریٰ کی آیت ۳۸ اُنکی کسی حد تک مدد کرتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "ان لوگوں (ایمان والوں) نے اپنے پروردگار کے واسطے قبول کیا اور قائم رکھتے ہیں (وہ) نماز۔ اور کام ان کا آپس میں مشورہ کرنا ہے" بہرحال دیکھنا یہ ہے کہ مدیر صاحب اپنی مذکورہ کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں یہ تو صرف وقت ہی بتائے گا۔ ہم تو محض اندازہ ہی لگا سکتے ہیں اور ضروری نہیں کہ ہر لگایا ہوا اندازہ صحیح ثابت ہو۔

آپ یقیناً اتفاق کریں گے۔ کہ موجودہ سائنسی دور کے مادی تقاضوں کے تحت نظام مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نفاذ ایک نہایت ہی اہم و نازک مسئلہ ہے اِس لئے آجکل تمام عالم اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً ہر سطح پر انفرادی و اجتماعی طور پر اپنے اپنے ادراک و فہم کے مطابق ہر ممکن غور فکر ہو رہا ہے۔ چنانچہ اِسی ضمن میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے قومی ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ پوری قوم کو دعوت دی۔ تاکہ اس معاملہ میں پورا غور و فکر کر کے قومی سطح پر ایک صحیح اور واضح لائحہ عمل تیار کر کے اس پر پوری تندہی سے گامزن ہوا جا سکے۔

لہٰذا اس ضمن میں مدیر "نوائے وقت" نے اپنے اخبار میں ایک افتتاحی اداریہ لکھ کر بحث کا آغاز فرمایا اور اپنے قارئین کو بھی اِس بحث میں تعمیری و مثبت حصہ لینے کی دعوت دی۔ مدیر نے اپنے قارئین میں بحث کو ایک واضح رُخ دینے کے لئے چند تحریری سوالات بھی تجویز کئے۔ غالباً مدیر صاحب کے لئے اس بحث کی مناسبت سے بنیادی اہمیت رکھتے تھے لیکن جس وقت ہم نے بحیثیت "نوائے وقت" کے قاری کی حیثیت سے اُن سوالات کا دین کی روشنی میں بغور جائزہ

لیا تو مجھے یہ سوالات بنیادی اہمیت کے حامل ہونے کی بجائے کچھ زیادہ ہی سطحی قسم کے لگے لہٰذا میں ان سوالات کے تحت ہونے والی تمام بحث و کارروائی سے چنداں مطمئن و مستفید نہ ہو سکا۔ اور مجبور ہوا کہ جو سوالات میرے نزدیک قرآن حکیم کی روشنی میں زیادہ اہم اور بنیادی نوعیت کے ہیں۔ اُن کو لکھ کر مدیر صاحب کی خدمت میں ان کی مناسب و ضروری توجہ حاصل کرنے کے لیئے پیش کروں۔ لہٰذا میں جناب مدیر صاحب کا اس بات پر تو مشکور و ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے ان سوالات کو "نوائے وقت" لاہور کے شمارہ ۱۷ جولائی ۱۹۸۰ء میں شائع تو فرمایا۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان سوالات کا تسلی بخش جواب دے کر اپنے قارئین کی مناسب راہنمائی کرنے کی بجائے انھوں نے اور ان کے ساتھ قریبی رابطہ رکھنے والے علمائے دین نے نہ جانے خاموشی اختیار کرنے کو کیوں مناسب سمجھا۔

لہٰذا میں مجبور ہوا ہوں کہ میں اس کتابچہ کے قارئین کی وساطت سے یہ سوالات دوبارہ آپ کی خصوصی توجہ حاصل کرنے کے لیئے آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کروں اور پوری امید کروں کہ آپ اس معاملہ میں اپنے قارئین کی ہر پہلو سے راہنمائی کرنے کا اخلاقی فرض پورا کریں گے۔

ان سوالات کا متن مندرجہ ذیل ہے:۔

"ان دنوں" نوائے وقت" میں اسلامی طرز حکومت" کے موضوع پر ایک بحث جاری ہے۔ "نوائے وقت" نے اس بحث کا آغاز اپنے اداریہ سے کیا جس میں جمہوریت کے نظریہ کے تحت عام انتخابات کے حق میں دلائل دیتے ہوئے ایران اور بھارت میں منعقد ہونے والے حالیہ انتخابات کا حوالہ بھی دیا گیا اور کہا گیا کہ آسام اور تری پورہ کے علاقوں میں ہنگامی حالات پائے جانے کے باوجود بھارت میں انتخابات منعقد ہوئے۔ راقم کے خیال میں اسلامی طرز حکومت کے ضمن میں بھارت کے انتخابات کا حوالہ غیر موزوں ہے۔ ایران میں بلاشبہ ان دنوں اسلامی تحریک چل رہی ہے لیکن ایران کے حوالے سے بھی زیادہ ضروری بات

یہ ہے کہ ہم اسلامی طرزِ حکومت کے تحت انتخابات کی بات قرآن و سنّت کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اندریں حالات یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہم مندرجہ ذیل بنیادی اور اہم سوالوں کے جوابات حاصل کرنے کے لئے قرآن پاک سے ضروری رہنمائی اور روشنی حاصل کریں تاکہ ہم اسلامی طرزِ حکومت قائم کرنے کی کاوش میں صحیح معنوں میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔

◎ اسلامی طرزِ حکومت میں اگر جمہوری انتخابات کو جائز سمجھ لیا جائے تو کیا منتخب ارکانِ شوریٰ یا اسمبلی کی اکثریت کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنا لازمی ہوگا؟ اور اگر کسی دور میں بدلے ہوئے حالات کے تحت یہ اکثریت اسلامی حکومت کو تبدیل کرکے اپنی پسند کا کوئی دوسرا لادینی نظام لانے کا فیصلہ کرے تو کیا ایسے فیصلے پر عمل کرنا لازم ہوگا؟ اور اگر ایسے مذکورہ فیصلے پر عمل کرنا اسلامی حکومت کے لئے ناممکن ہوگا؟ تو پھر ایسے کردہ فیصلے کو رد کرنے کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا ہوگا؟

◎ قرآن پاک کی رُو سے کیا مسلمان اور "ایمان والے" (یعنی مومن) کے درمیان کوئی واضح فرق ہے یا نہیں؟ اگر فرق ہے تو قرآن کے مطابق مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ اور ایک "ایمان والے" کی تعریف کیا ہے؟ کیا اسلامی طرزِ حکومت میں قرآن کی پابندیوں کے مطابق اولی الامر، ارکانِ شوریٰ یا اسمبلی اور رائے دہندگان عام مسلمان ہو سکتے ہیں یا صرف "ایمان والے" حضرات؟

◎ اگر اسلامی طرزِ حکومت میں صرف "ایمان والے" ہی انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں تو کیا ہم سب پاکستانی مسلمانوں کو "ایمان والے" قرآن کی رُو سے قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہ اپنی جگہ ایک ناقابلِ تردید بات ہے کہ ہم میں سے بہت سے ایمانی دعوے کے باوجود اپنی عملی زندگی میں رشوت، جھوٹ، دھوکہ بازی، ملاوٹ، آمیزش، چوری اور دیگر خباثتوں میں ملوث رہتے ہیں پھر کچھ ایسے

بھی ہیں جو سُرخ سویرے کے منتظر رہتے ہیں خدا اور رسول اور دین کا مذاق اُڑاتے ہیں. پاکستانی لوگ جعلی ووٹ ڈالنے اور انتخابات میں دھاندلی سے بھی گریز نہیں کرتے، سیاستدان جھوٹے سیاسی منشور بناتے ہیں اور بلند د بانگ جھوٹے سیاسی وعدے کر کے عوام الناس کو نہ صرف بے وقوف بنانے کی کوشش کرتے ہیں. بلکہ سادہ لوح لوگوں کے جذبات سے بھی کھیلتے ہیں اسطرح وہ عوام میں باہمی بے اعتمادی، دھوکہ دہی اور مکر و فریب کو پروان چڑھانے کا سبب بنتے ہیں:

○ اگر مندرجہ بالا کثافتوں سے آلودہ مسلمان قرآن پاک کی رُو سے "ایمان والے" قرار نہیں پا سکتے اور انتخابات میں کسی انداز میں حصہ نہیں لے سکتے تو پھر ہمارے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم پہلے یہ تعین کریں کہ ہمارے معاشرے میں ایسے مسلمانوں اور "ایمان والوں" کا تعداد کے لحاظ سے کیا تناسب ہے تاکہ فیصلہ ہو سکے کہ آیا انتخابات واقعی ہو سکتے ہیں یا نہیں؛ اگر انتخابات منعقد کرانا ممکن ہو تو اس میں حصہ لینے والوں کی مجموعی تعداد کیا ہو گی؛.

○ اگر ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ انتخابات کا منعقد ہونا بھی ضروری ہے اور مسلمانوں کا "ایمان والے" ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے تو پھر ہمیں سب سے پہلے مسلمانوں کے موجودہ اخلاقی انحطاط کو دور کرنے کے لئے ان کے عملی کردار کی مؤثر طریق پر اصلاح کرنا نہایت ضروری ہے. اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں یہ تعین بھی ضرور کرنا ہوگا کہ اس بارے میں ہمارے علماء، فقہا، دانشور اور اخبار نویسوں کی کیا ذمہ داری ہے؛ اور ان کا اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟"

(روزنامہ نوائے وقت ۱۷ جولائی ۱۹۸۰ء)

اس سارے معاملہ میں دراصل ہماری مشکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنے اوپر مغربی تہذیب اور دیگر لادینی مادی نظریات کا اتنا گہرا نفسیاتی اثر قبول کر چکے ہیں کہ ہم میں سے

اکثر و بیشتر یہ سوچنے سے بظاہر قاصر معلوم ہوتے ہیں کہ انتخابات کروائے بغیر ہم اپنے عوام اور تمام جمہوریت کی دلدادہ دُنیا کو کس طرح اپنے ملکی حالات و معاملات سے مطمئن کر سکیں گے کیونکہ مادی دُنیا کے تقاضوں کے مطابق دنیا بھر میں طاقت کا سرچشمہ آجکل صرف عوام ہی کو سمجھا اور مانا جاتا ہے اس لئے عوام کی اکثریت کے فیصلے کے سامنے عموماً ہر حکومت کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے برعکس قرآن حکیم اللہ تبارک و تعالےٰ کو تمام طاقت کا سرچشمہ نہ صرف اس دنیا میں ماننے کا پوری شدت سے تقاضا کرتا ہے۔ بلکہ تمام کائنات پر بھی اصل حاکمیت اللہ ہی کی ماننے کا حکم دیتا ہے۔ اور یہ واضح حکم صادر فرمایا ہے کہ تم اکثریت کا فیصلہ ہرگز قبول نہ کرو اگر ایسا فیصلہ اللہ کے کسی حکم و ہدایت کی کسی انداز میں خلاف ورزی کرتا ہے یا ایسا کرنے کا کسی انداز میں احتمال ہی پیدا کرتا ہو، چاہے ایسا فیصلہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کا ہو، اولی الامر کا ہو، یا دنیا کے سارے عوام کا۔

ملاحظہ ہو! سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۶ میں ارشاد باری ہوتا ہے :۔

" دُنیا میں ایسے لوگ زیادہ ہیں کہ اگر تم اُن کا کہا مانو گے تو وہ تم کو اللہ کی راہ سے گمراہ کر دیں گے۔ وہ تو صرف اپنے گمان (دانست) کی پیروی کرتے ہیں۔ صرف اپنا قیاس کرتے ہیں۔"

اور اسی سورۃ کی اس سے پہلی آیت مبارکہ میں فرمایا گیا ہے :۔

" اللہ کی بات کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ ہے سُننے والا اور جاننے والا۔"

اس لئے اگر آپ ان مندرجہ بالا آیات کا تجزیہ کریں گے۔ تو آپ کو یہ اخذ کرنا پڑے گا کہ نبوّت کا زمانہ ہے، وحی نازل ہو رہی ہے۔ اور جن لوگوں کی اکثریت کا ذکر ہو رہا ہے وہ کفّار بھی ہو سکتے ہیں اور مسلمان بھی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت کا فیصلہ اللہ کی راہ سے گمراہ کرنے اور دُنیا کو آخرت پر ترجیح دینے کا حامل ہو سکتا ہے۔

اس لئے اگر کسی وقت اسلامی نظامِ حکومت میں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ بدلتے ہوئے حالات میں کوئی ایسا فیصلہ کیا جائے جو کہ غیر متوقع طور پر قرآن و سنّت کی کھلی یا خفی

خلاف ورزی کرتا نظر آئے تو ایسا فیصلہ اسلامی حکومت میں مسلمانوں کے لئے ہرگز کسی حالت میں قابلِ قبول نہ ہوگا۔ چاہے یہ فیصلہ مسلمانوں کی اکثریت ہی کا کیوں نہ ہو۔ اللہ کے مقابلہ میں اگر ساری دُنیا کے لوگ بھی ایک فیصلہ پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ فیصلہ قابل قبول نہ ہوگا۔ انسان کی تخلیق کا واحد مقصد ہی اللہ کی عبادت کرنا اور اس کے آگے اپنے تمام ذہنی ہتھیار ڈالتے ہوئے سربسجود ہونا ہے۔

اِس مقام پر بعض مسلمانوں کا یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی اکثریت کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر مبنی کوئی فیصلہ کبھی نہیں کر سکتے۔ یہ اس وجہ سے درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اگر اس بات کو اصول کے طور پر مان لیا جائے تو دنیا کے مسلمانوں کی بے پناہ اکثریت جو صدیوں سے اسلامی لحاظ سے زوال پذیر چلی آرہی ہے اس کی ابتدا سے زوال پذیر ہونے کی نوبت ہی پیدا نہ ہوتی۔ آجکل سوشلسٹ ممالک جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ کیا قرآن وسنّت کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں ؟ اگر نہیں تو وہ موجودہ صورت حال کو کیسے پہنچے ؟۔

اسوقت پاکستانی مسلمان اسلامی لحاظ سے نسبتاً بہتر نظر آتے ہیں یہاں پر مسلمانوں کی اکثریت کی ایمانی کیفیت کیا ہے ؟ کیا یہاں چور۔ ڈاکو۔ رشوت خور۔ زانی۔ شرابی، دھوکہ باز۔ مکر و فریبی ملاوٹ خور، ذخیرہ اندوز، بردہ فروش، قاتل، سمگلر، بات بات پر ہر گھر میں جھوٹ بولنے والے غیر اسلامی نظریات کے حامی لوگ موجود نہیں ہیں۔ جس وقت ۱۹۵۶ء کا متفقہ اسلامی آئین منسوخ کیا گیا۔ اِس وقت پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو پھر کہیں گم ہو گئی تھی یا وہ پھر اسلام سے بے رُخی اختیار کرتے ہوئے بے حس ہو گئی تھی۔ اللہ نے ہمیں بظاہر اس جرم کی سزا بھی دی ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے المیے سے ہم دوچار بھی ہوئے۔ اللہ نے ہم پر مہربانی کرتے ہوئے ہمیں پھر سنبھلنے کا موقع عطا فرمایا ہے۔

اِس وقت پاکستان میں اسلامی لحاظ سے اکثریت کا کیا حال ہے۔؟ کیا مسلمانوں کی اکثریت دینِ اسلام کے تمام تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہے اور ان پر تسلی بخش طور پر عمل پیرا ہے

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب کسی طور بھی حوصلہ افزا نہیں ہے۔ اس لئے ہم اسلامی طرزِ حکومت میں انتخابات کے ذریعہ اکثریت کے فیصلے کو ہر حالت میں قبول کرنے کے کس طرح متحمل ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا میں توقع کرتا ہوں کہ مدیر "نوائے وقت" جناب مجید نظامی صاحب اپنے اخبار کی موجودہ پالیسی پر نظرِ ثانی کریں گے۔ اس غرض سے ان کا کام آسان کرنے کے لئے انہی کے ایک حالیہ دور کے اداریہ کا کچھ حصّہ پیش کرتا ہوں۔ مدیر صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"جب برصغیر میں انگریز حکمران تھا، ہم نے اپنے اخلاق کو زندہ رکھا، دینی حمیّت اور عصبیت کو کبھی نثار نہ ہونے دیا۔ لیکن جب اپنا ملک بنا لیا اور اپنی تقدیر کے آپ مالک بن گئے تو مستذکرہ خصائل شریفہ کو (ہم مسلمان جو اس بہت بھاری اکثریت میں تھے) ترک کرنے لگے۔ ہم نے اسلام کے تصورِ اخلاق کو بھلا دیا۔ اور دینی حمیت سے تہی دامن ہو گئے۔ اور آخر کار ہم میں احساسِ زیاں بھی باقی نہ رہا۔ آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم منافقت میں عافیت محسوس کرتے ہیں (کیا ہماری اکثریت اسی منافقت کا سہارا لے کر مجلس شوریٰ کے انتخابات ووٹروں کے ذریعہ کروانا چاہتی ہے؟) ہم میں سے ہر شخص دوسرے کو دھوکہ اور فریب دینے میں مصروف ہے۔ قوم کے کردار میں اس منفی تبدیلی کی بلاشبہ بڑی وجہ تو ہمارا لادین سیکولرانہ، مادی، سیاسی اور تعلیمی نظام رہا ہے لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ عوام کو قائدِ اعظم کے بعد مسلمانوں کے مسلّمہ اکابر کے سیرت و کردار کی بے لوث قیادت نصیب نہیں ہوئی۔ سیاست کے میدان میں۔ نہ مذہب کے میدان میں۔ سیاستدان مغربی فکر سے مغلوب رہے مکر و فریب اور حیلہ جوئی اُن کے فکر و عمل کا محور رہی جہاں تک علمائے کرام کا تعلق ہے۔ بہ استثنائے چنداں میں سے ہر ایک نے قال کی حد تک ہی اخلاق اور خدا خوفی کو اپنایا۔ وہ مصلحتوں سے کام لیتے رہے اور قوم اُن کے علم کو اپنے لئے حجاب بنتے دیکھتی رہی۔ ان حالات میں جبکہ قوم کا اخلاق سنوارنے

کے ذمہ دار لوگ خود اغماض برتتے رہے تو قوم اعلیٰ خصائل سے کس طرح بہرہ ور ہو سکتی تھی۔"

یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علمائے دین اس خوش فہمی میں مبتلا رہیں کہ وہ آپس میں دین کے نام پر اتحاد نہ بھی کریں تب بھی وہ اپنی انفرادی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے اور نظامِ مصطفےٰ کا نفاذ ہو جائے گا۔ خوش فہمی کے اِس مرض نے ہمارے دینی راہنماؤں کے ذہنوں کو نا لیاً معطل کر کے رکھ دیا ہے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے دوران ایک پروپیگنڈا اجلاس میں جو جماعتِ اسلامی نے نہرو پارک سنت نگر لاہور کے میدان میں منعقد کیا اس کو مرحوم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے خطاب کیا۔ میں خود وہاں حاضر تھا۔ رات کا وقت تھا۔ مودودی صاحب نے اپنی اس خوش فہمی میں بڑے وثوق سے دعویٰ کیا کہ جماعتِ اسلامی مشرقی و مغربی پاکستان کے عوام میں اسقدر مقبول ہے کہ وہ بغیر کسی دوسری پارٹی کے اشتراک کے بھاری اکثریت سے انتخابات جیت لے گی۔ اور اسلامی نظام کا نفاذ کرے گی۔

ان انتخابات میں اسلامی جماعتوں کا جو حشر ہوا وہ آپ سب کے سامنے ہے چونکہ اسلامی جماعتوں نے اسلام کے نام پر آپس میں اتحاد نہیں کیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے مجموعی طور پر ۶۶ فیصد ووٹ حاصل کرنے کے باوجود انھیں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ہمارے دینی راہنما اپنی خوش فہمی کے مرض میں اب بھی مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ اور کوئی سبق حاصل کرنے کے لیے بظاہر تیار نہیں ہیں۔ اس لیے اس مرض کا واحد علاج یہی نظر آتا ہے کہ سب باشعور دین سے حقیقی لگاؤ رکھنے والے مسلمان ان راہنماؤں کا ضروری محاسبہ کریں اور انھیں مجبور کریں کہ یا تو وہ نظامِ مصطفےٰ کے نفاذ کے لیے اپنے تمام فروعی و ذاتی اختلافات ترک کر کے ملت واحدہ بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جائیں اور متحد ہو جائیں یا پھر نظامِ اسلام کے نفاذ کے مطالبہ سے دست بردار ہو کر ملک کو کفر کے حوالے کر دیں۔ اور اللہ تبارک و تعالےٰ کے حضور اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے تیار ہو جائیں۔ کیونکہ یومِ آخرت ایک دن بہر حال آئے گا۔

ہماری دینی و اخلاقی قوتوں کو بظاہر ہماری سیاست نے تباہ کیا ہے ۔ ویسے قائدِ اعظم بھی تھے ۔ ان کی سیاست راست بازی پر مبنی تھی وہ ذو معنی بات کبھی نہیں کہتے تھے ۔ ان کی سیاست ہمیشہ واضح صاف اور ستھری ہوتی تھی ۔ وہ جو کچھ کہتے تھے وہی کرتے تھے ۔ وہ سیاسی قلابازیوں کے قائل نہ تھے اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سیاست دین کے تقاضوں کے مطابق تھی یا ان کے قریب ترین تھی وہ ہر بات کو پوری طرح جانچ تول کر کیا کرتے تھے پھر اس پر چٹان کی طرح ڈٹ جاتے تھے ۔ انھیں یقین ہوتا تھا کہ وہ حق پر ہیں وہ اپنے سیاسی حریفوں کو اپنی فہم و فراست سے شکست دیتے تھے ۔ وہ مسلمانوں اور دین کے تقاضوں کے ساتھ نہایت مخلص تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے دینی راہنما ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا تھا ۔

ویسے تو سیاسی اقتدار کے حصول کی کشمکش کی وجہ سے جمعیت علمائے اسلام بھی آجکل بظاہر انتشار کا شکار ہے اس وجہ سے اس مقام پر تمام اہلِ دانش سے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس سوال کا تسلی بخش جواب حاصل کرنے کا تقاضا عوام کی جانب سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر اسلامی جماعتوں کی قیادت اعلےٰ عہدوں پر تقرری کے معاملہ میں سیاسی نوعیت کی بھیانک غلطیاں کر سکتی ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایسی قیادت نظامِ مصطفےٰ کے تحت قائم ہونیوالی مجلس شوریٰ کے ارکان کے تقرریں فاش قسم کی غلطیاں نہیں کرے گی یا نہیں کر سکتی ؟ چاہے وہ یہ تقرریاں انتخابات کے ذریعہ کرکے یا نامزدگی کے ذریعے ہمیں اسلامی نظام حکومت وضع کرتے وقت اس بات کا پورا دھیان رکھنا ہوگا کہ ہم اللہ کے احکامات کی کتنی اور کس طرح پابندی کرتے ہیں اور اس خدشہ سے نپٹنے کے لئے کیا لائحہ عمل اختیار کرتے ہیں کہ اگر کسی وقت بدلتے ہوئے حالات کے تحت کوئی اکثریت کے بل بوتے پر یا ذاتی اقتدار کے ذریعے اللہ سے بغاوت کرتے ہوئے حکومت کا اسلامی نظام لادینی نظام میں تبدیل کرنا چاہے تو ہم ایسی صورت حال سے کس طرح کامیابی سے نپٹتے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ ہم جتنے زیادہ نیک، متقی و پرہیزگار لوگوں کو مجلس شوریٰ میں نامزد کریں گے اتنا ہی زیادہ ہمارا نظام اسلام کا ڈھانچہ مضبوط و مستحکم ہوگا اور اللہ تعالےٰ کے حضور قابلِ قبول ہونے کا شرف حاصل کر سکے گا۔ یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ آخر ہم نظام اسلام اختیار کر کے اللہ ہی کو تو خوش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ آخرت میں ہماری نجات کا کوئی سامان پیدا ہو جائے۔ پھر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہمیشہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا، زمانہ تو تغیر و تبدل کا شکار ہوتا رہتا ہے حالات بدلتے رہتے ہیں اور ان کے مطابق حکومتیں اور صاحب اقتدار بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے اگر نظام اسلام کے نفاذ کے لئے حالات آج بہت سازگار نظر آتے ہیں۔ تو ضروری نہیں کہ حالات اتنے ہی سازگار ہمیشہ کیلئے رہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ ہم نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لے کر ان کا احاطہ کریں پھر ان حالات کا دین کی روشنی میں ایسا مؤثر حل پیش کریں جس کی بدولت تمام مسلمانوں کا اسلام سے بذریعہ تبلیغ حقیقی معنوں میں عملی سطح پر دائمی لگاؤ پیدا ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے تمام فرقوں کے نیک مسلمانوں اور اُن کی اسلامی جماعتوں کو بڑے خلوص اور دلنشیں انداز میں متحد ہو کر اصلاحِ معاشرہ کے لئے کام کرنا ہوگا۔ کیونکہ یوں لگتا ہے کہ ہم میں اکثر لوگوں نے آج سیاست دان بننا تو شوق سے سیکھا ہے لیکن ایک عملی طور پر نیک اور اچھے مسلمان بننے سے گریز کیا ہے مادہ پرستی کے غلبہ کے تحت سیاست کو ذریعہ بنا کر ایک دوسرے کو دھوکہ دینا اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گھر گھر جھوٹ بولنا سیکھا ہے

اس سیاست کی بدولت پاکستان نے آج تک کیا کچھ پایا ہے یا کچھ نہیں کھویا۔ اس کا اندازہ آپ خود ہی لگالیں۔ میرا دل تو اس اندازہ لگانے سے کانپ جاتا ہے۔ اب تو ہم بات بات پر ہر جگہ اور ہر موقع پر بلا تامل جھوٹ بول جاتے ہیں۔ اسی میں اپنی مصلحت اور دانائی سمجھتے ہیں۔ اور تقریباً ہر گھر کے چھوٹے بڑے نہایت خندہ پیشانی سے بظاہر ہنستے اور مسکراتے ہوئے اس غیر اسلامی صورت حال کو برداشت کرتے ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ معاشرہ کی اس بگڑی ہوئی

اخلاقی صورتحال میں ہمارے مروجہ ملکی قانون کا بھی بڑا عمل دخل اسوجہ سے لگتا ہے کہ یہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کی بظاہر کھلی اجازت دیتا ہے۔ ہر کیس میں دو مخالف فریق ہوتے ہیں۔ ان کے وکلاء اپنے کیس کو سچا اور مخالف کیس کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ہر کیس کی حقیقت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے لیکن اکثر نتیجہ یہی سامنے آتا ہے کہ جو وکیل زیادہ ذہین و قابل ہوتا ہے یا پھر جس وکیل نے اپنے کیس میں مخالف وکیل سے زیادہ محنت کی ہوتی ہے وہ کیس جیت جاتا ہے۔ چاہے اس کا کیس حقیقت میں جھوٹا ہی کیوں نہ ہو کیونکہ عدالت کیس کے حقائق پر توجہ دینے کی نسبت مروّجہ قانون پر عمل کرنے اور اس کے تحت فیصلہ صادر کرنے کی پابند ہوتی ہے۔

اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وکالت کے اس عمل سے لوگوں میں حق و باطل کی تمیز یا تو سرے سے مٹ جاتی ہے یا پھر بالکل ماند پڑ جاتی ہے خاص طور پر جب لوگ کیسوں میں گواہ کے طور پر پیش ہو کر قرآنِ پاک کی قسمیں کھا کر جھوٹی گواہی قصداً دیے جاتے ہیں اور پاکستان کے اسلامی مملکت ہونے والے حکمران قرآن پاک کی اس انداز میں بے حرمتی ہوتے دیکھ کر ٹس سے مس نہیں ہوتے اور جھوٹی گواہی دینے والوں اور جھوٹا کیس کرنے والوں کو کوئی سزا نہیں دیتے اور ان کا محاسبہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس طرح ہماری اسلامی اقدار بری طرح پامال ہوتی ہیں۔ اور دین اسلام کا تقدس مسلمانوں کے ذہنوں میں نام کا بھی نہیں رہتا۔ اس لیے ایسا مروجہ ناقص۔ بوسیدہ قانون جو قوم کی عملی طور پر خدمت نہ کر سکے اور اسے جلد انصاف مہیا کرنے کی بجائے الٹا اسے قانون کے گورکھ دھندوں میں سالہاسال کے لیے پھنسا دے جس سے کہ اس کی سات پشتیں توبہ کر اٹھیں۔ ایسے قانون کو فوراً سے بیشتر رد کر دینا چاہیئے۔ اور اس کی جگہ اسلامی تقاضوں کے مطابق ایسا قانون لانا چاہیئے۔ جس سے لوگوں کا اعتماد بحال ہو اور اسلام کی احیاء کے راستے میں جو بڑی رکاوٹ ہے وہ دور ہو۔

اسی ضمن میں میرا ذہن سپریم کورٹ کے ایک سابق جج کے کردار کی طرف جاتا ہے، جو

غالباً اسی قانون کی پیداوار ہے اور جس نے ملک سے فرار ہونے کو اپنے لئے غنیمت جانا۔

یہ بات ہمارے دین سے لگاؤ رکھنے والے دانشور طبقہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا کامیابی سے دیرپا قیام اسی صورت میں بظاہر ممکن ہو سکتا ہے اگر دین سے عقیدت رکھنے والے تمام مسلمان خلوص نیت سے اپنے درمیان باہمی محبت و اتحاد پیدا پیدا کریں چاہے وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں وہ اپنے اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے دینی بھائی چارے اور اتحاد کی کیفیت پیدا کر سکتے ہیں انہیں آپس میں فروعی اختلافات کی بنا پر آپس میں دست و گریباں نہیں ہونا چاہیئے۔

سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۲ مسلمانوں کو آپس میں لڑائی جھگڑا کرنے سے منع فرماتی ہے اسلامی جماعتوں اور تنظیموں پر آپس میں بھائی چارے اور اتحاد پیدا کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔ اگر یہ اتحاد پاکستان قومی اتحاد کی تمام جماعتوں میں اس وقت پیدا ہو سکتا تھا۔ اور وہ سب کی سب ایک دوسرے کو مسلمان سمجھ سکتی تھیں جبکہ بھٹو کی ننگی تلوار اُن کے سروں پر ۱۹۷۷ء میں لٹک رہی تھی۔ اور انھیں اپنی جانیں بچانے کا خطرہ انفرادی طور پر لاحق تھا۔ تو آج بھی جماعتیں وہی ہیں اُن کے نظریات بھی کم و بیش وہی ہیں۔ تو پھر آج یہ جماعتیں ایک دوسرے کو اپنا مسلمان بھائی مانتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ پیار و اتحاد کیوں نہ کریں۔ اس سلسلہ میں مثبت کوشش جاری رہنی چاہیئے۔ اس کے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اس بڑھتے ہوئے اتحاد و تعاون میں اس احساس کو خاصا دخل ہے کہ پاکستان کی سرحدوں پر بعض اطراف سے خطرات کے بادل منڈلا رہے ہیں اور ہمیں افغانستان ایران اور لبنان وغیرہ میں مسلمانوں کے حالات سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کے لئے آپس میں دینی بھائی چارے اور باہمی پیار و محبت [illegible] اللہ تعالیٰ کرتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں حکم ہوتا ہے کہ اور سب (مسلمان) اکٹھے مل کر اللہ تعالےٰ (کے دین) کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور آپس میں تفرقہ (لڑائی جھگڑا)

نہ کرو۔ اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اس وقت جبکہ تم (آپس میں ایک دوسرے کے) دشمن تھے پس تمہارے دلوں میں (اللہ نے) ڈالدی محبت پس تم (سب) اس کی نعمت سے بھائی بھائی ہو گئے۔ اور (ورنہ) تم آگ کے گڑھے کے اوپر کھڑے تھے۔ پس چھڑایا تم کو (اللہ نے) اس (آگ) سے اللہ اپنی نشانیاں اسی طرح بیان کرتا ہے تاکہ تم راہ پاؤ۔"

اس حکم باری تعالےٰ سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ تمام مسلمان چاہے وہ کسی گروہ۔ فرقہ یا پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور انہیں آپس میں محبت و تعاون کرنے کا حکم ہے شرط صرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ لہٰذا یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کے عمل و کردار کی اصلاح کے لئے تمام اسلامی جماعتیں آپس میں مل جل کر دین کی تبلیغ کریں اور اپنی جماعت کے دروازے ہر اس پاکستانی کے لئے کھلے رکھیں۔ جو خود کو سب سے پہلے مسلمان پھر پاکستانی اور بعد میں سیاستدان سمجھتا ہو۔ چاہے ماضی میں وہ کسی بھی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو لیکن اگر کوئی پارٹی یا فرد اپنی مخصوص مفادات یا ذاتی اغراض کی بنا پر اس حکم خداوندی پر عمل پیرا ہونے سے عملی طور پر گریزاں ہو۔ تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ اس سلسلہ میں ایک مناسب آرڈیننس جاری کرے تاکہ خلاف ورزی کرنے والے کا مناسب محاسبہ کیا جا سکے۔ ہماری سیاسی و دینی جماعتوں کا آج تک یہ المیہ رہا ہے کہ اگر وہ ایک دفعہ کسی جماعت کے خلاف ہو جائیں۔ تو وہ تا قیامت اس کے خلاف رہیں گے۔ اس جماعت کی اصلاح کے لئے نہ تو اس میں دین کی تبلیغ کی اسلامی ضرورت محسوس کریں گے۔ بلکہ اس کا ہمیشہ کے لئے بائیکاٹ کر کے تبلیغ دین کے لئے اپنے دروازے اس پر بند کر دیں گے۔ یعنی جہاں تبلیغ کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت و گنجائش ہے وہاں سے منہ موڑ لیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ با شعور اکثر مسلمان ایسے علمائے دین سے تنگی و نفرت محسوس کرتے ہوئے دین اسلام کی افادیت پر بھی اعتماد کھو بیٹھے ہیں اور کھلے بندوں الٹا علمائے دین کو اپنی اخلاقی پستی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس لئے وقت کی اہم پکار یہ ہے کہ ہم ہوش کے ناخن لیں۔ اور معاشرہ کی دینی اصلاح کے لئے سب سے پہلے اپنے کردار کی

انفرادی اور جماعتی سطح پر اصلاح کریں جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ایک ہو۔ اور اللہ کی راہ میں نظام اسلام کو صحیح معنوں میں نافذ کرنے کی خاطر اپنے ذاتی مفادات کی قربانی دینے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ کیا ہم قرآن حکیم میں اللہ کے اس حکم کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ مسلمان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انھیں آپس میں اتحاد و محبت کے ساتھ دین کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑتے ہیں یا وہ احکامات خداوندی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے اپنے فرقے سے عقیدت مندی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

ظاہر ہے جو لوگ فرقہ پرستی پر عمل کرتے ہیں یا اپنی پارٹیوں کے سیاسی پروگرام کے تحت شخص انتخابات کے دوران ایک مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے وہ نہ صرف قرآن حکیم کی سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۰۳ کی عملی خلاف ورزی کرنے کا مرتکب ہونے کا خدشہ مول لیتا ہے بلکہ سورۃ النساء کی آیت ۹۳ کے مطابق کسی مسلمان کو قصداً مار دینے پر دوزخ میں ہمیشہ کے لیے رہنے کی سزا کا مرتکب بھی بنتا ہے۔ ایسے ظالموں کے لیے جو آپس میں مسلمان ہوتے ہوئے لڑائی جھگڑا کریں جس کے نتیجے میں قتل کرنے تک نوبت پہنچ جائے اُن کے لئے اللہ فیصلہ صادر کرنے کے لیے روزِ قیامت تک کا انتظار کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔

چونکہ انتخابات میں امیدوار خود کو اپنے انتخاب کے لیے پیش کرتا ہے چاہے وہ انفرادی طور پر ایسا کرے یا وہ کسی پارٹی کا نمائندہ بن کر کرے۔ ظاہر ہے کہ کم و بیش تمام امیدوار سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی زبردست خواہش رکھتے ہیں اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہزاروں لاکھوں روپے اپنی اپنی انتخابی مہم پر جائز و ناجائز طریق سے خرچ کر لیتے ہیں اگر یہ تجزیہ درست ہے تو قرآن ایسے انتخابات منعقد کرانے کی اجازت فراہم نہیں کرتا۔ کیونکہ سورۃ نازعات کی آیت ۴۰ میں حکم ربانی ہے کہ مسلمان اپنے نفس کی خواہشات کو پورا کرنے سے رکیں۔ سورۃ الروم آیت ۲۹ میں ہے کہ ان ظالموں نے بغیر علم کے اپنی خواہشوں کی پیروی کی پس جس شخص کو اللہ گمراہ کر دے اس کو کون ہدایت کر سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام کو سورۃ ص کی آیت ۲۶ میں

حکم دیتا ہے کہ "اپنی خواہش کی پیروی مت کرو"۔

جس طرح ناقص ایمان والے اولی الامر یا مجلس شورٰی کے رکن یا ووٹر نہیں بن سکتے اسی طرح ایک بار مقرر کردہ مجلس شورٰی کے ارکان یا اولی الامر کو محض اس وجہ سے اُن کے عہدوں سے ہٹایا نہیں جاسکتا کہ لوگوں کی یہ زبردست نفسیاتی خواہش ہوتی ہے کہ ایک مقرر کردہ مدت جو عام طور پر تین سے سات سال تک بعض ممالک میں ہے) گذر جانے کے بعد ہر دفعہ دوسرے لوگوں کو بھی بظاہر اقتدار حاصل کرنے کی خواہش پورا کرنے کا روایتی موقع مل سکے کیونکہ اولی الامر یا کسی رکن مجلس شورٰی کو اس کے منصب سے ہٹانے کا سوال صرف اُس وقت ہی پیدا ہونا چاہیئے جب وہ قرآن وسنت کے تقاضوں کے مطابق کسی خاص وجہ سے اپنے فرائض منصبی کامیابی سے ادا کرنے کے قابل نہ رہا ہو۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں حکم دیا ہے کہ مجلس شورٰی کے ارکان اولی الامر اور رائے دہندگان سب کے سب ایمان والے ہوں۔ اس لئے "ایمان والے" کی تشریح ہونا سب سے پہلے ضروری ہے۔ قرآن "ایمان والے" کی اصطلاح بظاہر تین قسم کے لوگوں کے لئے کرتا ہے ایک قسم اُن لوگوں کی ہے جو زبان سے تو "ایمان والے" ہونے کا دعوٰی کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اُنھیں "ایمان والے" نہیں مانتا بلکہ فرماتا ہے کہ یہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں منافق ہیں، ملاحظہ فرمائیں سورۃ توبہ کی آیات ۴۲، ۴۳ جن میں اللہ فرماتا ہے کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والے تو اپنے جان ومال سے جہاد کرتے ہیں اور اجازت تو صرف وہی لوگ طلب کرتے ہیں۔ جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اُن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر سورۃ توبہ ۵۴، ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے کہ تو اُن لوگوں کے مال و دولت سے تعجب میں نہ پڑ۔ اللہ کا اس کے سوا اور کوئی ارادہ نہیں۔ کہ انھیں دنیا ہی میں سزا دے اور اُن کی کفر کی حالت میں ہی جانیں نکل جائیں یہ اللہ تعالےٰ کی قسم کھا کھا کر کہتے ہیں۔ کہ یہ تمھاری جماعت کے لوگ ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ یہ ایک ڈرنے والی قوم ہے۔

دوسری قسم اُن لوگوں کی ہے جو سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ کے مطابق ہے کہ "گنوار لوگوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے (لیکن) تم کہہ دو کہ تم (لوگ) ایمان نہیں لائے بلکہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے اور ابھی تو ایمان تمھارے دلوں بیچ داخل نہیں ہوا"۔ پاکستان کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت بظاہر اسی قسم کے لوگوں پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر ان کے دلوں میں ایمان اُتر گیا ہوتا تو یہ نیک مسلمان ہوتے۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اللہ تعالےٰ کے نزدیک "ایمان والے" اسوقت مان لیئے جاتے ہیں جب وہ اپنے نیک عمل و کردار سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ "ایمان والے" ہیں۔ اُن کی تعریف اللہ سورۃ شوریٰ کی آیات ۳۶ تا ۳۸ میں یوں بیان کی گئی ہے۔ کہ وہ نہ صرف بظاہر ایمان والے ہوتے ہیں بلکہ اپنے ربّ پر ضروری بھروسہ رکھتے ہیں وہ کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بھی بچتے ہیں اور غصہ کے وقت معاف بھی کر دیا کرتے ہیں اور اپنے ربّ کے ہر فرمان کو قبول کرتے ہیں۔ نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ یعنی کہ اللہ تعالےٰ کے حضور نیک نیتی سے سربسجود ہوتے ہیں اور بقول تفسیر ابنِ کثیر کے وہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بھی کرتے ہیں۔ جس کا وہ حکم کریں اسے بجالاتے ہیں اور جس سے وہ روکیں رُک جاتے ہیں"

انہی "ایمان والوں" کے متعلق اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ وہ آپس میں صلاح و مشورہ کرتے ہیں یعنی مجلسِ شوریٰ بناتے ہیں اور اولی الامر بھی اُن ہی ایمان والوں میں سے ہوتا ہے۔ اس لیئے اگر پاکستان میں لیسے "ایمان والوں" کی بھاری اکثریت ہو تو آپ بخوشی رائے دہندگان کے ووٹوں سے مجلس شوریٰ کے ارکان منتخب کر لیں۔ لیکن اگر ان مندرجہ بالا صفات کے حامل "ایمان والے" پاکستان میں "کم تعداد میں ہوں تو پھر نامزدگی کے ذریعہ ہی مجلس شوریٰ کے ارکان کا تقرر اُسوقت تک کرنا ہوگا جب تک کہ ساری اسلامی جماعتیں اور اسلام سے حقیقی لگن رکھنے والے ہر فرقہ کے نیک مسلمان آپس میں دینی تقاضوں کے عین مطابق آپس میں پورے اتحاد اور مخلص دینی بھائی چارے کی کیفیت سے سرشار ہو کر اپنے ملک میں اصلاح معاشرہ کے لیئے ایک مسلسل ہمہ گیر باہمی جہاد کریں۔ اور جب معاشرہ صحیح معنوں میں تمام

لادینی کثافتوں اور آلودگیوں سے پاک ہو جائے اور پاکستانی مسلمانوں کی بھاری اکثریت سچے "ایمان والوں" کی بن جائے تو آپ بصد شوق انتخابات کروا کر مجلس شوریٰ کے ارکان اور اولی الامر کا تقرر کریں۔ لیکن اس مقام پر واضح طور پر متنبہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے اس معاملہ میں اللہ تعالےٰ کی واضح ہدایت کی موجودگی میں "ایمان والے" مسلمانوں کی تعریف کرنے اور اپنانے میں موجودہ دور کے تقاضوں کے دباؤ کے تحت کوئی مصلحت اختیار کرنیکی کوشش کی اور "ایمان والے" مسلمان ہونے کی شرائط کو اس غرض سے نرم اور آسان بنانے کی کوشش کی تاکہ ہم کسی نہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو رائے دہندگان کے طور پر شریک کر کے کسی طرح مجلس شوریٰ کے انتخابات کرا سکیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ ہم اس مادی دنیا میں بظاہر یہ عمل کر گذرنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن مجھے ہر صورت یہ خدشہ لگتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نہ ہمارے ان مسلمانوں "ایمان والوں" کو قبول فرمائے گا اور نہ ہی ان کے ہمارے بنائے نظام کو نظام اسلام قبول فرمائے گا۔ اس وجہ سے اگر یہ خدشہ درست ثابت ہو گیا تو نہ صرف ہماری نظام اسلام کو نافذ کرنے کی تمام کوشش سعیٔ لاحاصل ہو گی بلکہ ہم اللہ کے حضور گنوار مسلمان کی رو سے اس کے محاسبہ کا خدشہ مول لیں گے جو کہ ایک بہت بڑے خسارے کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

مندرجہ بالا ناموافق حالات میں انتخابات کروانے کا ایک بڑا بنیادی خدشہ یہ بھی ہو گا کہ جن مسلمانوں کو آپ انتخابات میں بطور ووٹر حصہ لینے سے اس وجہ سے روک دیں گے کہ وہ ابھی نیک اور صالح مسلمان نہیں ہیں وہ معاشرہ میں اپنی ذلت و رسوائی کا نفسیاتی اثر ضرور لیں گے اور خود ایک ذلیل و خوار علیحدہ طبقہ محسوس کریں گے۔ اس طرح ان کے ذہن میں دین اسلام سے تنگی و نفرت پیدا ہونے کا بھی امکان ہے اور یہ بھی امکان ہے کہ وہ اسلام دشمن عناصر کے ہاتھوں میں کھیل جائیں اور ان سے مل کر وہ پاکستان سے دشمنی پر اتر آئیں اور نظام اسلام کے نفاذ کو مشکل ترین بنا دیں۔ لیکن اگر ہم مجلس شوریٰ کے ارکان کے تقرر کے لئے مناسب وقت تک نامزدگی کو ذریعہ بنائیں۔ تو ہم ایسی صورت کے پیدا ہونے سے بچ سکتے ہیں۔ جو

کسی لحاظ سے بھی ہمارے لئے پسندیدہ نہیں ہوگی۔

جو حضرات علمائے دین میں سے اسلامی تاریخ خاص طور پر خلفائے راشدین کے دور سے اسلامی نظام میں انتخابات کے حق میں جواز پیش کرتے ہیں وہ بظاہر تو ٹھیک کہتے ہیں لیکن انھیں دو بنیادی باتیں ذہن میں رکھ کر اس معاملہ میں فیصلہ کرنا چاہیئے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے زمانے میں مسلمانوں کی جو ایمانی کیفیت تھی کیا ہم مادہ پرست مسلمان بھی ویسی ہی اعلےٰ ایمانی کیفیت کے مالک ہیں کہ مجلس شوریٰ کے انتخابات میں بطور رائے دہندگان حصہ لے سکیں۔ جن لوگوں کے بارے میں اللہ تعالےٰ کا ارشاد یہ ہو کہ وہ ایمان والے نہیں اور اللہ کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہیں۔ جہاد پر نہ جانے کے لئے بہانے تراش کر حضور سے اجازت طلب کرتے ہیں نمازیں کوتاہی برتتے ہیں۔ خوشی سے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، بدنیت ہیں، فاسق ہیں، منافق ہیں، اللہ کے نزدیک سزا کے مستحق ہیں"

کیا ایسے لوگ خلفائے راشدین کے دور میں یا رسولِ پاکؐ کے دور میں انتخابات میں بطور امیدوار یا ووٹر حصہ لینے کے اہل ہو سکتے تھے اگر قرآن ایسے لوگوں کو واضح طور پر رد کرتا ہے اور "ایمان والے" قبول نہیں کرتا۔ تو ہم کس طرح اُن کے حق میں فیصلہ دے سکتے ہیں۔ اگر ہمارے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت ہماری ذاتی اغراض و مقاصد سے آلودہ ہماری انفرادی سوچ کو ہی اس کے بعد ہم نے احساسِ کمتری کا شکار ہوتے ہوئے نفسیاتی طور پر جدید علوم اور مغربی نظریات کو دی۔ اس کے بعد علماء اور فقہاء کے اسلامی حوالہ جات کو۔ اس کے بعد خلفائے راشدین کے دور کو۔ اس کے بعد سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سب سے آخر میں قرآن حکیم کو اہمیت دی۔ تو سارے کا سارا معاملہ اُلٹا ہو کر رہ جائے گا۔

ڈر ہے کہ اس حالت میں بات بات پر اختلاف کرنے اور مصلحت کرنے پر مائل ہو جائیں لیکن سورۃ النساء کی آیت ۸۱ میں حکم ربانی ہے کہ "اور کہتے ہیں (یہ لوگ) کہ کام ہمارا (اللہ اور رسولؐ) کی فرمانبرداری ہے پس تمھارے پاس سے جب (لوگ) باہر نکلتے ہیں تو ان میں سے ایک جماعت

مصلحت کرلیتی ہے سوائے اس چیز کے جو کہ کہتے ہیں اور اللہ لکھتا ہے جو مصلحت کرتے ہیں (تم) منہ پھیر لو اُن لوگوں سے۔ اور بھروسہ کرو اللہ پر"۔ لہٰذا ایسے لوگوں سے نپٹنے کے لئے ہمیں بجائے مصلحت کرنے کے اللہ تعالیٰ پر جو قادر مطلق اور حکمت والا ہے پورا پورا بھروسہ کرنا چاہیئے کہ وہ ہمیں اپنی تائید و نصرت سے ضرور نوازے گا۔

اور سورۃ الجاثیہ میں اختلاف کے مسئلہ پر کھل کر بیان ہوا ہے آیت ۱۷ میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اور ہم نے (اللہ نے) اُن کو دین کی بات سے کھلی دلیلیں دیں۔ پس انھوں نے اختلاف نہ کیا مگر بعد اس کے کہ اُن کے پاس سرکشی کا علم آیا درمیان اُن کے۔ تحقیق (یقیناً) تیرا پروردگار اُن کے درمیان اس چیز کے بیچ حکم قیامت کے دن کرے گا۔ جس میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے"۔

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس وقت تک مسلمانوں میں ایسا علم نہ آئے جو انھیں سرکش ہونے اور اسلام سے انحراف کرنے پر مائل نہ کرے وہ آپس میں دین کے معاملہ میں اختلاف نہیں کرتے اور جن چیزوں کے درمیان یہ اختلاف کرنے سے باز نہیں آتے اللہ اس کے متعلق قیامت کے دن حکم صادر کرے گا اور ہوسکتا ہے کہ جو اپنے اختلاف میں غلط ہوں انھیں سزا بھی دی جائے۔ کیونکہ اللہ نے دین کی باتیں کھلی دلیلیں دیکر بیان کی ہیں۔ اس لئے سرکشی کے علم کی طرف مائل ہونے اور اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چاہے یہ سرکشی کا علم بظاہر کتنا ہی بھلا اور دین کے مطابق بعض لوگوں کو لگے۔ اس لئے یہاں اس بات کی ضرورت پیدا ہو رہی ہے کہ ہم معلوم کریں کہ یہ کونسا ایسا علم ہمارے پاس پہنچا ہے؛ جو ہمیں سرکش بنا رہا ہے۔ تاکہ ہم اس سے بچ سکیں۔

کہیں یہ ہماری پسندیدہ مغربی جمہوریت اور اس کے تحت ہونے والے انتخابات کا علم تو نہیں ہے جو ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم مغربی جمہوریت کو اسلامی جمہوریت کے نام پر مصلحت کے تحت اپنالیں۔ کیونکہ جمہوریت بھی انسان کو سرکش اس طرح بناتی ہے کہ وہ ایک تو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی بجائے لوگوں کو عوام کی حاکمیت کا درس دیتی ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے

احکامات کے برعکس اکثریت کا فیصلہ ماننے کا تقاضا کرتی ہے اور ان تینوں موضوعات یعنی مصلحت کرنے ۔ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کی بجائے عوام کی حاکمیت اعلےٰ ماننے ۔ اور اللہ کے حکم کے برعکس عوام کی اکثریت کا فیصلہ ماننے کو ترجیح دینے پر پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے۔ لیکن مادیت کے اس دور میں ہم جس بھرپور انداز میں اپنی عقل پر بھروسہ کرنے اور اس کے سہارے ہم ہر بات کی کھال ادھیڑنے اور آپس میں غیر یقینی اور بے اعتمادی کے عالم میں بحث و مباحثہ کے عادی ہو چکے ہیں اس کی وجہ سے ہم ایک بات کے بارے میں ایک دفعہ اپنی کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ اس رائے کو ہم آسانی سے بدلنے پر کھلے دل سے تیار نہیں ہوتے ۔ اس لئے اگر جمہوریت ہمیں ایک دفعہ کسی وجہ سے پسند آگئی اور ہم نے کھلے بندوں عوام میں اس کی حمایت کا اعلان کر دیا تو پھر اس کی ، بعد میں مخالفت کرنا ہمارے لئے نفسیاتی طور پر دشوار ہو جاتا ہے ۔ اور بعض اوقات اس کی حمایت کرنا اپنی انا کا معاملہ بنا لیتے ہیں ۔

میرے نزدیک جمہوریت کی تعریف اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ عوام کی حاکمیت اعلےٰ کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اسکی اکثریت کے ہر فیصلے کو ہر حالت میں مان لیا جائے۔ جسکی وجہ سے جمہوریت دین اسلام کے تقاضوں کے ساتھ ٹکراتی ہے ۔ اگر آپ مندرجہ بالا جمہوریت کی تعریف سے اتفاق کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ساری جمہوری دنیا کی منظورِ نظر جمہوریت کو نہ صرف اپنے لئے اپنانا پسند کریں گے اس پر عمل پیرا ہونے کی خواہش کریں گے بلکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالےٰ کی حاکمیت اعلےٰ کو ماننے کی بجائے عوام کی حاکمیت کو مانتے ہوئے اللہ کے سامنے مقابلہ پر کھڑے ہو جائیں گے اور اللہ سورۃ نازعات کی ۴۰ اور ۴۱ آیت میں ارشاد فرماتا ہے۔ کہ" جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا۔ اور اپنے نفس کو خواہش سے روکا بس تحقیق بہشت ہے جگہ اس کے رہنے کی "۔ اسی طرح سورۃ الجاثیہ کی آیت ۱۸ میں حکم ہوتا ہے کہ" پھر ہم (اللہ) نے تم کو قائم کیا شریعت پر امر سے ۔ پس اس کی پیروی کر ، اور اُن لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کر ۔ جو کہ نہیں جانتے "۔ اس طرح یہ حکم خداوندی دنیا کے اُن تمام لوگوں کا احاطہ کرتا ہے۔ جو شریعت

کی پیروی تو نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے اپنے جمہوری اور اشتراکی نظام کی پیروی کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا مضمون کا مرکزی نقطہ اپنی انتہا کو سورۃ احزاب کی پہلی تین آیات مبارکہ میں پہنچتا ہے غور فرمائیں کہ سرکارِ دوجہاں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ:۔

"اے نبیؐ! ڈرا کرو، اللہ سے، اور مت کہا مانو کافروں اور منافقوں کا، تحقیق (یقیناً) اللہ ہے جاننے والا اور حکمت والا، اور پیروی کرو (صرف) اسی چیز کی جو تمھارے رب سے تمھاری طرف وحی کی جاتی ہے بلاشبہ اللہ باخبر ہے (ہر) اس چیز سے کہ جو تم کرتے ہو اور بھروسہ کرو اللہ پر، اور اللہ کو اپنے لیے کافی جانو۔"

ان آیات کا مطالعہ کرنے سے کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید رسول پاک رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کافروں اور منافقوں کی کسی بات کو کسی نہ کسی وجہ سے ماننے کی طرف بظاہر مائل تھے۔ چاہے وہ اُدھر اُن کی اکثریت سے مغلوب یا مرغوب ہونے کی ہو جیسے کہ اشارہ سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۴ میں ملتا ہے۔ یا وہ بات ویسے ہی بظاہر انھیں بہت مناسب صحیح اور بھلی معلوم ہوتی ہو۔ جس طرح کہ مثال کے طور پر ہمیں مغربی جمہوریت کے نظریات بھلے لگتے ہیں اور اس بات پر عمل کرنے سے آپؐ دین کی نفی کا کوئی پہلو نہ سمجھتے ہوں۔ چنانچہ آپؐ کا یہ رجحان دیکھتے ہوئے شاید اسی وجہ سے اللہ نے آپؐ پر وحی نازل کی ہو۔ اور بظاہر سخت لہجہ میں ہدایت کی ہو کہ آپ اللہ سے ڈرا کریں اور کافروں اور منافقوں کی بات کو ہرگز نہ مانا کریں کیونکہ ہر بات کی اصل حقیقت کو تو صرف اللہ ہی جانتا ہے کہ کونسی بات حقیقتاً اچھی ہے اور کونسی بری۔ کیونکہ وہی حکمت و دانائی والا ہے ہر معاملہ میں کامل علم رکھتا ہے۔ اس لیے آپ پر لازم ہے کہ آپؐ کو صورت حال بظاہر کچھ ہی کیوں نہ لگے۔ آپ اللہ تعالٰی کی طرف سے جو چیز آپ پر وحی کی جاتی ہے اس کی پیروی ضرور بضرور کریں۔ پھر فرمایا جاتا ہے کہ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ جو کہ آپؐ کرتے ہیں۔ اور آپ کو تلقین کی جاتی ہے۔ کہ آپ کسی صورتحال سے پریشان نہ ہوا کریں بلکہ اس کے برعکس اللہ پر پورا بھروسہ کریں کیونکہ وہ ہی کارساز ہے اور ہر بات سے بخوبی نپٹنے کے لیے کافی ہے۔

لہٰذا ان آیات مبارکہ کی روشنی میں ہمیں اللہ تبارک و تعالےٰ کے حضور جناب رسول پاکؐ کے مقابلہ میں نہ صرف اپنا اپنا مقام پہچاننا چاہیئے بلکہ یہ بھی فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہم اللہ کے احکامات پر کسی حد تک چلنا چاہتے ہیں اور اس پر کس قدر بھروسہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُسے کتنا دانا اور حکمت والا جانتے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ہم اللہ تعالےٰ کے دینی تقاضوں کو کس حد تک صحیح طور پر سمجھنے اور اُن کے مطابق عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح سورۃ البقر کی آیات ۱۱۹ اور ۱۲۰ میں درج ہے کہ "تحقیق نہ بھیجا ہے ہم نے تمؐ کو ساتھ حق کے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور تمہیں دوزخ میں رہنے والوں کے متعلق نہیں پوچھا جائیگا اور یہود و نصاریٰ تجھ سے کبھی راضی نہ ہوں گے۔ حتیٰ کہ تمؐ اُن کے دین کی پیروی کرنے لگو۔ بلاشبہ کہہ دو کہ ہدایت صرف اللہ کی ہدایت ہے اور اگر تمؐ اُن کی خواہشوں کی پیروی کرو گے بعد اس چیز (وحی) کے آجانے کے تمہارے پاس علم میں سے۔ تمہارا سوائے اللہ کے نہ کوئی دوست ہو سکے گا اور نہ ہی مددگار۔" اس مقام پر بھی اللہ تعالےٰ دو ٹوک انداز میں تنبیہ فرما رہا ہے کہ سوائے اللہ کے احکامات کے جو وحی کئے گئے ہیں اور کسی چیز کی لوگوں کے کہنے پر پیروی مت کرو اور احکامات کی خلاف ورزی کے مرتکب ہرگز نہ ہونا۔ ورنہ روزِ حساب کوئی یار و مددگار نہ ہو گا۔

میری مندرجہ بالا معروضات کا واحد مقصد یہ ہے کہ میں اپنا نقطۂ نظر اپنے دینی بھائیوں کی خدمت میں نہایت ادب کے ساتھ پیش کروں تاکہ نظام اسلام کے نفاذ کے سلسلہ میں ہمارے دین کا کوئی ایسا پہلو نہ رہ جائے جس پر ہم مناسب غور و فکر نہ کر سکیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ ہمیں اس نیک مقصد میں اپنے فضل و کرم سے پوری طرح کامیاب کرے۔ تاکہ ہم صحیح معنوں میں اپنے دین کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھال سکیں۔ اور آپس میں ہر ایک کے ساتھ دینی بھائی کی حیثیت سے پیار و محبت کریں۔ اور دینی معاملات میں مکمل اتحاد کریں۔ میری معروضات سے ضروری نہیں کہ میرا ہر دینی بھائی مکمل طور پر اتفاق کرے اس لئے اگر میری معروضات کسی بھائی

کے ذہن پر گراں گذریں تو مجھے وہ نہایت فراخدلی سے معاف کردے ۔ میں اس کے دینی جذبات کو ٹھیس پہنچا کر یا مجروح کر کے اس کو کسی انداز میں خود سے رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا ۔ بلکہ اس کے پیار اور اتحاد کو حاصل کرنے کا متمنّی ہوں ۔ کیونکہ ہمارا اللہ ایک ہے ۔ رسولؐ ایک ہے ۔ قرآن ایک ہے اور ہمارا ایمان بھی ایک ہے ۔

جنرل محمد ضیاء الحق مبارکباد کے مستحق ہیں جن کی سربراہی میں ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء کو بطور یوم آزادی منانے کا پروگرام پورے اہتمام سے تیار کیا گیا ۔ مسلمانوں نے اس دن اپنے اتحاد اور دینی جذبے کا جس بھرپور انداز میں مظاہرہ کیا ۔ اس نے ۱۹۴۷ء میں تحریک پاکستان کے دنوں کی یاد تازہ کردی ۔ انھوں نے " پاکستان کا مطلب کیا ، لا الٰہ الا اللہ " کے نعرہ سے جس والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی اکثریت اب بھی اپنی زندگی کو دین کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے بشرطیکہ اُسے مخلص اسلامی قیادت میسّر ہو جائے ۔

لہٰذا یہ بات نہایت خوش آئند اور حوصلہ افزا ہے ۔ کہ ہمارا بظاہر بگڑا ہوا مادیت پرست معاشرہ جلد سنور سکتا ہے اگر ہماری یہ کوششیں پوری شدت سے اسی طرح جاری رہیں اور جنرل ضیاء الحق پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کو اپنی زندگی کا مشن بنالیں اور تمام مسلمان جو اسلام کے ساتھ خلوص دل سے لگاؤ رکھتے ہیں ۔ ان کے ساتھ ہر سطح پر بھرپور تعاون کریں ۔ اس سے نہ صرف نظام اسلام کے جلد نفاذ کی صورت پیدا ہوگی بلکہ اس نظام کو دائمی استحکام بھی نصیب ہو سکے گا ۔ معاشرہ کی اسلامی خطوط پر اصلاح نسبتاً آسان ہوگی ۔ اور قرآن پاک کے تقاضوں کے مطابق مسلمان نیک سیرت و کردار کے مالک بن سکیں گے ۔ ان کا ظاہر و باطن صاف ہو جائے گا ۔ اور وہ متقی و پرہیزگار بن سکیں گے ۔ اور اسوقت ہم مسلمانوں کی اکثریت سے یہ توقع کی جا سکے گی کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق دنیا کی زندگی پر آخرت کو ترجیح دیں ۔ اس لئے ہماری سب کی اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا ہونی چاہیئے کہ اے رب ہمارے ! ہم مسلمانوں کو اپنے دین کے صحیح خطوط پر نفاذ میں مکمل کامیابی

عطا فرما! کیونکہ تیرا اپنے نیک بندوں سے وعدہ بھی یہی ہے کہ تو ہر حالت میں تمام مخالفتوں کے باوجود اپنے پیارے دین کو دیگر تمام ادیان اور دنیا لوی نظریات پر غالب کر کے رہے گا۔ چاہے یہ بات دنیا بھر کے تمام مخالفوں کو کتنی ہی بُری کیوں نہ لگے۔ اے اللہ! ہم جانتے ہیں کہ صرف تو ہی قادرِ مطلق ہے اور تیرا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے جو کبھی بھی حالت میں بدلا نہیں کرتا۔ اے ہمارے رب! یہ دین تیرا ہے اور اس پر عمل کرنے اور اسے تمام دنیا میں پھیلانے کا حکم بھی تیرا ہے اور ہم بندے بھی صرف تیرے ہی ہیں لیکن ہم عاجز و ناتواں مسکین و کمزور ہیں اور تیرا یہ خاصا ہے کہ تو اپنے کمزور مسکین بندوں کی ہمیشہ اعانت تائید و نصرت فرماتا ہے۔ خاص طور پر جبکہ وہ تیرے دین کو تیرے تقاضوں کے مطابق اپنانے اور اسے دنیا میں پھیلانے کیلئے کوشاں ہیں۔

لہٰذا اے ہمارے ربّ! اپنے دین کی روشنی سے اب پورے پاکستان کو منور کر دے کہ یہ روشنی یہاں سے پھیلتے ہوئے پورے عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ اور پھر تیرا دین اس کے بعد تمام دنیا میں پھیل جائے۔ کیونکہ تیرے دین کا پیغام نہ صرف اب رہتی دنیا تک ابدی ہے۔ بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔

اے ہمارے ربّ! ہماری تجھ سے یہ نہایت عاجزانہ دعا ہے۔ کہ تمام انسانوں کو توفیق بخش کہ وہ تیرے تمام تر فضل و کرم کے صدقے تیری معرفت حاصل کر کے تجھ پر ضروری ایمان لا سکیں۔ کیونکہ اے ربّ ہمارے تو نے خود ہی انسان میں اپنی روح پھونک کر اس پر اپنا فضل کیا ہے اسے اشرف المخلوقات اور دنیا پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اسے مردود شیطان ابلیس پر ترجیح دی ہے اس لیے اسے اب روزِ حشر شیطان ابلیس کے سامنے رسوا اور ذلیل نہ ہونے دی جیئو۔ اس کے لعنوں سے اس کو بچا لیجیو۔ کیونکہ وہ تیرا راندا ہوا سرکش باغی اور ہمارا کھلا دشمن ہے وہ ہمیں کمزور جان کر اپنے ہر طرح کے ہتھکنڈوں سے ہم پر حملہ آور ہو کر ہمیں تیری بتائی ہوئی راہ ہدایت سے ہٹا کر ہم سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس اے ربّ ہمارے! تیری رحمت اور فضل کا یہ عالم ہے کہ تو نے ہمیں اجازت دے رکھی ہے کہ ہم پر جب بھی اور جس وقت بھی شیطان حملہ آور ہونے لگے

ہم فوراً بھاگ کر تیری پناہ میں چلے آئیں۔ اے رب ہمارے! تو اس شیطان مردود کو اس کی ان تمام حرکتوں کی مناسب سزا ضرور دینا۔ لیکن ہم گنہگاروں کی توبہ قبول کرتے ہوئے ہمیں ضرور بخش دینا۔ ہم تو تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں۔ اور ہمیں یقینِ کامل ہے کہ جیسا عظیم رحیم تو ہے تو ہمارے لئے ان کی شفاعت کو قبول فرمائے گا۔ اور اپنی جنت فردوس کے دروازے ہم گنہگار عاصیوں پر کھول دے گا۔ اور اے رب ہمارے! تو اپنے اُن اَن گنت فرشتوں کی دعا کو بھی ضرور شرفِ قبولیت بخشے گا۔ جو دن رات تیرے عرش کے گرد تیرے ہی حکم سے ہم گناہگاروں کی بخشش کے لئے دعا مانگتے رہتے ہیں یقیناً تو اپنے ان نیک فرشتوں کو مایوس نہیں ہونے دے گا۔

اے رب ہمارے! اس انداز سے تو نے اپنی نعمتوں اور احسانوں کی ہم گنہگار بندوں پر انتہا کر دی ہے لیکن ہم تیرے عاجز و مسکین بندے اس قابل نہیں ہیں کہ تیری ان نعمتوں اور مہربانیوں کو گن سکیں۔ یا ان کا کسی انداز میں احاطہ کر سکیں یا شکر ادا کر سکیں کیونکہ ہم ہر لحاظ سے محدود ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جشنِ آزادی جس جوش و خروش سے منایا گیا اس سے مسلمانوں کے دینی رجحان کی عکاسی ہوتی ہے وہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کے ۱۹۴۷ء کے نعرہ کو نہیں بھولے بلکہ اس نعرہ کے ساتھ شدت کی عقیدت رکھتے ہیں یہ پاکستان کے مسلمانوں کی تصویر کا ایک رُخ ہے اس تصویر کا دوسرا رُخ اس سے بالکل برعکس ہے جو ہمیں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیتا اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہمارا معاشرہ کس حد تک بگڑ کر دین سے دور جا چکا ہے اس کا اندازہ آپ مندرجہ ذیل باتوں سے کسی حد تک لگا سکتے ہیں۔

۱ ——— آجکل پی آئی اے کے ملازمین کی کارکردگی کا کیا حال ہے؟ "نوائے وقت" لاہور کے ۲۵ اگست ۱۹۸۱ء کے شمارے کے مطابق اس ادارہ سے نکالے جانے والے افراد جن کی تعداد تقریباً سترہ سو (۱۲۴۰ + ۳۴۰ + ۱۱۵) ہے اور جن میں افسران بھی شامل ہیں جن کو چوری، بدعنوانی، سمگلنگ اور ہنگامہ آرائی جیسے سنگین جرائم کی بنا پر برطرف

کیا۔ اگر اس ادارے کی کارکردگی کی حالت ایسی ناگفتہ بہ نہ ہوتی تو شاید پی آئی اے کا جو طیارہ حال ہی میں اغوا کر کے پہلے کابل اور بعد میں دمشق پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ اغوا نہ ہو سکتا۔ دیکھیں اس کی تحقیقاتی رپورٹ سے کیا صورتحال منظر عام پر آتی ہے۔

۲ ـــــــ آئے دن بینکوں کی مختلف برانچوں سے ڈاکہ زنی کے علاوہ لاکھوں روپے کے غبن کی خبریں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں جن میں مینیجر تک عہدہ کے بینک افسر بھی ملوث پائے گئے ہیں حالانکہ یہ بینک اب سرکاری تحویل میں جانے کی وجہ سے عوام میں زیادہ اعتماد پیدا کرنے کا سبب بننا چاہیئے تھے۔ حال ہی میں یونائیٹڈ بنک لاہور کی ایک برانچ سے بینک کے عملہ نے چالیس لاکھ روپے غبن کئے لیکن غبن کا بروقت پتہ چل جانے سے بیس لاکھ روپے پولیس کی تفتیش کے دوران دستیاب ہو چکے ہیں۔

۳ ـــــــ پنجاب کی صوبائی کونسل کے اجلاس کی جو روئداد ۲۴ اگست ۱۹۸۱ء کے "نوائے وقت" لاہور میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے مطابق صرف پنجاب میں ۲۵۰ سکول ایسے ہیں جو صرف سرکاری کاغذات پر تو موجود ہیں لیکن ڈھونڈنے پر نہ زمین پر ملتے ہیں نہ آسمان پر۔ لیکن اُن کے نام نہاد اساتذہ نہایت باقاعدگی سے ہر ماہ اپنی تنخواہ اور سکولوں کے معمول کے اخراجات ضرور وصول کرتے ہوں گے اور ان اساتذہ کی تعداد بھی ہزار ڈیڑھ ہزار سے کم کہاں ہو گی۔ اس کے علاوہ کونسل کے اجلاس میں دو ہزار ایسے سکولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جو سرے سے غائب ہیں۔ ہم یقیناً گورنر پنجاب، وزراء اور ان کونسلر حضرات کے ممنون ہیں جنھوں نے اپنے حالیہ اجلاس میں عوام کو حکومت کے مختلف محکموں میں پائی جانے والی انتہائی خراب صورتحال سے آگاہ کر کے ان کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تمام تر بگڑی ہوئی سنگین صورتحال سے کامیابی سے نپٹنے کیلئے حکومت کیا مؤثر اقدامات کرتی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم اپنے دنیاوی قائم کردہ قوانین کا سہارا لیتے ہیں۔ یا اسلامی قوانین کا ۔ مدیر نوائے وقت نے

تو اپنے اداریہ میں محکمہ تعلیم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، ذمہ دار، باشعور اور عصری تقاضوں سے آگاہ اُن اصحاب کو جو اکثریت میں ہیں اس صورتحال سے متاثر ہو کر دعوت دی ہے کہ وہ خود بھی شرمسار ہوں۔ اور ہم کو بھی شرمسار کریں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محکمہ تعلیم کے یہ حضرات شرمسار ہونے سے انکار کر دیں۔ تو کیا یہ سنگین مسئلہ یہیں ختم ہو جانا چاہیئے یوں احساس ہوتا ہے کہ مدیر صاحب نے اس مسئلہ پر سیاسی مصلحت اختیار کی ہے۔ البتہ انھوں نے اپنی روایت کے مطابق اپنے اخبار ۲۶، اگست کے اداریہ میں تان پھر اسی بات پر آکر توڑی ہے کہ جنرل ضیاء صاحب مناسب نظام کے تحت جلد انتخابات کروانیکا اہتمام کریں۔ میں بھی انکے اس مطالبے کی تائید کرنا چاہتا ہوں۔ اس ضمن میں وہ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ ان مجوزہ انتخابات میں وہ رائے دہندگی کا حق کیا ان حضرات کو دینا چاہتے ہیں۔ جو مختلف قسم کے سنگین جرائم میں بظاہر ملوث ہیں۔ اور گورنمنٹ کے محکموں میں موجود ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں موجود ہیں۔ لیکن اگر وہ قرآن کے تقاضوں کے مطابق رائے دہندگی کا حق صرف نیک ایمان والے مسلمانوں کو دینا چاہتے ہیں تو کھل کر نظام اسلام کی حمایت کرتے ہوئے مجھے بطور اپنے اخبار کے قاری کے یہ بتائیں۔ کہ ایسے نیک ایمان والے مسلمانوں کا معاشرہ میں فی صد تناسب کیا ہے اور کیا یہ تناسب اتنا کافی ہے کہ انتخابات کا عمل بخوبی سرانجام پا سکے۔

۴ ـــــــ ۲۵، اگست ۱۹۸۱ء کے "نوائے وقت" لاہور کی شہ سرخی ہے۔ کہ گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل ملک غلام جیلانی صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ ٹرانسپورٹ کے محکمے میں رشوت اور بدعنوانیاں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں حکومت کو ہر ماہ تقریباً ۲۸ لاکھ روپیہ ٹرانسپورٹ کے محکمہ کو خسارہ پورا کرنے کے لئے ادا کرنا پڑتا ہے حالانکہ اگر اس کی بسوں کو دیکھا جائے تو ہر بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوتی ہے اور ہر دیکھنے والا صرف یہی اندازہ لگاتا ہے کہ یہ محکمہ تو سالانہ کروڑوں روپے کماتا ہو گا۔ ویسے تو صدر

مملکت بھی کچھ عرصہ پہلے ٹیلیویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے صاف الفاظ میں یہ اعلان کر چکے ہیں۔ کہ پاکستان میں معمولی سے معمولی کام بھی بغیر رشوت کے نہیں ہوتا اور اسی بات کا رونا وزیر مواصلات پنجاب میاں صلاح الدین نے اسی شمارہ میں اپنے الفاظ میں یوں رویا ہے۔ کہ بے ایمانی ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی ہے۔ اور سرکاری محکموں میں بدعنوانیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

۵ ـــــــ اسی طرح زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے جو کوائف سامنے آئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں پی ایچ ڈی اساتذہ کی تعداد تو ۱۲۵ سے بھی تجاوز کئے ہوئے ہے۔ اور حکومت ہر سال تقریباً تین کروڑ روپے ان کی تنخواہوں کے ادا کرتی ہے لیکن ان کی زرعی تحقیق کا کام صفر ہے۔ للہٰذا ملک میں خاطر خواہ زرعی ترقی ہو تو کیسے ہو؟ البتہ ایک صورت ہے جس سے یہ مسئلہ شاید حل ہو سکے۔ کہ ہم ہندوستان کی حکومت سے التجا کریں کہ وہ جس شرط پر چاہے وہ ہمارے یہ اساتذہ خود لے لے اور ان کے بدلے میں اپنے ہندوستانی شاگرد ہمیں دے دے۔ میں پوچھتا ہوں کہ مدیر "نوائے وقت" آخر کن کن حضرات کو شرم دلانے کی کوشش کریں گے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جب ایک شخص بے شرم ہو جائے تو اُسے کب شرم آتی ہے؟۔ یہ حال تو کم و بیش ہر محکمہ کا ہے چاہے وہ صحت کا ہو، خوراک، سڑکوں، انہار، پولیس، بلدیات یا امدادِ باہمی وغیرہ کا ہو۔ آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے جب تک ہم سب کا دل اس بگڑی ہوئی صورتحال پر خون کے آنسو نہیں روئے گا اور ہم سب اس کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوں گے سیاسی داؤ پیچ لگاتے رہیں گے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔

۶ ـــــــ ۲۶، اگست ۱۹۸۱ء کے "نوائے وقت" لاہور میں پنجاب کونسل کے اجلاس کی جو خبر شائع ہوئی ہے اس کے مطابق انجینیرنگ کے محکمے میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے رشوت کے باقاعدہ نرخوں کے مطابق تیس ہزار روپے میٹر ریڈر کی ملازمت کے لئے پندرہ ہزار روپے سینئر کلرک کی اسامی کے لئے پانچ ہزار روپے ادا کرنا پڑتے

ہیں۔ یہ دھندا کھلے عام ہو رہا ہے ہر خاص عام کے علم میں ہے۔ حکومت کے موجودہ ناکارہ دفرسودہ قوانین اور محکمہ انسداد رشوت ستانی کی موجودگی میں ہو رہا ہے۔ آپ کو مجھ سے اتفاق کرنا ہوگا۔ کہ ایسے تمام قوانین جو مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے اور اس طرح قوم کی خدمت کرنے میں ناکام ثابت ہوں وہ ناکارہ اور فرسودہ ہی کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں اور یہ مقام ذی شعور ذمہ دار اور اصلاح معاشرہ کے داعی افراد کے لئے شرمسار ہونیکا نہیں بلکہ ڈوب مرنے کا ہے۔

ان حالات میں صاف ظاہر ہے کہ معاشرہ کی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے۔ جب تک کہ ہم اپنے دین پر سختی سے عمل پیرا نہیں ہوتے۔ اور معاشرہ کو اسلامی خطوط پر پاک وصاف اور اس کی تطہیر کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھاتے اور یہ کام اسوقت تک انجام پانا ناممکن ہے جب تک کہ ہمارے سارے علمائے دین اس ضرورت کو محسوس نہ کریں اور اس طرف متوجہ نہ ہوں انھیں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کی دین سے دوری اس بات کی واضح طور پر عکاسی کرتی ہے کہ ہمارے علمائے دین کا اپنا کیا حال ہے اور وہ مسلمانوں کو راہِ ہدایت پر چلانے کے لئے اجتماعی اور انفرادی طور پر کیا مساعی کر رہے ہیں ؟

اپنا مشاہدہ تو یہی ہے کہ ہمارے علمائے دین میں سے اکثر و بیشتر نے چاہے وہ کسی بھی مکتبۂ فکر سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں کبھی محسوس ہی نہیں کیا کہ مسلمانوں کے اخلاق و کردار کو اسلامی خطوط پر سنوارنے کی کوئی ذمہ داری بھی ہے تاکہ وہ نیک مسلمان بن کر آپس میں بھائی بھائی بننے کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہو۔ ہمارے علمائے دین نے اپنے خطبات میں جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے، رشوت لینے، ملاوٹ کرنے یا کم تولنے سے روکنے کے لئے مسلمانوں میں کبھی تبلیغ نہیں کی۔ حالانکہ جب اللہ تعالےٰ اپنے پیغمبروں کو مبعوث فرماتا تھا۔ تو ان کو صرف راہِ ہدایت سے بھٹکی ہوئی گمراہ قوموں میں بھیجتا تھا جو ظلم و سرکشی کی تمام حدود کو پاٹ کر گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے تھے۔ اور بظاہر اللہ کے منکر اور انبیاء علیہ السلام کے دشمن ہوتے تھے جیسے کہ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس اسلام کا پیغام دے کر بھیجا اور

موسیٰ علیہ السلام پر فرض کیا کہ وہ فرعون اور اس کے بندوں کے پاس جائیں اور اسلام کی تبلیغ کریں۔

ہر نبی اور ہر پیغمبر کو اللہ نے ہدایت کی راہ سے بھٹکے ہوئے گناہگار بندوں میں بھیجا تاکہ کفر اور گناہ کا خاتمہ ہو، لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور نیک و پرہیزگار بن جائیں۔ ہر دینی تبلیغ کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے دین عملی طور پر پھیلے۔ لوگ دُنیا کے مال و دولت اور جاہ و حشم پر آخرت کو ترجیح دیں۔ اور حکم خداوندی کے مطابق سب مسلمان اکٹھے مل کر بلا لحاظ گروہی فرقہ بندی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں یعنی سب مل کر سختی سے اُسکے دین پر قائم ہو جائیں۔ آپس میں تفرقہ یعنی لڑائی جھگڑا ہرگز نہ کریں۔ بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن کر پیار و محبت سے رہیں یعنی اُن میں الفت، یگانگت اور اتحاد ہو۔ لہٰذا ہمارے علمائے دین کا یہ اہم ترین فریضہ ہے۔ کہ وہ اپنے بگڑے ہوئے معاشرے کی طرف متوجہ ہوں۔ ان کے دینی امراض کو نہ صرف پہچانیں بلکہ ان امراض کو دور کرنے اور معاشرہ کی صحیح اسلامی خطوط پر اصلاح کرنے کے لیئے اپنے اندر اتحادِ فکر و عمل پیدا کریں۔ انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ مسلمانوں کا مجموعی عمل و کردار اس بات کی باشعور لوگوں اور اللہ کے لیئے اِس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ علمائے دین کس عمل و کردار اور سوچ کے مالک ہیں۔

بعض اوقات یہ جس بُرے انداز سے اپنی تبلیغ و اتحاد کے دروازے دوسرے مسلمانوں پر بند کر دیتے ہیں اور آپس میں بات بات پر تنفر کرتے ہیں۔ دین کے نام پر سب اکٹھے نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسرے کے خلاف ہی صف آرا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی اس کیفیت سے یہ گمان ہونے لگتا ہے۔ کہ اُن میں سے اکثر اپنے پیدا کردہ اختلافات کو زیادہ اہم جانتے ہوئے سورۃ آل عمران کی آیت ۱۰۳ پر کم سے کم عمل کرنے کی حد تک قطعاً ایمان نہیں رکھتے۔ اللہ کرے میرا یہ گمان غلط ہو لیکن عام مسلمان جس وقت ان کے باہمی رویہ و رقابت سے کچھ ایسا ہی تاثر لیتا ہے تو اس کیواسطے قرآن پاک کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے علمائے دین کے ساتھ ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے بے اعتنائی برتنا شروع کر دیتا ہے جس کی ایک لحاظ سے علمائے دین پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بہرحال انسان کے دل کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے اور وہ ہی سب کا

ایک نہ ایک دن محاسبہ بھی کرنے والا ہے البتہ یہ اس کا اپنا معاملہ ہے اور شانِ کبریائی ہے کہ ہم میں سے جس کو چاہے اپنے فضل و کرم سے بخش دے اور جس کو چاہے اس کے اعمال کی وجہ سے گرفت میں لے لے۔ اس وقت ہم میں سے کسی کا کوئی بہانہ عذر یا سیاسی داؤ پیچ کسی کام نہیں آئے گا۔

اندریں حالات جو مجموعی صورتِ حال ابھر کر سامنے آتی ہے اس کے مطابق مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد جس نے جنرل محمد ضیاء الحق کے ایماء پر جشنِ آزادی کے موقع پر اسلام کے ساتھ جس عقیدت کا مظاہرہ کیا وہ بہت حوصلہ افزا ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ ہمارے تمام طبقوں اور فرقوں کے علمائے دین کو اس بات پر آمادہ کر لیا جائے۔ کہ وہ اپنے تمام فروعی اختلافات چھوڑ کر نظامِ اسلام کے نفاذ و استحکام کے لیے بھرپور کوشش کر کے مسلمانوں کے عمل و کردار کی اصلاح کریں گے تاکہ وہ مادہ پرستی پر آخرت کی دائمی زندگی کو ترجیح دینا شروع کر دیں۔ تو کامیابی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے۔ کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں نظامِ اسلام کے نفاذ کے امکانات موجود تھے۔ جو اس وجہ سے ضائع ہو گئے کیونکہ تمام اسلام پسند جماعتوں میں ضروری اتحاد نہ تھا۔ بلکہ یہ انتشار کا شکار تھیں ورنہ مسلمانوں کی ۶۶ فیصد اکثریت نے ان کے حق میں ووٹ دیا تھا اس لیے ڈر لگتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارا اس معاملہ میں محاسبہ کرے تو ہمارے پاس اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں بلکہ ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہم نے دین کے تقاضوں سے اس وقت روگردانی کی تھی۔ اور صرف ۳۴ فیصد ووٹ حاصل کرنے والی سوشلسٹ جماعت نے اسلام کے حامیوں کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا۔

آج بھی مختلف فرقوں کے علمائے دین کی آپس میں اتحاد اور بھائی چارے کے بارے میں کیفیت قدرے مختلف نہیں ہے میرے خیال میں تمام اہم مذہبی راہنماؤں کو باری باری ٹیلیویژن انٹرویو کے لیے بلایا جائے سب سے ایک ہی قسم کے سوال ایک ہی ترتیب سے کر کے ان سے جوابات حاصل کیئے جائیں پہلا سوال یہ ہونا چاہیئے کہ اسلام کی رو سے اللہ پر مکمل ایمان لانے اور مسلمان تسلیم کیئے جانے کی بنیادی شرائط آپ کے نزدیک کیا ہیں ؟ دوسرا سوال یہ ہونا چاہیئے کہ کیا

ان شرائط کے مطابق دوسرے فرقوں کے لوگوں کو مسلمان تسلیم کرتے ہیں یا نہیں ؟ اور اگر آپ کسی فرقے کے لوگوں کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے تو وہ وجوہ بیان کریں جن سے وہ اللہ پر مکمل ایمان لانے کی بنیادی شرائط کو پورا نہیں کرتے۔ تیسرا سوال یہ ہونا چاہیئے کہ جن فرقوں کے لوگوں کو آپ مسلمان مانتے ہیں کیا آپ سورۃ العمران کی آیت مبارکہ ۱۰۳ کے حکم کے مطابق انھیں اپنا دینی بھائی تسلیم کرتے ہیں۔ ان سے پیار و محبت اور اتحاد کرنا اپنا دینی فریضہ مانتے ہیں۔ ؟ کیا اس اتحاد اور محبت کا مظاہرہ آپ کی آئندہ زندگی میں عملی طور پر دیکھنے میں آئے گا ؟ چوتھا سوال یہ ہونا چاہیئے کہ کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جو مسلمان اللہ کی بھائی بنانے کی اس نعمت کو قبول کرنے سے انکاری ہوگا اور اپنی دشمنی برقرار رکھنے پر اصرار کرے گا۔ اللہ کے نزدیک اس شخص کی یہ حالت ہوگی کہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑا ہوگا۔ اور وہ کسی وقت بھی اس میں گر سکتا ہے۔

میرے ناقص خیال میں ان علمائے دین اور دیگر مذہبی راہنماؤں کا مندرجہ بالا خطوط پر ساری قوم کے سامنے ٹیلیویژن پر قرآن پاک کے حوالہ سے محاسبہ کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آئیں گے اور کسی بھی شخص کو اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ہر سوال کا مثبت جواب نہ دے۔ اور دوسرے فرقوں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی مانتے ہوئے ان سے ضروری اتحاد قائم کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔ اور اس طرح نظام اسلام کے نفاذ کا حصول آسان ہو جائے گا اور اپنے دین کے تقاضوں کے مطابق ہم جتنا عمل کرنے کی کوشش کریں گے ہمارا وقار اتنا ہی بلند ہوگا۔ خاص کر ہمارے علمائے دین کا جو کہ دین کے حوالے سے اپنے مسلمانوں کا کردار سنوارنے کا باعث بنیں گے۔

اللہ ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے کہ ہم سب ایک ملت بن کر اللہ کے دین کی اس کے تقاضوں کے مطابق خدمت کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک ملت صرف اسی وقت بن سکتے ہیں۔ جبکہ ہم دین کے نام پر بھائی بھائی بن کر ہر قسم کی دشمنی چاہے وہ سیاسی ہو، ذاتی ہو یا کوئی اور ترک کر دیں۔ کیونکہ ہماری یہی دشمنی بڑھ کر کسی وقت بھی ہمارے دینی اتحاد کو پارہ پارہ کر سکتی ہے۔ اور اس طرح اللہ کے دین سے دشمنی کرنے کے مترادف قرار پا سکتی ہے۔

اس لئے یہ مقام ہم سب کے لئے سنبھلنے کا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سورۃ البقر کی آیت ۹۸ میں اعلان فرماتا ہے کہ جو اللہ کا۔ اس کے فرشتوں کا۔ اس کے رسولوں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا دشمن ہو۔ اللہ خود اس کا دشمن ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم ہر لحاظ سے دین کی پوری طرح پیروی کریں۔

سورۃ البقر کی آیت ۲۰۸ میں ارشاد باری تعالےٰ ہے :۔

"اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!"

یعنی قرآن حکیم کی ہر آیت مبارکہ پر پورا پورا عملی ایمان لاؤ یعنی ایسا نہ ہو کہ جس آیت کو موافق سمجھو اس پر تو عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ اور جس آیت کو ناموافق سمجھو اس پر عمل کرنے سے گریز کرو۔ جس طرح کہ بعض مسلمان حیلے بہانے تلاش کر کے جہاد فی سبیل اللہ سے گریز کرتے تھے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۸۷ میں ہے کہ اللہ تعالےٰ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں وہ لوگ پھر سمجھ نہیں سکتے۔

جب ہم اپنے موجودہ حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو کم و بیش اسی قسم کا معاملہ سورۃ العمران کی کی مذکورہ بالا آیت مبارکہ کے متعلق پاتے ہیں کہ سب مسلمان اکٹھے ہو کر اللہ کے دین کی رسی کو مضبوطی سے نہیں پکڑتے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر یا دنیاوی مصلحتوں کی خاطر آپس میں فرقہ بازی کرتے ہیں۔ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے یہ نہ ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے ہیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کے لئے اپنے دل میں الفت محسوس کرتے ہیں چنانچہ یہ ایک دوسرے کی دشمنی پر اتر آتے ہیں چاہے یہ بظاہر ایک ہی مسلک سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں اور اس کی ایک مثال سیاسی دشمنی سے دی جا سکتی ہے جو لیاقت باغ فائرنگ یا تاجپورہ فائرنگ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یا مال و دولت کے حصول کی کشمکش میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے سے۔ اسی ضمن میں سورۃ البقر کی آیت ۸۵ میں ہے کہ پھر تم وہ لوگ ہو کہ مار دیتے ہو ایک دوسرے کو اور اپنے میں سے ایک

فریقے کو اس کے گھروں سے نکال دیتے ہو۔ اس طرح تم ان کے ساتھ گناہ اور تعدی میں مدد کرتے
ان کو گھروں سے نکال دینا تمہارے اوپر حرام ہے کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے پر
اور کفر کرتے ہو بعض حصے پر۔ پس تم میں سے ایسے شخص کی کیا سزا جو یہ کام کرے رسوائی ہے۔
بیچ اس زندگانی دنیا کے اور پھیرے جاویں گے دن قیامت کے سخت عذاب کی طرف اور اللہ
اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو کہ تم کرتے ہو۔

اس ضمن میں تفسیر ابن کثیر میں درج ہے کہ آیت میں فرمایا ہے کہ اپنا خون نہ بہاؤ اور
اپنوں کو گھروں سے نہ نکالو یہ اس لئے کہ ہم مذہب (مسلمان) سارے کے سارے ایک جان کی
مانند ہیں حدیث میں بھی ہے کہ تمام ایماندار دوستی میں، صلہ رحمی میں اور رحم و کرم میں مثل ایک جسم
کے ہیں۔ کبھی ایک عضو کے درد سے تمام جسم بیتاب ہو جاتا ہے۔ بخار چڑھ جاتا ہے راتوں کی نیند
اچاٹ ہو جاتی ہے اسی طرح ایک ادنیٰ مسلم کے لئے سارے جہان کے مسلمانوں کو تڑپ اٹھنا
چاہیئے۔ تفسیر میں حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ کے حوالے سے مزید درج ہے کہ آپ نے راس الجالوت
سے کہا کہ تورات میں لکھا ہوا ہے کہ بنو اسرائیل کا کوئی بھی شخص گرفتار ہو جائے تو اس کو خرید کر آزاد
کیا کرو۔ اگر وہ قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو فدیہ دے کر چھڑا لیا کرو اور انھیں ان کے گھر سے
بے گھر بھی نہ کیا کرو۔ اب یا تو (تم) تورات کو مان کر اُسے خرید لو یا پھر تم تورات کے منکرین جاؤ چنانچہ
اس نے دو ہزار فدیہ دے کر اُسے چھڑا لیا۔

اس واقعہ سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام رضؓ کے نزدیک بھی قرآن پر ایمان صرف
عمل پر ہی موقوف ہے۔ اور جو اس کی کسی آیت پر عمل کرنے سے صریحاً گریز کرے وہ قرآن سے منکر
ہونے کا بظاہر ارتکاب کرتا ہے جو ہم سب مسلمانوں کے لئے لمحہ فکریہ ہونا چاہیئے۔ سورۃ التوبہ کی
آیت ۸۶ میں حکم خداوندی ہے کہ جس وقت کوئی آیت اتاری جائے۔ اس پر ایمان لاؤ۔ اور ایمان
لانے کا تقاضا اس پر نیک نیتی سے عمل کرنے کا ہے اور یہ بات اس طرح بھی سمجھ میں آتی ہے
کہ قرآن پاک کو اللہ تعالےٰ نے جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر اتارا۔ نہ کہ ان کی عقل

پر، کیونکہ قلب ہی اس کا متحمل ہو سکتا تھا۔ جب قرآن کے اثرات قلب پر مرتب ہوتے ہیں تو اعمال کا ان کے مطابق ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جس شخص کا عمل قرآن کی کسی بات پر نہیں ہے اس شخص کے قلب پر قرآن کے اثرات مرتب نہیں ہوتے اس کا ایمان اس حد تک محض زبانی کلامی ہے۔

مقام شکر ہے کہ مسلمانوں میں بتدریج یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ہم میں اُلفت، اتحاد، اشتراک و تعاون ہونا چاہیئے "نوائے وقت" لاہور مورخہ ۲۲، اکتوبر ۱۹۸۶ء کے مطابق وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات راجہ ظفر الحق صاحب نے جامعہ نعیمیہ لاہور میں ایک تقریب کے دوران تقریر کرتے ہوئے علمائے کرام سے استدعا کی کہ وہ ایسے فروعی مسائل کو وجہِ اختلاف نہ بنائیں جس سے تکلیف کا پہلو نکلے۔ اسی تقریب میں صدر محترم جناب علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب نے اپنے خطاب میں تلقین کی علمائے ملک میں اتحاد کی فضا قائم رکھیں اور ملکی سلامتی کے لئے کام کریں نظامِ اسلام قائم کرنے کے لئے علمائے حضرات سے یہ پیش رفت نہایت حوصلہ افزا ہے اللہ تعالےٰ ہمیں کامیابی سے ہمکنار کرے!

(آمین)

جدید سائنسی تحقیق کے مطابق

قرآن خدا کا کلام اور

دعوتِ دین بنام امریکی صدر جناب رونالڈ ریگن

سورۃ العمران کی آیت نمبر ۱۱۰ میں ارشادِ ربانی ہے:۔

" تم ہو بہتر اُمت جو نکالی گئی ہے۔ واسطے لوگوں کے۔ حکم کرتے ہو (تم) ساتھ بھلائی کے اور منع کرتے ہو، بُرائی سے اور ایمان لاتے ہو ساتھ اللہ کے اور اگر اہلِ کتاب بھی اللہ کے ساتھ ایمان لاتے تو یہ اُن کے واسطے بہتر ہوتا۔ بعض اُن میں سے ایمان والے ہیں اور اکثر اُن کے فاسق ہیں "

اور اسی طرح سورۃ البقر کی آیت مبارکہ ۱۴۳ میں ہے:

" اور اسی طرح ہم (اللہ) نے کیا تم کو بیچ کی یعنی بہتر اُمت تاکہ تم لوگوں کے اُوپر گواہ ہو اور ہو یں پیغمبرؐ تم پر گواہ "

ان آیات کا واضح مطلب یہی ہے کہ چونکہ اب نبوّت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے، اس لئے اب رہتی دنیا تک اللہ کے دین کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچانا اب حضورؐ کی اُمت کے ذمہ ہے اور یہ اُمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک باقی تمام اُمتوں سے بہتر اور فضیلت والی ہے۔ یہ نیک کام کرنے کا حکم دیتی ہے اور بُرے کام کرنے سے روکتی ہے۔

نوٹ:۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کے عکسِ مبارک کو جس میں انہوں نے مصر کے بادشاہ کو دعوتِ دین دی تھی، اس کتابچہ میں شائع کرا کے بظاہر اپنے فضل و کرم سے یہ سبب پیدا کر دیا کہ میں اُنؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے امریکہ کے موجودہ صدر جو اہلِ کتاب ہے کو دعوتِ دین دوں۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہو گا کہ مجھے اس عکسِ مبارک کو شائع کرنے کی خواہش کا اظہار مرکزی جماعتِ غوثیہ کے صدر محمد ارشاد اختر صاحب نے کیا جو میں نے بخوشی فوراً قبول کر لیا۔ لہٰذا اس بات کی جزا اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ضرور عطا فرمائیگا اور ان کی تبلیغِ دین کی مساعی کو کامیاب کریگا اور قبول فرمائیگا۔ آمین۔ ثم آمین۔

جماعتِ غوثیہ کا ضروری اعلان

مرکزی جماعت غوثیہ فیصل آباد کی مجلس عاملہ کا ایک خصوصی اجلاس مورخہ ۲۲، ستمبر ۱۹۸۱ء بوقت بعد نماز عصر مرکزی دفتر میں اس غرض سے منعقد ہوا کہ چونکہ جناب ڈاکٹر ارشد اللہ ہومیو صاحب نے جماعت کے مشورہ سے اپنی کتاب "دین کے آئینے میں" کے جملہ حقوق بحق سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی بخوشی محفوظ کر دینا اپنے لئے باعث سعادت جانا ہے اور اس کا فوری اعلان بھی فرما دیا ہے۔ اس لئے اندریں حالات جماعت نے مناسب غور وفکر کے بعد اس معاملہ میں مندرجہ ذیل فیصلے متفقہ قرار دادوں کی صورت میں کئے ہیں۔

۱ ـــــ جماعت غوثیہ دین اسلام کی تبلیغ کے لئے کتاب "دین کے آئینے میں" کی مالی وسائل کے مطابق زیادہ سے زیادہ اشاعت اور اس کی مفت تقسیم کو اپنے لئے ایک نہایت مؤثر ذریعۂ تبلیغ اسلام سمجھتی ہے۔ اس لئے وہ اس کتاب کو مختلف، موضوعات کے تحت حسب ضرورت کتابچوں کی صورت میں بھی شائع کرتی رہا کرے گی۔

۲ ـــــ جماعت غوثیہ کا تبلیغ دین سے یہ واضح مقصد حاصل کرنا ہوگا کہ مسلمان اپنے عمل وکردار کے لحاظ سے دین کے تقاضوں کے مطابق بہتر مسلمان بن سکیں۔ ان کے قول وفعل کے تضاد کو دور کرنا ان کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ فرقہ بندیوں سے بے نیاز ہوکر وہ سب آپس میں بھائی بھائی بن سکیں۔ دینی تقاضے کے مطابق ایک دوسرے سے محبت واتحاد کریں۔ اور اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے اس کی بظاہر پرکشش زندگی پر آخرت کو ترجیح دیں۔ جماعت کے ارکان کا کردار انشاللہ مثالی ہوگا، اور اپنی جانب سے ہر ممکن کوشش کرے گی کہ اس کتاب کے جو حقوق جناب سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور سونپ دیئے گئے ہیں ان کو پورا کرنے کا حق ادا کر سکے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرف قبولیت حاصل کر سکے۔

۳۔ ——— ڈاکٹر ارشد اللہ ہومیو صاحب گاہے بگاہے جماعت کے ساتھ جو تھوڑی بہت مالی معاونت فرمایا کریں گے جماعت اُسے بخوشی قبول کر لیا کرے گی۔" البتہ ڈاکٹر صاحب کی خواہش کے مطابق ان کا جماعت کے انتظامی اور مالی امور سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ ہوگا اور نہ وہ کسی انداز میں اس کے ذمہ دار ہونگے؛"

۴——— جماعت آخر میں اپنے قارئین حضرات کی خدمت میں گذارش کرتی ہے کہ اگر وہ اس کتاب کے اقتباسات سے کسی انداز میں مستفید ہوں اور مناسب سمجھیں تو وہ ڈاکٹر صاحب اور جماعت کے ارکان کو اپنی دعائے خیر سے نوازیں اور خود بھی ثوابِ دارین حاصل کریں۔

صدر

مرکزی جماعت غوثیہ فیصل آباد

متن نامہ مبارک حضور منبع انوار خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

بسم الله الرحمن الرحيم من محمد عبد الله ورسوله إلى المقوقس عظيم القبط سلام على من اتبع الهدى

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدا کے بندے اور اس کے رسول محمد کی جانب سے مقوقس بادشاہ قبط کی طرف۔ سلام ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔

أما بعد فإني أدعوك بدعاية الإسلام أسلم تسلم يؤتك الله أجرك مرتين فإن توليت فعليك

مابعد میں تجھ کو دعوت اسلام دیتا ہوں۔ اسلام لے آ سلامت رہے گا۔ خدا تعالیٰ تجھے دوہرا ثواب دے گا۔ اگر اسلام نہ لایا تو

اثم القبط۔ يا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك

تمام قبطیوں کے گناہ کا وبال بھی تجھ پر ہوگا۔ اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہم تم میں برابر مشترک ہے وہ یہ کہ سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کریں اور

به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون

اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور آپس میں ایک دوسرے کو خدا نہ بنائیں سوائے خدا کے۔ پس اگر اہل کتاب نہ مانیں تو کہہ دو کہ اے اہل کتاب گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

مہر مبارک پر یہ حروف (محمد رسول اللہ) اس ترتیب سے کندہ تھے

ذوالقعدہ ۶ھ میں بظاہر دبی ہوئی شرائط صلح کے ساتھ مشرکین مکہ سے صلح حدیبیہ کرنے کے چند ہی ماہ بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانروایان ممالک اور سلاطین عالم کو دعوت نامہ ہائے اسلام ارسال فرمانا، موجودہ دور میں مختلف معاملات میں بگڑے ہوئے مسلمانوں کے لئے دعوت عمل ہے۔ مسلمانان عالم کے قلوب میں اسی جذبۂ ایمانی کو ابھارنے کے لئے نامۂ مبارک کا عکس شائع کیا جا رہا ہے۔

منجانب: محمد ارشاد اختر صدر مرکزی جماعت غوثیہ غوثیہ سٹریٹ نمبر ۱۳
فاروق آباد فیصل آباد۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جدید سائنسی تحقیق کے مطابق

قرآن اللہ کا کلام

بڑا مشہور مقولہ ہے کہ "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" کچھ ایسا ہی معاملہ قرآن پاک کا ترقی یافتہ سائنس کی جدید ترین تحقیق سے ہے۔ شانِ کبریائی دیکھیں کہ پچھلے چودہ سو برس سے جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے منکر تھے۔ وہ اپنے منکر ہونے کا سب سے زیادہ سہارا سائنس سے لیتے تھے اور اپنے دلائل میں سائنسی ترقی کو بطور حجت پیش کرتے تھے کیونکہ سائنسدانوں کی منطق یہ تھی کہ جس کسی بات کی سائنس تصدیق نہیں کرتی سائنسدان اُس بات کو بطور حقیقت ماننے کو قطعاً تیار نہ تھے۔ چونکہ سائنس نے مادہ کے بہت سے پوشیدہ حقائق معلوم کئے تھے جس نے موجودہ دور کے انسان کو نہ صرف اُن سے افادہ حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا بلکہ اُسے بعض معاملات میں اس حد تک محو حیرت کر دیا کہ مادیت کا اس پر پورا غلبہ ہو گیا اور وہ مادہ پرست ہو کر رہ گیا۔ اور یہ سارا معاملہ اپنی انتہا کو اُس وقت پہنچا جس وقت سائنسدان ایک ذرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس سے بے پناہ ایٹمی توانائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا جو کہ بیک وقت ایک ایٹم بم کی صورت میں لاکھوں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن سکتی ہے۔ لہذا انسان نے دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں کی تعداد میں ایٹم بم بنا لئے اور اسی ایٹمی توانائی کو پُرامن مقاصد میں استعمال کرتے ہوئے متعدد بڑے بڑے ایٹمی بجلی گھر بنا لئے لیکن سائنسدان اپنی تحقیق و ترقی میں مزید آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ وہ خلاء میں پہنچا، چاند اور ستاروں پر اُترا۔ اور تسخیر کائنات کے عمل میں اُس نے خلاء میں اپنے متعدد مصنوعی سیاروں کو بھیجا جو اپنے اپنے مدار میں اسوقت گھوم رہے ہیں۔ اُن میں ایسے ایسے سائنسی آلات نصب ہیں جو بہت اہم قسم کی معلومات مہیا کر کے سائنسدانوں کو فراہم کر رہے ہیں۔

مادیت کا اب یہ عالم ہے کہ جو انسان کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہزار سے پندرہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضا میں بذریعہ ہوائی جہاز پرواز کرتا تھا۔ اب ان مصنوعی سیاروں اور راکٹوں کے ذریعے چوبیس ہزار سے اٹھائیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر رہا ہے۔ اور کائنات کی تشکیل اور اس سے متعلقہ راز کی باتوں پر سے پردے اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ سائنسی تحقیق کے موجودہ تمام عمل نے انسان کو بہت حد تک مجبور کر دیا ہے کہ وہ مجموعی طور پر اپنی عقل و دانش کے گھٹنے سائنسی ایجادات اور جدید ترین سائنسی انکشافات کے آگے ٹیک دے اور کھلے بندوں بلا جھجک و شرمندگی یہ اعلان بھی اب کر دے کہ انسانی عقل بہر حال محدود ہے۔ اور اس کا سہارا کسی وقت بھی ٹوٹ سکتا ہے چھوٹ بھی سکتا ہے۔

یہ بات اس انداز میں اس وجہ سے سامنے آئی ہے۔ کہ کل تک کا انسان جو سائنسی ترقی کے نام پر اپنی عقل پر فخر کرتے ہوئے اس کے سہارے اللہ کے وجود کی نفی کرتا تھا۔ اس کا منکر تھا۔ آج کی جدید سائنسی تحقیق اُسے مجبور کر رہی ہے۔ کہ وہ قرآن پاک کو الہامی کتاب ماننے اور اس وجہ سے اللہ کے وجود کو مانتے ہوئے اس پر ایمان بھی لائے۔ اور یہی شانِ کبریائی ہے کہ کل تک کا سب سے بڑا سائنس کا حجاب جو خدا کے وجود اور قرآن کو الہامی کتاب ماننے کے رستے میں حائل تھا۔ آج وہی ان مادہ پرست لوگوں کے لئے سب سے بڑا سبب دکھائی دیتا ہے کہ وہ قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہوئے اللہ پر اسکی تمام صفات عالیہ کے ساتھ ایمان لائیں۔ چاہے یہ لوگ لادین ہوں یا اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کے پیروکار ہوں، مغربی نظریات کے دلدادہ ہوں یا اشتراکیت کے، تمام لوگ اب سائنس کے ان جدید ترین انکشافات کی زد میں ہیں۔

یہ انکشافات کائنات کی تخلیق کے متعدد امور کے بارے میں ہیں جن کے متعلق صرف کچھ عرصہ پہلے تک کا دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان حتمی طور پر کچھ بھی کہنے کے قابل نہ تھا لیکن کائنات کی تخلیق کے ان ہی امور کے بارے میں قرآن حکیم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے چودہ سو برس پہلے جو اعلانات فرما دیئے تھے اور جو دعوے پیش کر دیئے تھے۔ وہ آج موجودہ سائنسی تحقیق کی بدولت حرف بحرف سچ ثابت ہو رہے ہیں۔ چنانچہ جدید دور کا جو سائنسدان

سائنسی تحقیق کے مذکورہ انکشافات کے ساتھ ساتھ قرآن میں ان کے ذکر سے روشناس ہو رہا ہے اور اُسے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں قرآن میں چودہ سو برس پہلے اس وقت کہی گئی تھیں جس وقت کہ سائنس کے پاس نہ تو آج کے جدید ترین آلات تھے جن کے بغیر ان حیرت انگیز انکشافات کا حاصل ہونا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا تو وہ بوکھلا اٹھتا ہے۔ پریشانی کی حالت میں ندامت کے ساتھ اپنی پیشانی کا پسینہ بار بار پونچھتا ہے لیکن پسینہ ہے کہ سوکھنے کا نام ہی نہیں لیتا کیونکہ اس کا واحد حل صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو اب خلوص دل سے آخری الہامی کتاب مانتے ہوئے اللہ پر ضروری ایمان لے آئے اور اس کے آگے سجدہ ریز ہو جائے۔ اور اپنی ماضی کی تمام سرکشیوں کی دل سے توبہ کر لے اس سے نہ صرف اُسکی پیشانی کا پسینہ ہمیشہ کے لیے خشک ہو جائے گا۔ شرمندگی و خواری کا احساس ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ احساس کمتری سے ابدی نجات حاصل ہوگی۔ بلکہ ایک نہ ختم ہونے والا گوناگوں سکون دل کو نصیب ہوگا۔ اور یہ دُنیا اور آخرت کے سنور جانے کا ایک دلپذیر دائمی سکونِ قلب حاصل ہوگا جو دُنیا بھر کی تمام دولت ادا کر دینے کے عوض بھی نہیں ملتا۔

چونکہ سائنس کے کائنات کے بارے میں جدید انکشافات سب سے پہلے مغربی سائنسدانوں نے کئے۔ جن میں سے متعدد عیسائی ہونے کیوجہ سے بائیبل پر بھی مناسب عبور حاصل رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ فوراً محسوس کیا کہ انجیل میں خدا کے حوالے سے کائنات کی تخلیق کے بارے میں جو محدود پیشین گوئیاں اور دعوے کئے گئے ہیں وہ سائنس کی جدید تحقیق نے غلط ثابت کر دیئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان سائنسدانوں میں سے اکثر و بیشتر کا اللہ اور انجیل دونوں پر ایمان متزلزل ہو گیا۔ اور جوں جوں دیگر عیسائی بھی اس صورت حال سے آگاہ ہوتے گئے۔ ان میں اپنے دین کا تقدس ختم ہوگیا۔ اور وہ عیسائیت سے تیزی سے دور ہونے لگے۔ اس صورت حال نے عیسائیت کے مذہبی پیشواؤں کو بے حد فکرمند کر دیا۔ اور وہ اس بظاہر بگڑتی ہوئی صورت حال کو سنبھالا دینے کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ ویٹی کین (VaTican) میں پوپ کے ماتحت جو

عیسائی راہنماؤں کا مذہبی ادارہ قرآن پاک کا دوسرے مذاہب سے تقابلی مطالعہ و تحقیق کرنے میں مصروف تھا۔ وہ جلد ہی اس راز کو پا گیا۔ کہ قرآن میں خدا تعالیٰ نے جو متعدد پیشین گوئیاں اور دعوے کئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جن پر اب تک سائنس واضح تحقیق کر سکی ہے وہ سب کے سب سچ ثابت ہو رہے ہیں۔ چنانچہ پوپ کو اس معاملہ میں دنیا کے تمام پادریوں اور گرجا گھروں کے لئے اس سلسلہ میں ایک دستاویز شائع کرنا پڑی۔ جس میں پہلی بار عیسائی راہنماؤں کی جانب سے یہ تسلیم کیا گیا کہ قرآن بھی انجیل کی طرح ایک الہامی کتاب ہے اور عیسائیوں اور مسلمانوں کا خدا بھی ایک ہی ہے البتہ مسلمان خدا کو اللہ کہہ کر پکارتے ہیں کیونکہ خدا کا عربی زبان میں ترجمہ اللہ ہے۔ اور قرآن بھی عربی زبان ہی میں نازل ہوا ہے۔ جیسے کہ آپ نے بھی نوٹ کیا ہو گا۔

اس سال عید الفطر کے موقع پر امریکہ کے موجودہ صدر رونالڈ ریگن نے افغان مجاہدین کو جو مبارکباد کا پیغام اُن کی حوصلہ افزائی کے لئے بھیجا ہے تاکہ وہ روس کے خلاف اپنے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد جاری رکھیں۔ اس میں انھوں نے بڑے فخریہ انداز میں یہ کہا ہے کہ ہم اور آپ یعنی عیسائی اور مسلمان ایک ہی خدا کو مانتے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کا اعلان کرنے کا مقصد مسلمانوں میں یہ تاثر پیدا کرنا ہے کہ اس وجہ سے مذہب کے نام پر مسلمانوں اور عیسائیوں میں باہمی مفاہمت و اتحاد پیدا ہونا چاہیئے یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ریگن صاحب کو کوئی عیسائی راہنما یہ بھی بتائے کہ فلسطین کے مسلمانوں اور امریکہ کے عیسائیوں اور یہودیوں کا خدا بھی وہی ہے جو افغان مجاہدین کا ہے۔ اور یہی خدا بیت المقدس کے مسلمانوں کا بھی ہے۔۔ مقبوضہ عرب علاقوں کے مسلمانوں کا بھی یہی خدا ہے۔ چاہے وہ مقبوضہ عرب علاقے مصر کے ہوں، شام کے ہوں یا اردن کے۔ یہاں تک کہ لبنان کے مسلمانوں کا بھی وہی خدا ہے جس کی صدر ریگن یا اسرائیل کے وزیر اعظم بیگن یا دنیا کے عیسائی پیشوا پوپ پال عبادت کرتے ہیں۔ ویسے مسلمان تو حضرت عیسٰے علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام (دونوں) کو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی مانتے ہیں۔ اُن کی نبوت پر پورا ایمان رکھتے ہیں

اور اُن کی شایانِ شان عزت کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اب جب عیسائیوں پر جدید سائنسی تحقیق کی بدولت یہ بات منکشف ہو گئی کہ قرآن واقعی الہامی کتاب ہے اور انہوں نے اس بات کو برملا اپنی مذہبی دستاویز میں ماننے کا اعلان کر دیا تو پھر قرآن میں موجود خدا کے اِس حکم کو بھی ان کے لیے ماننا لازمی ہو گیا کہ قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے جس کے ذریعے سے دین کو اب مکمل کر دیا گیا ہے۔ جناب رسول پاک حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔ ان پر ایمان لانا بھی اب اُتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام پر یا حضرت موسےٰ علیہ السلام پر لانا ضروری تھا اور اب بھی ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ چونکہ حضرت موسےٰ علیہ السلام اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے دورِ نبوت اپنے اپنے وقت کے ساتھ ختم ہو چکے ہیں۔ اس لیے اب جو موجودہ دور کے نبی یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کے دور کو جو رہتی دُنیا تک باقی رہے گا۔ ان پر ایمان لایا جائے۔ اور یہ حکمِ خداوندی "تاقیامت تمام نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ چاہیے وہ اسرائیلی ہو یا عیسائی یا چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، یا نہ رکھتا ہو یعنی لا دین ہو کیونکہ یہ احکاماتِ خداوندی اس قرآن میں درج ہیں۔ جس کے الہامی کتاب ہونے کا ثبوت جدید سائنسی تحقیق مہیّا کر رہی ہے۔

یہ مندرجہ بالا باتیں کھل کر اس انداز میں اُس وقت سامنے آئیں جب مجھے جناب مارس بکالے کی کتاب (انگریزی ترجمہ) بعنوان "دی بائیبل۔ دی قرآن۔ اینڈ سائنس"۔ کا مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب کے مندرجات کے مطابق مارس بکالے ایک ماہر فرانسیسی سرجن ہیں۔ جنہیں جدید سائنسی تحقیقات اور ان کے نتائج سے بے حد دلچسپی ہے۔ وہ خود بھی اپنے منفرد انداز میں ایک زبردست محقق ہیں۔ اور یہ مذکورہ بالا کتاب اُن کی اُسی تحقیقی کوشش کا ایک کامیاب نتیجہ ہے۔

وہ اپنی کتاب میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ میں نے جس وقت جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بائیبل میں مندرج دعووں اور پیشین گوئیوں کا مقابلہ کیا تو میرا بائیبل پر

بحیثیت ایک الہامی کتاب کے یقین اُٹھ گیا۔ اور خدا کے وجود اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے نبی ہونے کے بارے میں شک و شبہ کا شکار ہو گیا میں اسی قسم کی کیفیت سے گذر رہا تھا کہ میں نے مشاہدہ کیا کہ میں اپنی زندگی میں جن لوگوں سے ملتا ہوں اُن میں سے مسلمانوں کو میں جسمانی، ذہنی اور روحانی کیفیت میں دوسرے لوگوں سے مختلف اور بہتر حالت میں پاتا ہوں۔ چنانچہ میرے اندر یہ تجسس اور تحریک پیدا ہوئی کہ میں اس صورت حال کی وجہ معلوم کروں مجھے جس وقت یہ علم ہوا کہ مسلمان اللہ کے وجود پر ایمان رکھتے ہیں قرآن کو الہامی کتاب اور محمدؐ کو اللہ کا نبی مانتے ہیں تو میں نے صحیح حقیقت حال تک پہنچنے کے لیے قرآن حکیم کا خود تنقیدی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہونے کا دعویٰ کیا گیا تھا۔ لہٰذا میری سائنسی انداز میں تحقیق کرنے کا تقاضا بھی بجا طور پر یہی پیدا ہوا کہ قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے۔ کہ میں پہلے عربی زبان پر خاطر خواہ عبور حاصل کروں تاکہ مجھے بعد میں قرآن کے صحیح مفہوم کو سمجھنے میں مدد ملے۔

لیکن اس مقام پر یہ بات کہتے ہوئے مجھے کوئی شرم یا عار محسوس نہیں ہوتی کہ اگرچہ میں بظاہر کھلے دل سے تحقیق کے سائنسی تقاضے کو پورا کر رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں اپنے دل سے اُس ذہنی تعصب کو نہ نکال سکا جو سائنسی انکشافات نے میرے اندر بائیبل اور خدا کے وجود کے بارے میں پیدا کئے ہوئے تھے۔ اور اس پر طرہ یہ تھا کہ اسلام کے متعلق تو میرے اندر بچپن کی اس تعلیم نے ہی ایسا زبردست نفسیاتی تعصب پہلے ہی پیدا کیا ہوا تھا۔ جو میں نے اپنے عیسائیت کے راہنماؤں سے اسلام کے بارے میں حاصل کی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں یقین کی حد تک پُرامید تھا کہ میں جلد ہی جدید سائنسی حوالہ جات کی مدد سے یہ ثابت کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ کہ قرآن الہامی کتاب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں کائنات کی تخلیق کے بارے میں جو متعدد دعوے اور پیشین گوئیاں کی ہوئی ہیں وہ سب جھوٹی اور غلط ثابت ہو جائیں گی۔

لیکن میری حیرت کی اُس وقت کوئی انتہا نہ رہی جس وقت میں نے یہ نوٹ کیا

کہ قرآن میں کائنات کی تخلیق کے بارے میں چودہ سو سال پہلے پیشین گوئیاں کی گئی ہیں ان میں سے جن پر جدید سائنسی تحقیق کر کے جتنی نتائج اخذ کر چکی ہے وہ آج سے پچاس یا سو سال پہلے کا سائنسدان موجودہ جدید سائنسی آلات کی مدد کے بغیر اُن کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے سے خود قاصر تھا۔ لیکن قرآن میں ان پیشین گوئیوں اور دعووں کی جدید سائنسی تحقیق تائید کر کے قرآن کے الہامی کتاب ہونے کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ چنانچہ میں مجبور ہوا کہ قرآن کو خدا کی الہامی کتاب مانوں اور چونکہ قرآن انجیل کا بھی بطور الہامی کتاب اور عیسٰی علیہ السلام کا بطور اللہ کے نبی مبعوث ہونے کا ذکر آتا ہے۔ لہٰذا میں مجبور ہو گیا کہ میں دوبارہ انجیل اور عیسٰی علیہ السلام پر ایمان لاؤں۔

اس سلسلہ میں میں نے جب مزید تحقیق کی تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عیسٰی علیہ السلام کے زمانے میں انجیل کو کتابی شکل میں محفوظ نہیں کیا گیا تھا انجیل کے حوالے سے تمام تبلیغ زبانی کلامی تھی۔ اور جب چھ سات سو برس بعد انجیل کو کتابی شکل دینے کی پہلی بار ضرورت محسوس کی گئی۔ اُسوقت انجیل میں بطور الہامی کتاب کے اتنی زیادہ تبدیلی ہو چکی تھی۔ کہ اسکو الہامی کتاب کی بجائے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیمات کو قلمبند کرنے والے اُس دور کے شخص کے خیالات کا مجموعہ اگر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب مختلف ادوار میں مختلف لوگوں نے مختلف ممالک میں انجیل کو مرتب کیا تو ایک انجیل کا متن دوسری انجیل کے متن سے مختلف تھا۔ یہاں تک کہ ایک انجیل میں مندرج پیشین گوئیاں اور دعوے دوسری انجیل میں مندرج پیشین گوئیوں اور دعوؤں سے مختلف ہونے لگے۔

چنانچہ میں نے جسوقت فرانسیسی سرجن کی اس کتاب "دی بائبل - دی قرآن اینڈ سائنس"۔ کو پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ اس اہم کتاب کے ضروری حوالہ جات سے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کو آگاہ کیا جائے تاکہ جس وقت اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اسلام کے موضوع پر اسلامی دنیا کے منتخب نمائندہ کی حیثیت سے خطاب کریں اور غیر اسلامی دنیا کو اسلام کے اہم پہلوؤں یا سے بطور اللہ کے

دین سے روشناس کرائیں وہاں وہ غیر مسلم دُنیا کو جدید سائنسی تحقیق کے حوالے سے اس مشہور کتاب کے اہم اقتباسات سے بھی روشناس کرائیں۔ جو اُن ہی میں سے ایک غیر مسلم سائنسدان و مفکر نے اس ضمن میں قرآن کو خدا کی الہامی کتاب ثابت کرنے کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔

میری صحت چونکہ ان دِنوں زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اس لئے میں یہ خط صدرِ محترم کو ۱۸ ستمبر ۱۹۸۰ء سے قبل لکھ کر روانہ کر سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر صاحب خط پہنچنے کے چند دن کے اندر اندر پاکستان سے اپنے پہلے سے طے شدہ پروگرام سے کچھ دن پہلے ہی روانہ ہونے پر مجبور ہو گئے اُن دِنوں ایران عراق جنگ جاری تھی۔ اور انھیں امریکہ پہنچنے سے پہلے اِن دو ممالک کا اسلامی ممالک کے نمائندہ کی حیثیت سے دَورہ کرنا تھا تاکہ معلوم کیا جا سکے کہ اِن دو ممالک کے درمیان جنگ بند کرانے کے کیا امکانات ہیں؟ چنانچہ اِن باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدر صاحب امریکہ روانہ ہونے سے پہلے میرے خط پر اپنی ذاتی توجّہ نہ دے سکے۔ البتہ اگر انھیں ایسا کرنے کا مناسب وقت مل جاتا تو ہو سکتا ہے کہ صدر صاحب کے خطاب میں اس خط کے حوالہ سے غیر مسلم دُنیا پر کچھ اور باتیں بھی واضح ہو جاتیں مثلاً جدید سائنسی تحقیق ہمیں بتاتی ہے۔ کہ کائنات کی تخلیق کا عمل سب سے پہلے گیسوں سے ہوا۔ اور قرآن حکیم کی سورۃ حٰمٓ السجدۃ آیت بتاتی ہے۔ کہ جب اللہ نے آسمان کو بنانے کا قصد کیا۔ تو وہ دھواں تھا یعنی گیس۔ پھر سورۃ نازعات آیت ۳۰ میں ہے کہ اللہ نے آسمان کے بعد زمین کو بچھا دیا اور اس میں سے پانی نکالا۔

چونکہ خط کا متن جدید سائنسی تحقیق کی روشنی کے حوالہ سے نہایت اہم ہے اور قرآن کو الہامی کتاب ثابت کرنے کا مواد فراہم کرتا ہے اس لئے اس خط کو مسلمان بھائیوں کے علم کے لئے بالعموم اور غیر مسلموں کے لئے بالخصوص شائع کرتا ہوں۔

متن مندرجہ ذیل ہے:۔

عنوانِ خط:۔ آپکا اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اسلامی امور کے بارے میں یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء کا خطاب

عزیز دینی بھائی جنرل محمد ضیاء الحق صاحب!

السلام علیکم!

اخباری اطلاعات کے مطابق آپ یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء جنرل اسمبلی کے اجلاس سے اسلامی دُنیا کے نمائندہ کی حیثیت سے اسلامی معاملات پر خطاب فرما رہے ہیں اس سے آپ کو ایک نایاب و عظیم موقع فراہم ہوتا ہے جس کے ذریعے آپ اسلام کی تبلیغ و تعارف غیر مسلموں میں دُنیا کے موجودہ سب سے بڑے پلیٹ فارم سے کریں۔ اور دُنیا بھر کا مواصلاتی نظام بشمول ریڈیو۔ ٹی وی اور اخبارات سے توقع ہے کہ وہ آپ کے پیغام کو بحیثیت جنرل اسمبلی کی کارروائی کے دُنیا کے دور دراز کونوں تک، پہنچا دیں گے اس لیئے اگر آپ آج کل کی کشمکش میں مبتلا دکھی دُنیا کو اپنے اسلام کے پیغام میں امن و آشتی کی امید دلا کر حوصلہ افزائی کرنے کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ آپ کی سب سے بڑی کامیابی و جیت ہو گی۔ جو آخرت میں بھی آپ کو سرخرو کرے گی۔ لہٰذا تمام اسلام سے لگن رکھنے والے مسلمانوں کے لیئے یہ موقع نہایت اہم و نازک ہے میں اللہ تعالےٰ سے آپ کی کوششوں کی شاندار کامیابی کے لیئے دعا گو ہوں۔

یقیناً آپ اپنے خطاب کی تیاری پر اسی لگن سے کام کر رہے ہوں گے جس کا وہ تقاضا کرتا ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ آپ انشاءاللہ اس فرض کو احسن طریقے بخوبی سرانجام دیں گے۔ اس کے باوجود میں خیال کرتا ہوں کہ اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے اگر میں آپ کی خدمت چند گذارشات آپ کی ذاتی توجہ حاصل کرنے کے لیئے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی گاہے بگاہے کرتا رہا ہوں۔ (اس سلسلہ میں آپ براہِ مہربانی اپنا خط نمبری -57/50/IB

80 / ATAG/CMLA / مؤرخہ ۸۰-۳-۶ کی طرف رجوع کر سکتے ہیں)۔

ہو سکتا ہے کہ آپ میری اِن گذارشات میں سے کچھ سے متاثر ہو جائیں اور اِن پر اپنے جنرل اسمبلی کے خطاب میں اظہار خیال فرمانے کا فیصلہ کر لیں۔ کم از کم میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ اسلام کے بارے میں میری یہ معروضات غیر اسلامی دُنیا کے لئے نہایت اہم اور دلچسپی کی حامل ہیں"۔

"اس لحاظ سے اسلام کے متعلق الہامی علم ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ بدقسمتی سے قرآن کے وہ حصّے خاص کر سائنسی کوائف سے متعلقہ ہیں اُن کا بُرا ترجمہ اور غلط مطلب اخذ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے ایک سائنسدان کو ظاہری طور پر پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن پر نکتہ چینی کرے۔ جو کہ حقیقت کی رُو سے قرآن پر بالکل نہیں ہونی چاہیئے اور قطعاً جائز نہیں ہے۔ اس لیئے اس بارے میں تفصیل پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ آج کے سائنسدان کو اس بات پر سخت رنج ہوتا ہے کہ قرآن کا غلط ترجمہ اور غلط تشریح معہ کہ عملی طور پر پڑھنے والے کے لئے ایک دوسرے کا حصّہ بن چکی ہیں۔

آج سے سو یا دو سو سال قبل کسی کے لئے قابلِ حیرانگی نہ ہوتی جب کوئی سائنس دان قرآنی آیت کے کسی حصّہ کی جبکہ غلط تشریح کی گئی ہو۔ کا سنجیدگی سے نوٹس لینے سے رکاوٹ بنتا ہے اس قسم کے غلط ترجمہ اور غلط تشریح کی مثال قرآن کے اس باب سے دی جا سکتی ہے جس کا کہ تعلق انسان کی تخلیق و پیدائش سے ہے"۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ کی ایسی مذکورہ غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں؟

ان کی وضاحت اس حقیقت سے کی جا سکتی ہے کہ موجودہ دَور کے ترجمان اکثر اوقات بغیر تنقیدی نگاہ کے پرانے ترجمانوں کی تشریحات اپنا لیتے ہیں۔ اپنے زمانے میں پہلے ترجمانوں کے پاس یہ جواز کسی حد تک تھا کہ وہ عربی زبان کے کسی لفظ کے غیر متعلقہ معنی یا تعریف اس وجہ سے کر جائے کیونکہ اس مذکورہ لفظ کے کئی ممکنہ معانی ہوں، لیکن ترجمان اس لفظ کے صحیح معنی حاصل کرنے اور پیش کرنے سے قاصر رہا ہو۔ لیکن موجودہ دَور کے سائنسی علم کے حصول کی بدولت اب اس مذکورہ عربی زبان کے لفظ

یا جملہ کے صحیح معنی اور تشریح واضح طور پر سامنے آگئی ہے دوسرے الفاظ میں اب اس بات کی ضرورت اجاگر ہوگئی ہے کہ ان حالات میں قرآن کا نئے سرے سے صحیح ترجمہ اور تشریح کی جائے۔ اس سے پہلے اگرچہ ایک خاص ماضی کے حد تک ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن اب جبکہ ہمارے پاس ایسا علم ہے جو کہ ہماری معاونت کرتا ہے۔ ایسا کرنا نہ صرف مناسب بلکہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ خط قدرے تفصیل کے ساتھ مادّہ پرست دُنیا کے جدید رُجحات پر جدید سائنس کے حوالے سے ہی بحث کرتا ہے اور جدید سائنس کے تعلق سے آسمانی صحیفوں کا ذکر کرتا ہے اور اس طرح اس حوالہ کی مدد سے سائنسی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے جو کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے (حضورؐ پر) وحی کی گئی۔ بالعموم دُنیا کا، خاص طور پر مغربی دُنیا کا۔ بتدریج بڑھتا ہوا جدید سائنس کی طرف رُخ جو حالیہ عشروں میں دیکھنے میں آیا ہے اس نے بدقسمتی سے لوگوں کو مذہب سے چڑا چڑا کر متواتر دور کر دیا ہے اس لیئے اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دی جائے۔ تو بظاہر ان لوگوں نے کوئی سنجیدہ کوشش اسلام کے مطالعہ اور اسکو سمجھنے کی نہیں کی۔ تاکہ وہ اسلام کے متعلق صحیح صورتحال سے آگاہ ہو سکتے۔ جس کے حصول کے لیئے یہ ضروری تھا کہ یہ غیر مسلم خود کو اپنے مفروضہ لیکن غیر حقیقی صدیوں پرانے۔ خود ساختہ ذہنی تعصّبوں سے آزاد ہو کر قرآن کا سائنسی انداز میں مطالعہ کرتے۔ جو چودہ سو برس پہلے نازل ہوا تھا بہرحال اس بات سے قدرے تسلّی ہوتی ہے کہ کہیں نہ کہیں اِکّا دُکّا کوششیں ہو رہی ہیں۔ کہ ان تعصّبات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ اسلام یقیناً اس متعصّبانہ رویّہ میں صحتمند تبدیلی کا متقاضی ہے جو رویّہ محض لاعلمی۔ سچائی کو ماننے کی خواہش کا فقدان یا محض ناحق تعصّب کی بنا پر وہ لوگ اپنا ئیں۔ جو بڑے فخر کے ساتھ یہ دعوے کریں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہیں۔ خاص کر مغرب کے لوگ۔

یہاں۔ اِس سلسلہ میں میرے لیئے موزوں ہوگا کہ اس کتاب سے مناسب حوالہ جات دوں جس کا کہ نام "دی بائبل۔ دی قرآن اور دی سائنس" ہے جسے

مارس بکالے نے جو کہ ایک فرانسیسی سرجن ہے نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اِس کتاب کو اس نے ابتداءً فرانسیسی زُبان میں لکھا ہے لیکن اِس کتاب کے نفسِ مضمون کی اہمیت کی وجہ سے اس کا انگریزی زبان میں بھی مصنف اور اِس کے معاون ، الیسئر۔ ڈی ۔ پینل نے کیا ہے بکالے لکھتا ہے کہ:-

"یہودیت اور عیسائیت اپنی اِس بے بسی کو مخفی نہیں رکھتے کہ وہ مادّیت کی لہر اور لادینیت کے حملہ سے نپٹ سکیں دونوں اپنی بے خبری میں اِن کا شکار ہو گئے اور ایک عشرے سے دوسرے عشرت تک جس بُری طرح اِن کی مزاحمت اس لہر کے خلاف کم ہوتی گئی جو کہ اپنی لپیٹ میں ہر چیز کو بہالے جانیکا خطرہ اپنے اندر رکھتی تھی ۔ مادہ پرست لادینی شخص کو موجودہ عیسائیت سوائے اِس کے کچھ نظر نہیں آتا کہ یہ ایک محض ایسا تیار کردہ انسانی نظام ہے جو دو ہزار سال قبل اِس بات کو یقینی بنانے کے لیئے تیار کیا گیا تھا جس کے ذریعے ایک اقلیت کی حاکمیت اپنے ہی لوگوں پر یقینی بنا دی جائے ۔ یہ مادہ پرست انسان یہودی اور عیسائی عبارتوں میں ایسی کوئی چیز پانے سے قاصر ہے جو کہ اس زبان سے تھوڑی بہت ملتی جلتی ہو جسے وہ اپنا چکا ہے اور جسے وہ سمجھتا اور بولتا ہو ۔ یہ عبارتیں اُس کے لئے بعید از قیاس ، ناموافق اور جدید سائنسی معلومات کے متضاد ہیں اِس لیئے وہ اِن عبارات پر غور و فکر کرنے سے انکاری ہے جس پر کہ دینی راہنماؤں کی اکثریت تسلیم کرنے اور اپنانے کی دعوت دیتی ہے "

" جب کوئی لادینی مادہ پرست سے اسلام کا ذِکر کرتا ہے تو وہ ایک ایسی خوش فہمی سے مسکرا دیتا ہے جو کہ اُس کے اسلام کے بارے میں لاعلمی کے عین مطابق و برابر ہوتی ہے ۔ مغربی دانشوروں کی اکثریت کی طرح چاہے وہ مذہب کے بارے کیسے ہی تاثرات یا جھکاؤ رکھتے ہیں وہ بھی اپنے اندر اسلام کے متعلق غلط نظریات پر مبنی ایک مجموعہ افکار رکھتا ہے "۔

"اِس معاملہ میں ایسے شخص کو ایک جواز پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے ۔ پہلے یہ کہ علاوہ اس کے کہ جو کیتھولک پیشواؤں میں جو نئے رویئے غالب آ رہے ہیں اسلام کو دوسرے مذاہب سے علیحدہ کر کے جو مغرب میں ہمیشہ سے گھناؤنے مگر جھوٹے الزامات عائد کیئے جا رہے ہیں ۔ مغرب میں جس کسی نے بھی اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اُسے معلوم ہے کہ کس حد تک اس کی تاریخ ، مذہبی عقائد اور اس کے مقاصد کو توڑ پھوڑ کر پیش کیا گیا ہے ۔ پھر یہ حقیقت بھی مدِ نظر رہنی چاہیئے ۔ کہ اس موضوع پر جو دستاویزات مغربی زبانوں میں شائع ہوئی ہیں (ماسوائے اعلیٰ سطح کے خصوصی مطالعہ کے) وہ اِس شخص کے کام میں کوئی آسانی پیدا نہیں کرتیں ۔ جو اُن کے بارے میں صحیح علم حاصل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے ۔"

"اِس نکتہ نگاہ سے اسلام کا الہامی علم بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔ بدقسمتی سے قرآن کے وہ حوالہ جات یا حصّے جو کہ خاص طور پر سائنسی کوائف سے متعلق ہیں اُن کا غلط ترجمہ اور تشریح کی گئی ہے جس کی وجہ سے ایک سائنسدان کو پورا حق پہنچتا ہے کہ وہ اِن پر جو تنقید کرے وہ بظاہر جائز ہو لیکن حقیقت میں وہ اِسکی سزاوار نہ ہو ۔ اِس لیئے اس کی تفصیل قابلِ غور ہے ترجمہ کی غلطیاں یا غلط تشریحات (جو کہ ایک دوسرے کیساتھ منسلک ہیں) جنھوں نے ایک یا دو صدی پہلے کسی کو حیران نہیں کیا ہو گا آج کے سائنسدان کو بیزار کرتی ہیں جب یہ سائنسدان کسی ایسے غلط ترجمہ والے جملے سے دوچار ہوتا ہے جس کا کہ تعلق کہ سائنس کے ایسے بیان سے ہو ۔ جو اس کے لئے قابلِ قبول نہ ہو تو یہ سائنسدان ایسے جملے پر سنجیدگی سے غور کرنے سے روک دیا جاتا ہے ۔ انسانی پیدائش کے باب میں سے اس قسم کی غلطی کی اِس ضمن میں ایک خاص مثال دی جائے گی ۔"

ترجمہ میں ایسی غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں۔ ان کی وضاحت اس حقیقت سے کی جا سکتی ہے کہ جدید ترجمہ کرنے والے اکثر اوقات بغیر تنقیدی نگاہ کے پرانے ترجموں اور تشریحات کو اپنا لیتے ہیں۔ ان کے زمانے میں پہلے ترجمہ کرنے والوں کے پاس یہ جواز تھا۔ کہ چونکہ عربی زبان کے ایک لفظ کے کئی ممکنہ معنی ہوتے ہیں اس وجہ سے وہ صحیح ترجمہ پیش کرنے سے قاصر رہے لیکن سائنس کے موجودہ علم نے ان کے صحیح معنی سمجھنے اور پیش کرنے میں مدد کی دوسرے الفاظ میں یہ مسئلہ اب پیدا ہو گیا ہے کہ ان پہلے ترجموں اور تشریحوں پر نظر ثانی کی جائے۔ ایسا کرنا ماضی میں ایک خاص وقت تک ممکن نہ تھا۔ لیکن آجکل ہمارے پاس ایسا علم موجود ہے جو ہمیں اس اہل بناتا ہے کہ ہم اب ان کے صحیح معنی کریں۔"

ترجمہ کی یہ مشکلات یہودی عیسائی صحیفوں کے بارے میں موجود نہیں جو درپیش مشکل یہاں بیان کی گئی ہے یہ صرف قرآن تک ہی محدود ہے:

"یہ سائنسی سوچ بچار جو قرآن سے بہت زیادہ متعلقہ ہیں انھوں نے شروع شروع میں مجھے بہت حیران کر دیا اس وقت تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص قرآن میں اتنی زیادہ تعداد میں ایسے بیانات نہایت مختلف موضوعات پر پائے گا۔ جن کی کہ مکمل طور پر تصدیق جدید سائنسی علم کرے گا۔ شروع میں میرا اسلام پر قطعاً کوئی یقین نہیں تھا۔ میں نے قرآن کا کھلے دل سے تنقیدی جائزہ شروع کیا۔ اس وقت اگر کوئی اثر مجھ پر غالب تھا تو وہ اس تعلیم کی وجہ سے تھا۔ جو میں نے جوانی میں حاصل کیا تھا لوگ اس وقت مسلمانوں کی بات نہ کرتے تھے۔ بلکہ انھیں "محمڈن" کہتے تھے تاکہ وہ یہ بات بالکل واضح کر سکیں کہ اس سے ان کا مطلب ایک ایسا مذہب ظاہر کرنا تھا جو کہ ایک انسان کا قائم کردہ ہو اور اس وجہ سے ایسے مذہب کی خدا کی نسبت سے کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ مغرب

کے بے شمار لوگوں کی طرح ہیں بھی اسلام کے متعلق جھوٹے نظریات کو برقرار رکھ سکتا تھا اور یہ نظریات اس طرح وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے ہیں کہ میں حقیقتاً حیران ہو جاتا ہوں جس وقت کہ میں کسی ایسے شخص سے ماسوائے اس کے کہ جس نے کہ خاص طور پر اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہو سے ملوں جو کہ اس ضمن میں روشن خیالی سے گفتگو کر سکے ۔ ا سے ہیں یہ بات مانتا ہوں کہ بیشتر اس کے کہ مجھے اسلام کے متعلق مغرب کے نظریہ سے مختلف علم فراہم ہوا ہیں انتہائی لاعلمی کے عالم میں تھا"۔

سرجن بکالے اپنی کتاب میں مشہور یونیورسلز انسائیکلو پیڈیا کے متعلق مندرجہ ذیل باتیں کہتا ہے :-

" بیشتر اس کے کہ اسلامی انقلاب اور سائنس کے درمیان کوئی محاذ آرائی ہو یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے خدوخال کو بیان کیا جائے جس کے متعلق کہ مغرب والوں کو برائے نام معلوم ہے "

" مغرب میں اسلام کے متعلق مکمل طور پر غلط بیانات بعض اوقات لاعلمی کی بنا پر مبنی ہوتے ہیں اور بعض اوقات سوچی سمجھی سکیم کے تحت ، سب سے مخدوش جھوٹ جو اس کے بارے میں بولے جاتے ہیں۔ وہ ہیں جو حقائق سے واسطہ رکھتے ہیں کیونکہ غلط آرار تو قابل معافی ہوتی ہیں لیکن حقائق کو غلط انداز میں جان بوجھ کر پیش کرنا قابل معافی نہیں ۔ یہ بات بڑی تشویشناک ہے کہ شہرہ آفاق مصنفوں کے بظاہر قابل احترام مجموعوں میں سفید جھوٹ پر مبنی باتیں لکھی جائیں ۔ مندرجہ ذیل ایک مثال ہے۔ جو کہ یونیورسلز انسائیکلوپیڈیا کی جلد نمبر چھ سے دی جاتی ہے ۔ الہامی کتابوں کے باب میں مصنف اشارۃً انجیل اور قرآن کے درمیان اختلافات کا ذکر یوں کرتا ہے ، ملاحظہ فرمائیں : "انجیل کو کتابی شکل دینے والے قرآن کی طرح یہ دعوے نہیں کرتے کہ ایک اپنی سوانح حیات ارسال کی جو کہ خدا نے بڑے

معجزے کے ساتھ رسولؐ کو ہدایت فرمائی"۔ حقیقت میں قرآن کا کسی سوانح حیات سے کوئی تعلق نہیں یہ تو دین کی ایک تبلیغ ہے۔ اور یہ واضح فرق تو کسی بُرے سے بُرے ترجمے کو پڑھ کر بھی مصنف کی سمجھ میں صاف طور پر آ جانا چاہیئے تھا جس بیان کا ہم نے حوالہ دیا ہے وہ حقیقت سے بہت دور ہے اور یہ بات ایسی ہی ہے کہ اگر کوئی وضاحت یہ کر دے کہ ایک انجیل اسی کے کاتب کی سوانح حیات ہے اور قرآن کے متعلق یہ سفید جھوٹ بولنے والا شخص لائیون کی مشہور مذہبی فیکلٹی کا بظاہر بہت معزز پروفیسر ہے یہ حقیقت کہ لوگ جھوٹی باتیں ضرور کرتے ہیں قرآن اور اسلام کے متعلق غلط تاثر پیدا کرتا ہے"۔

اس کے بعد یہ فرانسیسی سرجن اس دستاویز کا حوالہ دیتا ہے جسے غیر عیسائی معاملات کے دفتر نے پاپائے رُوم کے ویٹیکین (Vatican[1]) نے تیار کیا ہے اس دستاویز کے مندرجہ ذیل نکات پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔

" ویٹیکین کی دستاویز پھر اسلام کے خلاف دیگر جھوٹے فیصلوں کا تنقیدی جائزہ لیتی ہے"۔

اِسلام کا عقیدۂ تقدیر یعنی ایسا عقیدہ جس میں اعمال کی بنا پر جزا اور سزا کا تصوّر نہ ہو، ایک دور دور تک پھیلا ہوا تعصب ہے دستاویز اس عقیدہ کی چھان بین کرتی ہے اور قرآن کی مدد سے اس معروضہ کے خلاف یہ بتاتی ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے اور اس کے اعمال کے مطابق ہی روز آخرت اس کا فیصلہ ہوگا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی عقیدہ کا نظریہ غلط ہے اس کے برعکس یہ ایمان کی سچائی کی مخالفت کرتا ہے اور اس ضمن میں قرآن کی دو آیات کا حوالہ دیتا ہے جو کہ مغرب میں نہایت

---

[1] ۔ ویٹیکین (Vatican) عیسائی دنیا کے لئے مذہبی حکومت کا درجہ رکھتی ہے۔

غلط انداز میں سمجھی جاتی ہیں۔"

"اسلام میں کوئی جبر یا زبردستی نہیں ہے"۔ (سورۃ ۲ - آیت ۲۵۶)

"اللہ نے دین میں تمہارے لئے کوئی مشکل پیدا نہیں کی"۔ (سورۃ ۲۲ - آیت ۷۸)

"یہ دستاویز اس وسیع تر پھیلے ہوئے نظریہ کی مخالفت کرتی ہے کہ اسلام ایک خوف پیدا کرنے والا مذہب ہے۔ بلکہ اس کے مطابق اسلام ایک محبت کا مذہب ہے اپنے ہمسائے سے محبت اللہ پر ایمان کی وجہ سے یہ دستاویز اس جھوٹے پھیلے ہوئے نظریہ کو بھی رد کرتی ہے کہ مسلمانوں میں اخلاق کا فقدان ہے۔ اور دوسرے اس نظریہ کو بھی جو کہ بہت سارے یہودی اور عیسائی اپنائے ہوئے ہیں جو کہ اسلامی جنون یا کٹر ہونے کا ہے۔ اس کے متعلق دستاویز مندرجہ ذیل تبصرہ کرتی ہے "حقیقت میں اسلام اپنی تاریخ میں اتنا جنونی بمشکل رہا جتنا کہ عیسائیت کے مقدس برج جب کبھی بھی عیسائیت نے سیاسی اقتدار کو اپنایا"۔ اس سلسلہ میں مصنفین قرآن کے وہ حوالہ جات پیش کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام میں "مقدس جنگ" کا کس طرح غلط ترجمہ کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے اللہ کی راہ میں "کوشش"۔ اسلام کو پھیلانے کی کوشش اور حملہ آوروں سے بچاؤ کی کوشش"۔

ویٹیکین کی دستاویز میں مندرجہ ذیل بھی ہے :۔

"اسلام میں جہاد کا مفہوم بائیبل کے "Kheem" کے مفہوم سے مختلف ہے۔ جہاد کسی کا نام و نشان نہیں مٹاتا بلکہ اس کے ذریعہ اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کو نئے علاقوں میں پھیلایا جاتا ہے" ماضی میں جہاد کے تحت جو تشدد ہوا وہ جنگی اصولوں کے مطابق ہوا۔ صلیبی جنگوں کے وقت بھی ہمیشہ صرف مسلمانوں ہی نے نہیں سب سے زیادہ خون خرابہ کیا"۔

آخر میں دستاویز اس تعصب کا ذکر کرتی جس کے مطابق کہ اسلام

وہ تنگ نظر مذہب نہیں ہے۔ جو کہ اپنے پیروکاروں کو زمانے کے ساتھ ساتھ جدید ترقی کرنے سے روکتا ہے"۔ یہ ایسی صورتحال میں عیسائی ملکوں میں ترقی سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور مندرجہ ذیل بیان کرتا ہے۔ "ہم دیکھتے ہیں (....) کہ مسلمانوں کے اندازِ غور و فکر میں ترقی کرنے اور مسلم سوسائٹی کے ارتقار کے ممکنہ اصول موجود ہیں"۔

مجھے یقین ہے کہ ویٹیکین کے پاپائے روم سے اسلام کے اس دفاع سے مذہب کے ماننے والے بے شمار لوگ حیران ہونگے چاہے وہ مسلمان ہوں یہودی ہوں یا عیسائی ہوں یہ ایک سچائی کا کھلے دل سے مظاہرہ ہے۔ جو اپنی جدت میں واحد ہے۔ اور ان رویوں سے بالکل الٹ ہے جو کہ ہمیں ماضی میں ورثے ملے تھے۔ ہمارے مذہبی پاپائے روم نے اعلیٰ سطح پر اسلام کے بارے جو رویہ اختیار کیا ہے۔ اس کے علم کے بارے میں مغرب کے جن لوگوں کو علم ہے ان کی تعداد ابھی بے حد کم ہے"۔

پھر بکائے لکھتا ہے :۔

"شروع شروع میں جو بات مطالعہ کرنے والے کے سامنے سب سے پہلے آتی ہے وہ بے شمار موضوعات پر بحث ہے۔ تخلیق، علم فلکیات، زمین کی ساخت کا بیان حیوانات اور نباتات کی دنیا، انسانی تخلیق کا عمل جبکہ انجیل میں بھاری بھر کم غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ میں قرآن میں ایک غلطی بھی نہیں ڈھونڈ سکا۔ مجھے اپنے آپ کو روک کر پوچھنا پڑا کہ اگر قرآن کا مصنف ایک انسان تھا تو وہ سات صدی عیسوی میں ایسے حقائق کیسے لکھ سکا۔ جو کہ آج کے سائنسی علم کے عین مطابق ہیں۔ اس بارے میں قطعاً شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ قرآن کا نفس مضمون جو آج ہمارے پاس ہے موجودہ دور کے مضمون کے عین مطابق ہے۔ اگر مجھے یہ بات ان الفاظ میں کہنے کی اجازت ہو (کتاب کے اگلے باب میں اس

مشکل موضوع پر لکھوں گا) اس مشاہدہ کا انسانی زبان میں کیا بیان ہو سکتا ہے؟ میری رائے میں اس کا کوئی بیان نہیں۔ ہم اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ کہ اس زمانے کا عرب کا ایک باشندہ جبکہ بادشاہ ڈیگوبرٹ فرانس پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کے پاس خاص موضوعات پر وہ تمام ضروری سائنسی علم موجود تھا جو کہ ہمارے زمانے سے دس صدی آگے کا ہو"۔

مسٹر جن بکلے مزید لکھتا ہے :۔

"یہ ممکن ہے کہ سائنسی مواد رکھنے والی آیات جن کو میں نے توجہ مبذول کرانے کے لئے چُنا ہے۔ ترجیحًا چُنا ہے۔ ان مسلمان مصنفوں کے کے مطابق شاید بہت کم ہوں۔ ان آیات کے مقابلہ میں جو وہ اس ضمن میں پہلے ہی پیش کر چکے ہوں۔ عموماً میرا خیال ہے کہ میں نے ان کے مقابلہ پر، قدرے کم آیات کا حوالہ دیا ہے۔ مگر اس کے علاوہ میں نے بے شمار ایسی آیات کو چُنا اور پیش کیا ہے۔ جو کہ آج تک میری رائے میں سائنسی نکتۂ نگاہ سے وہ اہمیت حاصل نہیں کر سکتی جن کی وہ حامل اور حقدار ہیں۔ لیکن اگر کسی جگہ میں اپنی غلطی سے ان آیات کو زیر غور لانے کے لئے پیش نہیں کر سکا۔ جن آیات کو ان حضرات نے پیش کیا ہے تو میں امید کرتا ہوں کہ یہ حضرات اس وجہ سے میرے خلاف نہیں ہوں گے میں نے یہ بھی بعض اوقات نوٹ کیا ہے۔ کہ بعض کتابیں ایسی سائنسی توضیحات پیش کرتی ہیں۔ جو مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتیں۔ میں نے بالکل کھلے دل اور صاف ضمیر سے ان متعلقہ آیات کی اپنی توضیحات بیان کی ہیں"۔

اسی لحاظ سے میں نے قرآن سے ایسے حوالہ جات تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو مظاہر قدرت میں سے انسانی ادراک میں ہوں لیکن جن کا جدید سائنس ابھی ثبوت مہیا نہیں کیا۔ اسی ضمن میں میرے

خیال میں میں نے قرآن میں سے ایسے حوالہ جات حاصل کیئے ہیں جو زمین سے ملتے جلتے سیاروں کی کائنات میں موجودگی کا پتہ دیتے ہیں ۔ یہ اضافہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ بہت سائنسدانوں کے خیال میں یہ ایک نہایت ممکن حقیقت ہے اگرچہ جدید کوائف یقین کے ساتھ ایسا کوئی اشارہ نہیں دیتے وہ اس معاملہ میں ضروری حد تک احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ جس کا تقاضا سائنسی تحقیق کرتی ہے ۔"

" اگر یہ مطالعہ تیس برس پہلے ہوا ہوتا تو یہ ضروری ہوتا کہ ایک اور حقیقت کا اضافہ کیا جاتا جس کی کہ قرآن نے پیشین گوئی کی ہے ۔ اور یہ علم فلکیات کے بارے میں ہوتا اور یہ حقیقت تسخیر خلا کے بارے میں ہے ۔ اس زمانے میں میزائیلوں کے ابتدائی تجربات کے بعد لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ ایک دن شاید یہ مادی طور پر ممکن ہو جائے گا کہ انسان اپنی زمینی رہائش چھوڑ کر خلا میں تحقیق کرتا پھرے ۔ یہ اسوقت معلوم ہوا ۔ کہ قرآن میں ایسی ایک آیت موجود ہے جس میں پیشین گوئی کی گئی ہے کہ کس طرح ایک دن انسان یہ فتح حاصل کر لے گا اور اس بیان کی اب تصدیق ہو چکی ہے ۔"

" مقدس صحیفوں اور سائنس میں موجودہ مقابلہ کئی خیالات انجیل اور قرآن دونوں کے لئے پیدا کرتا ہے ۔ جن کا تعلق سائنسی حقائق سے ہے تاکہ یہ مقابلہ صحیح و جائز ہو ۔ اور سائنسی دلائل شک و شبہ سے اتنے پاک ہوں ثابت ہو چکے ہوں کہ ان پر پوری طرح بھروسہ کیا جا سکے وہ لوگ جو اس خیال کو قبول کرنے میں روڑے اٹکاتے ہیں کہ سائنس کی مداخلت کو صحیفوں کی صداقت کو جانچنے کے لیئے قبول کیا جائے وہ اس بات کے انکاری ہیں کہ سائنس کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ایک ایسے مقابلے کے لئے ضروری و مناسب بنیاد فراہم کرے

چاہے یہ مقابلہ انجیل کے ساتھ کیا جائے یا قرآن کے ساتھ لیکن ہم نے یہ اب دیکھ لیا ہے کہ قرآن کو سائنس کے ساتھ اس مقابلہ میں ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے البتہ انجیل اس معاملہ میں تسلی کرانے میں ناکام رہی ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ سائنس تو وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے جس بات کو آج یہ بطور حقیقت تسلیم کرتی ہے بعد میں اسکو ردّ بھی کر سکتی ہے"۔

"یہ آخری بیان تقاضا کرتا ہے کہ اس بات میں واضح فرق محسوس کیا جائے کہ ایک سائنسی نظریہ یا سوچ اور ایک سائنسی حقیقت بالکل علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ نظریہ کا مقصد صرف مظاہر قدرت کی ممکنہ وضاحت کرنا ہے جو کہ آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ لہٰذا کئی بار ایسا ہوتا ہے۔ کہ سائنسی نظریہ بدل جاتا ہے۔ اس میں قدرے تبدیلی بھی آسکتی ہے یا اس کو یکسر بدل کر اس کی جگہ دوسرا نظریہ لے لیتا ہے جو کہ نہ صرف پہلے نظریہ کو غلط ثابت کر رہا ہوتا ہے بلکہ خود پہلے نظریے کی نسبت صحیح یا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور اس کی مدد سے سائنسی حقیقت کو سمجھنے اور پانے میں نسبتاً زیادہ آسانی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایک سائنسی حقیقت جس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے بار بار اس کی صحت کو تجربوں کی مدد سے جانچا جاتا ہے اور اس نتیجہ پر آخرکار پہنچا جاتا ہے کہ یہ مشاہدہ بالکل درست اور اس میں کسی قسم کی معمولی سے تبدیلی کی بھی گنجائش نہیں اس کے خواص کی تعریف اور وضاحت کرنا آسان ہوتا ہے۔ اور تبدیل نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنے حالات میں جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اور یہ حقیقت ہے جو کہ تبدیل نہیں ہو گی لہٰذا اس حقیقت کے متعلق مستقبل میں زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مدار کو زیادہ واضح طور پر سمجھ لیا جائے گا"۔

"جہاں تک سائنسی نظریہ کے تبدیل ہونے کی فطرت کا تعلق اس کے باعث مثال کے طور پر میں نے ایک مسلمان طبیعات دان کا خیال جو اس نے قرآن کی ایک آیت سے اخذ کر کے مادہ (Anti-matter) کے تخیل کی پیشین گوئی کی تھی۔ کو میں نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہ ابھی ایک ایسا نظریہ ہے جس پر ابھی بہت بحث ہو رہی ہے اس کے برعکس البتہ ایک انسان پورے وثوق کے ساتھ اپنی توجہ قرآن کی آیت پر مرکوز کر سکتا ہے۔ جس میں زندگی کا آغاز پانی سے متعلقہ ہے یہ ایک ایسا مظاہر قدرت ہے جس کی ہم کبھی تصدیق تو نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جس کے بارے بے شمار دلائل اس کے حق میں جاتے ہیں۔ جہاں تک مشاہدہ میں آئے ہوئے حقائق کا تعلق ہے۔ جیسے کہ انسان کے نامکمل ادھورے بچے کا ارتقائی عمل یہ بالکل ممکن ہے کہ ہم قرآن میں بچے کی پیدائش کے مختلف مراحل کے بیان کا جدید طبی انکشافات کے اس معاملہ میں کوائف سے مقابلہ کر سکیں اور اس ضمن میں جدید سائنس کے ان انکشافات کو قرآن کی متعلقہ آیات کے عین مطابق پائیں"۔

بکائے مزید لکھتا ہے:۔

"اس کے آخر میں۔ کتاب کے تیسرے حصہ میں ایک ہی معاملہ پر تفصیل کے ساتھ اخذ شدہ نتائج درج ہیں جو کہ انجیل اور قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ اور ان کا آپس میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان حالات کا بھی ذکر ہے جن سے اس بارے میں دوچار ہونا پڑا جبکہ اس معاملہ کا سائنسی تجزیہ کیا گیا اور انجیل اور قرآن کے متعلقہ بیانوں کو پرکھا گیا مثال کے طور پر اس بات کا تجزیہ کیا گیا کہ طوفان کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ انجیل میں ان کے بارے میں جو سائنسی تحقیق سے تضاد پایا جاتا ہے اس کو صاف ظاہر کر دیا گیا ہے۔ یہاں یہ امر نوٹ کر لینے کے قابل ہے کہ یہ

طرح سائنس کا اس بارے میں تجزیہ قرآن کے بیان کے عین مطابق ہے جو اس کے متعلقہ ہے اس طرح ہم واضح طور پر وہ فرق نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں جو سائنس اور انجیل کی تحقیق میں پایا جاتا ہے۔ جو ہمیں انجیل میں درج بیانات کو قبول کرنے میں مانع ثابت ہے۔ لیکن قرآن سے سائنسی تحقیق کی مطابقت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم قرآن کے بیانات کو صحیح اور درست قبول کریں"۔

پھر سر جن بکالے اپنی بات یوں ختم کرتا ہے:۔

"مندرجہ بالا مشاہدہ ان لوگوں کے مفروضہ نظریہ کو غیر مستحکم قرار دیتا ہے۔ جو محمدؐ کو قرآن کے مصنف کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک شخص جو بظاہر پڑھا لکھا نہ ہو۔ وہ ادب کے لحاظ سے دنیا کا اہم ترین مصنف بن جائے۔ پھر وہ کس طرح سائنسی نوعیت کے حقائق کا اعلان کرے۔ جو کہ اس زمانے کے کسی انسان کے لئے ایسا کرنا ناممکن تھا اور پھر کمال تو یہ ہے کہ اس ضمن میں جو بھی دعوے کئے گئے۔ ان میں سے کسی میں بھی رتی بھر غلطی نہ تھی"۔

"اس مطالعہ سے جو خیالات وافکار افشار ہوئے ہیں۔ ان سب کی بنا صرف سائنسی نقطۂ نگاہ ہے۔ یہ اس نتیجہ کی طرف راہنمائی کرتے ہیں کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ ایک شخص جو ساتویں صدی عیسوی میں رہتا ہو۔ وہ قرآن میں بے شمار ایسے مختلف موضوعات بیان کرے جو کہ اس کے زمانہ سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ اس علم کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں جو صدیوں بعد انسان کو حاصل ہوا۔ اس لئے میرے نزدیک قرآن کا کسی انسانی وضاحت سے کوئی تعلق یا رشتہ جوڑا نہیں جا سکتا"۔

جناب والا: اس کتاب "دی بائیبل۔ دی قرآن اینڈ دی سائنس" کی ایک جلد میرے پاس موجود ہے اسے جناب حیدر علی ملجی الٰہ۔ کراچی نے بھی شائع کر کے مفت تقسیم کیا ہے۔

اگر آپ چاہیں تو میں اس کتاب کی اپنی جلد آپ کی خدمت میں برائے حوالہ ارسال کر سکتا ہوں بشرطیکہ آپ ایسا چاہیں۔

میں اس خط کو اس سے بہت پہلے آپ کی خدمت میں ارسال کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ آپ کا خادم

[illegible] مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۸۰ء

دعوتِ دین بذریعہ خط

بنام

امریکی صدر جناب رونالڈ ریگن

بشکریہ وساطت جناب یوجین ۔ ڈی ۔ پرائس

امریکن کونسلیٹ جنرل ۔ لاہور

◎

عنوانِ خط : عیسائیوں کو دعوتِ اسلام

محترمی ومکرمی :

پاکستانی پریس کی رپورٹوں کے مطابق ایک تحریک بظاہر زور پکڑ رہی ہے جس کا مقصد مسلمانوں اور عیسائیوں کو اتحاد کے ذریعہ ایک دوسرے کے قریب تر لانا ہے ۔ تاکہ عالمی امن کو برقرار رکھا جائے اور کمیونزم کے خطرے سے بچایا جائے ۔ مورخہ ۱۹۸۱/۱۱/۳۰ کو ورلڈ کرسچین الائنس (عالمی عیسائیوں کا اتحاد) کے زیر اہتمام جناب یوجین ۔ ڈی ۔ پرائس کی صدارت میں لاہور میں ایک سیمینار منعقد ہوا ۔ جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ مذکورہ بالا مقاصد حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اتحاد و مفاہمت نہایت ضروری ہے اور اس سے ایک ہفتہ قبل یعنی مورخہ ۱۹۸۱/۱۱/۲۲ کو مقدس پادری اینڈریو فرانسس نے اخباری اطلاعات کے مطابق جو کچھ کہا ۔ وہ مندرجہ ذیل ہے :

"پاکستان دنیا کا ایسا منفرد ملک بنیگا ۔ جہاں اسلام اور عیسائیت میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا ہوگی ۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان کے عیسائی دنیا کے لئے اتحاد و یگانگت کی ایک مثال قائم کریں گے ۔ جس پر چل کر تمام ممالک افہام و تفہیم کی فضا میں دوسرے فرقوں کے ساتھ بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں گے ۔"

میں یہ ضرور کہوں گا کہ مجھے یہ تحریک بظاہر بہت مثبت اور شگفتگی پیدا کرنے والی معلوم

ہوتی ہے اور میں اسکی کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔ یہ مجھے اس موقعہ پر آپ کی دلی مبارک باد کا وہ پیغام بھی یاد دلا رہی ہے۔ جو آپ نے گزشتہ عید الفطر کے موقع پر افغان مجاہدین کو بھیجا تھا اور اس کے ساتھ ہی آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عیسائی اور مسلمان اللہ تعالےٰ پر مشترکہ ایمان رکھتے ہیں اور صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ اُس کے علاوہ کسی اور کی نہیں۔

میری ناقص رائے میں اس تحریک کی کامیابی کا دارومدار بالآخر اس بات پر ہوگا کہ کس قابلیت کے ساتھ مذہبی اور سیاسی میدانوں میں اس پر عمل ہوتا ہے۔ مذہبی میدان میں ویٹی کین' (VATICAN) بخوبی سرگرم عمل ہے اور اس بات کی طرف جلد ہی رجوع کروں گا اور سیاسی میدان کو آپ جیسے نامور سیاستدانوں کو سر کرنا ہوگا۔ مسئلے کی روح مشرقِ وسطیٰ کا کٹھن سوال ہے۔ سیاسی بصیرت کا اُس وقت امتحان ہوگا۔ جب عیسائی اس مسئلے کو اس کے تمام پہلوؤں سے حل کرنے کے لئے مسلمانوں کی طرف رجوع کریں گے۔ یہ دیکھا جائے گا کہ کیا وہ مسلمانوں کی طرف بحیثیت بھائیوں کے رجوع کرتے ہیں۔ جیسا کہ اس مذکورہ تحریک کا تقاضا ہے۔ صلح جوئی اور فراخدلی کے جذبہ کے مطابق۔ یا پھر وہ مسلمانوں کے پاس اسرائیل کی بھری بندوقوں اور توپوں کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے نام نہاد کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کے مطابق ان سے سمجھوتہ کرنے کے لئے انہیں مجبور کیا جا سکے۔ اگر ایسا کیا گیا تو مجھے خدشہ ہے کہ کیمونسٹ اس صورتِ حال کا پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ وہ عیسائیوں کو مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے دشمن کے لبادہ میں پیش کریں گے اور انہیں عیسائیوں کے خلاف صف آرا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میرے مطالعہ کے مطابق کیمونسٹ کسی سیاسی صورتِ حال کو اچھالنے اور اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی پوری دسترس رکھتے ہیں۔ اس انداز سے اگر صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال دو جڑواں مسائل تحریک کے لئے پیدا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک تو متعدد پہلوؤں والی مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال کا خوش اسلوب حل اور دوسرا مسئلہ مسلمانوں کا کیمونزم کے غلبہ سے آزاد کرانا جو کہ موجودہ حالات میں ان کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے اور میرے خیال میں دوسرے مسئلے کو حل کرنا پہلے مسئلہ کے حل کی نسبت زیادہ مشکل ہے۔

مذہب کے میدان میں بہر حال ویٹی کین نے تحریک کی کامیابی کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ ویٹی کین میں غیر عیسائیوں کے شعبہ نے ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ایک دستاویز بعنوان "عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذاکرات کی راہیں" (Orientations for a Dialogue between christians and Muslims) تیار کر کے ایک بہت ہی عمدہ کام کیا ہے۔ کیونکہ یہ صدیوں پرانے بے حقیقت تعصبات کو اور بُرے الزامات کو جو اسلام کے خلاف پائے جاتے تھے۔ تاکہ عیسائی قرآن کو خدا کی الہامی کتاب جو کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بحیثیت رسول اللہ کے اُن پر جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ وحی ہوئی کو ماننے سے انکار کرتے رہیں۔ ان دونوں کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کرتی ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ویٹی کین کی اس دستاویز کو عیسائیوں میں وسیع پیمانے پر شائع کیا جائے تاکہ ان کو لاعلمی کے اندھیرے سے نکالا جائے۔ جو کہ ماضی کے متعصبانہ پراپیگنڈے سے مزید گہرا ہے تاکہ عیسائی اس گھٹ اندھیرے سے نکل کر اسلام کی تابناک روشنی میں آ جائیں۔ جس وقت تک ایسا نہیں ہوتا۔ لوئیس کیلز جیسے اشخاص اسلام کے خلاف اپنے تعصب کی وجہ سے انتہائی گھٹیا بیہودہ مواد شائع کرتے رہیں گے جو کہ اس موجودہ تحریک کے مقاصد کے حصول میں رکاوٹ ثابت ہوتے رہیں گے۔

مغربی جرمنی سے "سٹارز اینڈ سٹرائپس" جو کہ امریکی مسلح افواج برائے یورپ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کا جریدہ ہے۔ اس کے ۴، مارچ ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں اسلام کے خلاف ایک انتہائی تعفن آمیز اور لغو مضمون اسے بدنام کرنے کے لئے شائع ہوا تھا۔ لوئیس کیسلز۔ یو۔ پی۔ آئی کا سٹاف رائٹر اس مضمون کو لکھتے ہوئے اپنے غیض و غضب میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنے قلم کی پوری جنبش سے امریکی سپاہیوں کے ذہنوں میں تعصب کا زہر بھر رہا تھا۔ حالانکہ یہ امریکی سپاہی بیچارے اس کی طرح صحیح اسلام سے بالکل بے بہرہ تھے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے قطعاً بے نیاز کہ وہ اسلام کے متعلق کوئی سند یا مجاز نہیں رکھتا کہ وہ کسی اعتماد کے ساتھ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ کہہ یا لکھ سکے۔ اس نے ایک عطائی ہونے کا زیادہ مظاہرہ کیا۔ بہ نسبت ایک

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سولی کا واقعہ۔ ان کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا اور ان کا معجزانہ طور پر مُردوں کو زندہ کر دینا کو بھی بیان کرتا ہے اور وہ اس دن کو سلام کرتا ہے۔ جس دن کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح یہ دن مسلمانوں کے لیئے بھی خوشی منانے کا دن بنتا ہے۔

لہٰذا میں اس موقعہ پر آپ کو اور سب عیسائیوں کو کرسمس کے موقع پر دلی مبارک باد دیتا ہوں اور اس طرح آپ نے مسلمانوں کو جو گذشتہ عیدالفطر پر مبارک باد دی تھی اس کا اسی انداز میں مثبت جواب دیتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ ایک اچھی تجویز ہوگی کہ تمام دنیا کے عیسائیوں اور مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ سب مل کر دونوں پیغمبروں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام پیدائش کو خوشی سے منائیں۔

چونکہ قرآن پاک مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کر کے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کرتے ہوئے تمام انبیاء علیہ السلام پر جن میں کہ حضرت نوحؑ۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت اسحاقؑ۔ حضرت سلیمانؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت داؤدؑ۔ حضرت یعقوبؑ پر مکمل ایمان لایا جائے اور اس کے ساتھ ہی بلکہ پہلے اللہ تعالیٰ پر بھرپور ایمان لایا جائے۔ اس کی تمام تر کلی صفات کے ساتھ مثلاً کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ ہر جگہ ہر گھڑی موجود ہے۔ ساری کائنات کا خالق ہے اور روزِ حساب کا مالک ہے۔ اس لیئے اگر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں پیدا ہوا ہوتا تو یہودی ہوتا اور تورات پر عمل پیرا ہوتا لیکن اگر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دَور میں پیدا ہوا ہوتا تو میں عیسائی ہوتا۔ اور مقدس انجیل پر عمل کرتا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کا دَور اس وقت ختم ہو گیا۔ جبکہ انجیل نے تورات کی جگہ لے لی۔ جس سے کہ یہ از خود اخذ ہو جاتا ہے کہ تورات کو واپس لے لیا گیا اور اس کی جگہ اللہ نے انجیل کو نافذ کر دیا لیکن اب جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے آجانے سے ختم ہو گیا ہے میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ میں اب اللہ کی مرضی اور حکم کے آگے اپنا سر جھکا دوں اور بحیثیت مسلمان قرآن پر عمل کروں۔ جناب والا: میں نے ممکنہ اختصار کے ساتھ آپ کو اپنی

ذمہ دار ممتاز صحافی کے۔

اس وقت قدرتی طور پر میرے اندر یہ جذبہ موجزن ہوا کہ میں لوئیس کیسلر کے مضمون میں مندرج الزامات کا جواب دوں۔ چنانچہ میں نے اپنا جوابی مضمون کمانڈنگ جنرل۔ جنوبی علاقائی کمان اے۔ پی۔ او ۷ ۴۰ یو۔ ایس فورسز کو ۱۹۶۱/۴/۶ کو بھیجا اور اس میں مَیں نے التجا کی کہ میرا مضمون بھی جریدہ "سٹارز اینڈ سٹرائپس" میں شائع ہو۔ کیونکہ پاکستان شدت سے محسوس کرتا ہے کہ امریکی ہمارے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں اور اس جریدہ کے قارئین ہونے کی بنا پر انہیں بجا طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بہتر طور پر ہمارے متعلق جانیں۔ ہماری زندگی۔ ہمارے دین اور ہمارے متعلقہ جذبات کے بارے میں۔ لیکن میری تمام وکالت اور کوشش رائیگاں ثابت ہوئی اور "سٹارز اینڈ سٹرائپس" کے تمام دروازے میرے منہ پر مار کر بند کر دیئے گئے اور میری گذارشات کی کوئی پرواہ نہ کی گئی۔

آپ برائے مہربانی اس مقام پر یہ نوٹ فرمائیں گے کہ میں نے اپنے مضمون میں جو کچھ بیس سال قبل لکھا تھا۔ نہ صرف وہ ان مقاصد سے ملتا جلتا ہے۔ بلکہ تقریباً ان کے ہو بہو ہے جو کہ حاصل کرنے کی خواہش کے تحت موجودہ تحریک چلائی گئی ہے تاکہ دنیا بھر کے عیسائیوں اور مسلمانوں کو ان کے مذاہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے قریب تر آج لایا جائے۔ ایک مقام پر میں نے اسوقت لکھا۔ " نہ صرف لوئیس کیسلر نے امریکی عوام کو ہضم کرنے کے لئے ایسا مواد فراہم کیا ہے جو کہ زہر آلود ہے تاکہ امریکی عوام کے بظاہر صحت مند ذہنوں کو اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت سے پراگندہ ایسے وقت پر کیا جائے۔ جبکہ امریکہ اپنے ہم خیال لوگوں کو کمیونزم کے اثر کے زیر تسلط جانے سے بچانے کے لئے کوشش کر رہا ہے اور جسوقت کہ امریکہ اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دوستانہ تعلقات نظریاتی ہم آہنگی کی بنیاد پر مستحکم ہو رہے ہیں تاکہ دنیا میں امن کو استحکام نصیب ہو اور اس کا بڑھتے ہوئے موجودہ خطرے سے شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔"

پھر دوسری جگہ پر میں نے اس مضمون میں بعد میں یہ بھی لکھا۔ "دنیا کی تمام اقوام اور مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو کہ عیسائیت کے نہ صرف قریب ترین

ہے۔ بلکہ اس کے پیروکار موخرالذکر مذہب اور اس کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تمام تر احترام و عزت کرتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔" بہرحال میرا یہ مضمون دو دیگر جریدوں میں شائع ہو گیا اور اس کے اہم اقتباسات کو ریڈیو سیلون سے ۱۹۶۲/۷/۲ کو بطورِ خاص اسوقت نشر کیا گیا۔ جس وقت کہ ریڈیو اس مذکورہ جریدے پر اپنا تبصرہ نشر کیا۔ (یہی مضمون میری کتاب "دین کے آئینے میں" کے صفحات ۸۰ تا ۸۹ میں بھی موجود ہے۔)

ان حالات میں میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر آپ اسوقت امریکہ کے صدر ہوتے تو آپ ایسے گندے مضمون کو امریکی افواج کے جریدے میں اشاعت کی اجازت نہ دیتے یا کم ازکم آپ لوئیس کیسلز کے وہ تمام انعامات کو ضبط کر لیتے جو کہ ان کو بعض مفاد پرست عناصر نے اس مضمون کے لکھنے پر عطا کئے تھے۔ تاکہ یہ عناصر ہمارے مذہبی رشتوں کو بحیثیت عیسائیوں اور مسلمانوں کے گزند نہ پہنچا سکیں۔ لیکن موجودہ تحریک جو کہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان قریبی اتحاد قائم کرنے کا کام کرنا چاہتی ہے۔ اس۔ کے اس کام کو ویٹی کین کی دستاویز نے یہ اعلان کر کے بہت آسان و ہموار کر دیا ہے کہ قرآن خدا کا الہامی پیغام ہے جو کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعہ رسولِ خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ہوا۔ مزید برآں سائنس کے جو جدید تحقیقی حقائق جو کہ مشہورِ عالم کتاب بعنوان "دی بائیبل۔ دی قرآن اینڈ سائنس"، جسے فرانسیسی مصنف مارس بکالے نے تصنیف کیا ہے۔ سے حتمی طور پر تصدیق کیا ہے کہ قرآن کا درجہ و مقام اللہ کی الہامی کتاب کا ہے۔

اللہ پر ہمارا مشترکہ ایمان کا مزید ثبوت اس وقت فراہم ہوتا ہے۔ جبکہ قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ پیدائش کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ مقدس و پاک حضرت مریمؑ کے ہاں بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ جبکہ حضرت مریمؑ کو کسی مرد نے اس مقصد کے لئے قطعاً چھوا تک نہیں تھا اور کس طرح عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بچپن میں جھولے میں لیٹے ہوئے معجزانہ طور پر بولنا شروع کر دیا اور اپنی مقدس والدہ کی پاکبازی کا یقین دلایا۔ قرآن مزید

پوزیشن اس لئے واضح کی ہے۔ تاکہ آپ اپنا نتیجہ خود اخذ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے فرماتا ہے کہ حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن اب رہتی دنیا تک باقی رہیں گے اور ان کے مطابق عمل ہوتا رہے
گا۔ کیونکہ دینِ اسلام کو اب ہر لحاظ سے مکمل کر دیا گیا ہے۔

جنابِ والا: میں نے اپنی قومی زبان اُردو میں ایک کتابچہ لکھا ہے۔ یہ ویٹی کین کی
مذکورہ دستاویز اور جدید سائنسی تحقیق کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن
الہامی کتاب ہے۔ یہ کتابچہ اس خط پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جو میں نے اس ضمن میں جناب جنرل
محمد ضیاء الحق صاحب صدرِ پاکستان کو اُس وقت لکھا تھا۔ جس وقت کہ انھوں نے جنرل اسمبلی
کے ایک اجلاس کو یکم اکتوبر ۱۹۸۰ء کو خطاب کیا تھا۔ اس کتابچہ میں دو ایک ایسے صفحات بھی
ہیں۔ جن میں میں نے آپ کی ذاتِ عالیہ کو صفحہ ۷، ۸ اور ۹ پر خطاب کیا ہے۔ اس لئے میں
نے اس کتابچہ کی ایک جلد کو معہ دیگر ضروری دستاویزات کی نقول کے ساتھ اس خط میں منسلک
کر دیا ہے تاکہ آپ ان کی طرف رجوع اگر چاہیں تو کر سکیں۔

میں آپ کی درازیٔ عمر اور کامیابی کی دعا کرتا ہوں اور آپ کو اور آپ کی اہلیہ کو نیک
تمنائیں و جذبات بھیجتا ہوں۔

آپ کا خیر اندیش

ڈاکٹر ارشد اللہ۔ ہومیو

تاریخ ۱۰، دسمبر ۱۹۸۱ء

○

نوٹ: اس خط کی ایک ایک نقل جناب مقدس پوپ جان پال،
ویٹی کین روم کو اور جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب۔ صدرِ پاکستان کو
برائے ضروری اطلاع روانہ کر دی گئی تھی۔

○

میرے خط کا جواب

کونسلیٹ جنرل آف دی یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ
لاہور۔ پاکستان

جنوری ۱۳، ۱۹۸۲ء

ڈاکٹر ارشداللہ ہومیو
۱۰، حسین شاہ سٹریٹ پارک لین
ٹمپل روڈ۔ لاہور

محترمی ڈاکٹر ارشداللہ

میں نے آپ کا مورخہ ۱۰، دسمبر ۱۹۸۱ء کا خط بمعہ اس کے منسلکہ کاغذات کے جو کہ آپ نے صدر ریگن کو لکھا ہے۔ وصول کر لیا ہے۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ آپ نے اس خط کی ایک پیشگی نقل براہِ راست صدر کو ارسال کی ہے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جن اعلیٰ جذبات کا اظہار آپ نے پاکستانی اور امریکی عوام کے درمیان دوستی کے بارے میں کیا ہے۔ انہیں ہمارے صدر اور عوام نے صحیح جانتے ہوئے بے حد سراہا ہے۔ آپ کی ہمیں اسلام کا پیغام واضح کرنے کی خواہش اور کوشش کو حقیقت پسند جانتے ہوئے ہم اُسے سراہتے ہیں۔

نیک خواہشات کے جذبات کے ساتھ

آپ کا مخلص
یُوجین۔ ڈی۔ پرائس
کونسل

چونکہ جناب رسالت مآب حضرت محمد مصطفیٰ۔ احمد مجتبیٰ۔ سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں اور اب آپؐ کے بعد تبلیغِ دین کی خاطر کوئی مزید نبی مبعوث نہیں ہوگا۔ اسلئے

اللہ تعالیٰ نے اس مقدس فرض کو سرانجام دینے کی خاطر اُمتِ محمدیہ کو منتخب کر کے اور اُسکے ذمہ یہ کام سونپ کر اپنا ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں پر اب واجب ہے کہ ہم اللہ کے دین کا پیغام رہتی دنیا تک تمام انسانوں تک پہنچاتے رہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس مقدس کام کو سرانجام دینے میں وہ اپنے تمام تر فضل وکرم سے ہمارے لئے موافق اسباب پیدا کر رہا ہے۔ وہ عیسائی جو پچھلے چودہ سو برس سے ہمارے دین کو جھوٹا سمجھتے چلے آرہے تھے اور اپنے تعصب سے اندھے ہو کر ہر طرح کے رکیک وناشائستہ حملے ہمارے دین پر کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اب پہلی بار قرآن کو الہامی کتاب اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا سچا نبی ماننے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اب تو وہ غیر مسلم بھی جو سائنس کا سہارا لیکر اللہ کے وجود کی شدت سے نفی کرتے تھے، وہ بھی جدید سائنسی انکشافات کی وجہ سے اللہ کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس طرح اللہ رب العزت نے ہم مسلمانوں پر غیر مسلموں میں دین کی تبلیغ کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اب عیسائی اور دوسرے غیر متعصب غیر مسلم جوق در جوق اسلام قبول کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم بحیثیت مسلمان نیک۔ پرہیزگار خدا ترس اور مادہ پرستی سے پاک نظر آئیں اور ہمارے مبلغ دینِ اسلام کی طرف انھیں نہایت خوش اسلوب اور حقیقت پسند انداز میں بلائیں۔ انہیں خوش آمدید کریں۔

میں جسوقت اسلامی تاریخ کی طرف نظر کرتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ پچھلی تیرہ چودہ صدیوں میں شاید ہی کوئی ایسے مبلغِ اسلام ہوں۔ جنہیں یہ شرف اللہ تعالیٰ سے حاصل ہوا ہو کہ انھوں نے اپنے زمانہ میں کسی ملک کے غیر مسلم بادشاہ یا سربراہِ وقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوتِ دین دی ہو۔ بظاہر اللہ تعالیٰ کو یہ کام باقی تمام کاموں سے زیادہ پسند ہے کہ اس کے دین کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا جائے اور ان سے تقاضا کیا جائے کہ وہ اللہ پر صحیح انداز میں ایمان لائیں اور غالباً یہی وجہ سمجھ آتی ہے کہ اللہ نے بیک وقت موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام دونوں کو اپنا نبی بنا کر فرعون بادشاہِ مصر کے پاس بھیجا تاکہ وہ اللہ پر ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اتنا اہتمام حجت ہونے کے باوجود فرعون اللہ پر ایمان نہ لایا اور اس کی بدبختی اسے بالآخر

دریائے نیل میں ڈوبی اور اللہ نے اس کی لاش کو لوگوں کی عبرت کے لئے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ سورۃ المزمل کی آیات ۱۵ تا ۱۹ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ "تحقیق ہم نے بھیجا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہاری طرف تمہارے اوپر گواہی دینے والا۔ جیسے کہ ہم (اللہ) نے بھیجا تھا پیغمبر (موسیٰؑ) کو فرعون کی طرف۔ پس فرعون نے پیغمبر کا کہنا نہ مانا۔ پس ہم (اللہ) نے اس کو سختی سے پکڑ لیا۔ پس کیونکر تم اس دن سے بچ سکو گے جو کہ لڑکوں کو بوڑھا کر دیگا۔ اگر تم کفر کرو گے وعدہ کیا گیا کہ۔ کہ (اس دن) آسمان پھٹ جانیوالا ہے۔ تحقیق یہ نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اپنے رب کی راہ کو پکڑے۔" اس مقام پر جی چاہتا ہے کہ پنجابی زبان میں عرض کروں کہ "جدوں رب نوں پکارنا ایں رب والیا۔ اوکھنداے وِچ میں سنے لے آگیا۔" جناب خاتم النبیین کا ایک ادنےٰ غلام اور امتی ہونے کی حیثیت سے یہ میری تمام تر خوش قسمتی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کا نہایت عاجز و مسکین بندہ اس کا لاکھ لاکھ بار شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے توفیق بخشی اور میرے لئے اپنے فضل وکرم سے ایسے حالات پیدا کئے کہ میں اس کے دین کا پیغام ایک ایسے ملک کے سربراہ کو دوں جو موجودہ دَور میں جوہری لحاظ سے دنیا کے بظاہر دو طاقتور ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔ یہ مانتا ہوں کہ وہ فی الحال صحیح انداز میں ایمان نہیں لایا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اُس نے اس پیغام کو نہ صرف برداشت کیا ہے۔ بلکہ اسے پسند بھی کیا ہے اور اُسے سراہا بھی ہے لہٰذا میری رب العزت کے حضور یہی دعا ہے کہ وہ اُسے اور اس کی قوم کو اسلام پر ایمان لانے کی توفیق بخشے۔ فی الحال میرے لئے یہ بات ہی انتہائی خوشی اور خوش بختی کی ہے کہ وہ عیسائی قوم جو پچھلے چودہ سو برس سے حضور علیہ السلام کو اللہ کا سچا نبی ماننے سے منکر تھی اور ان پر اس دوران طرح طرح کی تہمتیں لگاتی تھی۔ اس قوم نے میرے مذکورہ خط میں مندرج تجویز پر عمل کرتے ہوئے اپنے مذہبی پیشواؤں کی راہنمائی میں لاہور سے ۹ جنوری ۱۹۸۲ء کو عید میلاد النبیؐ منانے کی خاطر سینار پاکستان سے جلوس نکالا جو اسمبلی ہال آکر ختم ہوا۔ جہاں عیسائیوں نے حضورؐ کو اللہ کا سچا اور آخری نبی مانتے ہوئے اپنی تقاریر میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ یہ سلسلہ اب صرف لاہور تک ہی محدود نہیں رہیگا بلکہ انشاءاللہ وتعالیٰ جلد ہی سارے پاکستان کے مسیحی سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا جشنِ میلاد منانا شروع کر

دینگے۔ پھر یہاں سے یہ سلسلہ پھیلتا ہوا ساری عیسائی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ تو شروع ہی سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ایک جلیل القدر نبی مانتے ہیں۔ میں دل سے محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے عیسائی بھائی جُوں جُوں مذہبی لحاظ سے قریب تر آئیں گے اور رسولِ پاکؐ اور قرآن حکیم کی عظمتوں اور تقاضوں کو بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے تو انشاء اللہ وہ زیادہ سے زیادہ ہمارے دینِ اسلام کی طرف رجوع کریں گے۔

یہاں میں چند کلمات اپنے ان مسلمان بھائیوں سے کہنا چاہوں گا۔ جو بظاہر مغربی نظریات اور سائنس کی مادی ترقی سے متاثر و مغلوب ہو کر اپنے دین سے شعوری یا غیر شعوری طور پر دوری اختیار کرتے چلے گئے۔ وہ اللہ اور اس کے دین سے کسی وابستگی کا اظہار کرنے سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہ ماضی کے مغربی نظریات کے تحت احساس کمتری کا شکار تھے لیکن وہ جس مغرب کی تقلید اور نقل کرنا اپنے لئے باعثِ ترقی و فخر سمجھتے تھے۔ لیکن اس مغرب کے دو بڑے ملکوں کا اپنا حال دیکھیں پچھلے دنوں نیٹو کے ڈپٹی کمانڈر انچیف امریکی جنرل ڈوزیئر جب اٹلی کے دہشت پسندوں سے اغوا ہو جانے کے بعد زندہ و سلامت رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو امریکی صدر رونالڈ ریگن بہت خوش ہوئے اور ساری دنیا کے سامنے بڑے فخریہ انداز میں یہ اعلان کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا کو قبول فرمالیا ہے۔ اسی قسم کا دوسرا واقعہ ان ہی دنوں برطانیہ میں پیش آیا جب کہ برطانیہ کی موجودہ وزیر اعظم مسز مارگریٹ تھیچر کا جواں سال بیٹا کاروں کی دوڑ میں حصہ لیتے ہوئے صحراؤں میں گم ہو گیا۔ ماں کے لئے اپنے لختِ جگر کا یوں اچانک گم ہو جانا ناقابلِ برداشت ہو گیا اور غم نے اُسے چاروں اطراف سے گھیر لیا لیکن جب ان کا بیٹا پانچ چھ دن کی مسلسل تلاش کے بعد مل گیا تو برطانیہ کی وزیر اعظم نے سکھ کا سانس لیا اور اپنے خدا کا مسرت سے شکر بجالائیں۔ مغرب اب دوبارہ کروٹ لے رہا ہے اور وہ حق کی تلاش میں دوبارہ اعتماد اور فخر کے ساتھ مذہب کی طرف لوٹ کر خدا سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی راہ پر گامزن ہو گیا ہے۔ بظاہر یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۴، مارچ ۱۹۸۲ء کو جناح ہال لاہور میں ایک اسلامی تقریب کے موقع پر ایک امریکی سکالر نے بڑے اعتماد اور فخر کے ساتھ جناب جسٹس پیر محمد کرم شاہ صاحب کے دستِ مبارک

پر اسلام قبول کرنے کی سعادت حاصل کی اور اس ضمن میں اپنی ایک دلپذیر تقریر بھی کی۔

انسان دراصل جسم اور روح کا مجموعہ ہے۔ جسم اگر گھر ہے تو روح اس گھر کا مکین ہے ظاہر ہے گھر سے گھر کا مکین کہیں زیادہ افضل ہوتا ہے۔ جسم اور روح دونوں کا مکمل انسان بننے کے لئے تندرست و توانا ہونا بہت ضروری ہے۔ جس کیلئے دونوں کیلئے ان کی ضرورت کے مطابق علیحدہ قسم کی غذاؤں کی ضرورت ہے۔ مادی جسم کے لئے غذا مادیت سے فراہم ہوتی ہے۔ لیکن روح کی غذا کے لئے جو کہ امرِ ربی ہے۔ اللہ سے روح کا رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے جو کہ تقاضا کرتا ہے کہ احکاماتِ خداوندی کے مطابق اللہ کی عبادت کر کے اس کا قرب حاصل کیا جائے۔ جس کی راہِ ہدایت اور طریقہ ہمیں قرآن فراہم کرتا ہے ورنہ اس کے بغیر روح اتنی لاغر اور ناتواں ہو گی کہ جسم بظاہر مکین سے خالی ایک ویران گھر کا منظر پیش کریگا اور اس نامکمل انسان کو مکمل بنانے کے لئے مغرب کے مادیت پرست مفکر کوئی مدد نہیں کر سکیں گے چاہے وہ برٹ رینڈ رسل ہو۔ برنارڈ شا ہو یا سگمنڈ فرائڈ ہو۔ اگر سگمنڈ فرائڈ کے افکار کا مطالبہ کیا جائے۔ تو شک ہونے لگتا ہے کہ شاید وہ خود ہی جنسی لحاظ سے ایک نفسیاتی مریض تھا۔ جو کہ بعد میں اس شعبہ کا ماہر نفسیات بن گیا۔ ایک ایسے ہی مغربی مفکر کے ایک قول کا تنقیدی جائزہ اگر لیں تو حقیقت کھل کر ہی سامنے آتی ہے کہ وہ فرماتا ہے کہ (The Best way to avoid a temptation is to yield to it) یعنی اگر کسی کشش یا خواہش سے بچنا مقصود ہو تو اسکا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کشش کے آگے گھٹنے ٹیک دیے جائیں۔ یعنی اس کو پورا کر دیا جائے۔" اس قول کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی شراب پینے کی کشش سے بچنا چاہتا ہو تو وہ شراب پی لے جو زنا کی کشش سے بچنا چاہتا ہو۔ وہ اگر زنا کرلے تو وہ بھی اس کشش سے بچ جائیگا۔ اسی طرح ڈاکہ ڈالنے یا چوری کرنے کی خواہش سے بچنے کے لئے ایسی خواہش کو اگر پورا کر دیا جائے تو ایسی خواہش سے بچا جا سکتا ہے۔ شاید یہ اسی مغربی نظریاتی فکر کا نتیجہ ہے کہ ہمارے بعض بظاہر کھاتے پیتے گھرانوں کے چشم و چراغ ڈاکہ زنی اور چوری کی وارداتوں میں ملوث پائے گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسے جرائم کا ارتکاب کرنے کو وہ اپنے تئیں عین سعادت اور کامیابی و خوشی کا سبب سمجھتے ہوں۔ البتہ خودکشی کی خواہش سے بچنے کے بارے میں ایسی فکر کسی حد اس وجہ سے صحیح بھی جا سکتی ہے کہ جب کوئی انسان خودکشی کرلیگا تو وہ نہ تو خود

باقی رہیگا اور نہ ہی اس کی خواہش کہ جس سے بچنے کی اُسے کوئی فکر لاحق ہو سکے۔ مغربی مادی فکر کا یہ فقدان ہمارے بعض نام نہاد نوجوان مسلمانوں کے آڑے آرہا ہے اور اس مقولہ کے مصداق کہ "کوا ہنس بننے اور اس کی چال پر چلنے کی خواہش اور کوشش میں اپنی چال بھی بھول گیا لیکن رہا پھر بھی کوے کا کوا" ہمارے مسلمانوں کو سنجیدگی سے اس احساسِ کمتری کا جائزہ لینا چاہیئے جس کے کہ وہ دین کے بارے میں شکار ہیں۔ اگر بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلیگا کہ باطن کے کالے کوے تو کافر ہوتے ہیں۔ ایمان والے تو اس کے برعکس ظاہر و باطن سے منور ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں جلد ہی سے اپنے دین کی طرف پورے اعتماد، یقین اور پختہ ایمان کے ساتھ اب لوٹ آئیں تاکہ ان کی دنیا اور آخرت دونوں سنور سکیں۔ ایران عراق کی جنگ ہو یا افغانستان اور ایران کی اپنے اپنے ملکوں میں احیاءِ اسلام کی تحریکیں۔ ان سب سے ہم کو ایک ہی سبق ملتا ہے کہ اگر ہمیں ایک مکمل انسان بننا ہے تو جسم کے ساتھ ساتھ روح کے تقاضوں کو بھی پورا کرنے کا توجہ کے ساتھ اہتمام کرنا ہوگا کیونکہ اصل چیز تو انسان کی روح ہے اور اس کا براہِ راست تعلق اللہ کی ذاتِ اقدس سے ہے جو کہ فرماتا ہے کہ میں نے انسان میں اپنی روح پھونکی ہے۔

میں نے صدر ریگن کو خط میں حضرت بی بی مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بزرگی، عظمت اور معجزات کے متعلق قرآن کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض قارئین حضرات یہ چاہیں کہ میں ان کی قرآن پاک میں باقاعدہ نشاندہی کروں۔ ویسے تو قرآن متعدد آیات میں ان کا ذکر کرتا ہے بلکہ یہ بھی بیان فرماتا ہے کہ حضرت بی بی مریمؑ جب اُمید سے تھیں تو وہ لوگوں کی نظروں سے خود کو چھپانے کے لئے تنہائی میں گوشہ نشینی اختیار کر گئیں اور وہیں اللہ تعالےٰ انہیں کھانے کی تمام چیزیں فراہم کر دیتا تھا۔ البتہ قرآن کے حوالہ سے جو باتیں خط میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سولی اور زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر سورہ النساء کی آیات ۵۵ تا ۵۸ میں ہے۔ جھولے کے بیچ عیسیٰ علیہ السلام کے باتیں کرنیکا سورہ العمران کی آیات ۴۵ تا ۴۷ میں ہے اور انھیں میں یہ بھی ذکر ہے کہ حضرت مریم کو بچہ کی پیدائش کے سلسلہ میں کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا اور عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش کے موقعہ پر سلام کا ذکر سورہ مریم کی آیت ۱۵ ۳۳۔۳۴ میں ہے اور سورہ المائدہ کی آیت نمبر ۱ میں عیسیٰ علیہ السلام کا مُردوں کو زندہ کرنا مٹی کے پرندوں میں جان ڈالنا۔ بیماروں کو صحت یاب کر دینا اور بچپن میں جھولے کے بیچ سے باتیں کرنیکا بیان ہے